ڈاکٹر خالد ندیم

مغربی بنگال اردو اکادمی

تحقیق و ترتیب

ڈاکٹر خالد ندیم

ناشر

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

۷۵/۲-اے، رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا-۷۰۰۰۱۶

سالِ اشاعت : ۲۰۱۵ء

تعدادِ اشاعت : ۱۰۰۰

قیمت : ۲۵۰/روپے

صفحات : ۴۳۲

کمپوزنگ : شاہین پروین، کلکتہ

مطبع : درپن پبلی کیشنز انٹرنیشنل لمیٹڈ

بھائی پوتا، ڈاک خانہ: بھوجیر ہاٹ، ضلع: جنوبی ۲۴/ پرگنہ

AAP BEETI ALLAMA IQBAL

Compiled by: **Dr. Khalid Nadeem**

ISBN **978-93-84286-16-3**

Price **Rs. 250/-** Edition : **2015**

Published by: **West Bengal Urdu Academy**

75/2A, Rafi Ahmed Qidwai Road, Kolkata - 16

مغربی بنگال کے اردو عوام کے نام

فہرس

تقدیم

مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے مئی ۲۰۱۵ء میں شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے سہ روزہ ''جشنِ اقبال'' کا اہتمام کیا تھا جس میں پاکستان کے معروف محقق پروفیسر (ڈاکٹر) خالد ندیم (استاذ، شعبۂ اردو، سرگودھا یونیورسٹی) بھی تشریف لائے اور بین اقوامی سیمینار ''علامہ اقبال: حیات و خدمات'' میں ''فیض کی اقبال فہمی'' کے موضوع پر گراں قدر مقالہ پیش کیا۔ ان سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں علامہ اقبال کی آپ بیتی ترتیب دے رہے ہیں۔ اکاڈمی کے حل و عقد نے ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اپنی اس تالیف کی اشاعت کی ذمہ داری مغربی بنگال اردو اکاڈمی کو سونپتے ہیں تو یہ ہمارے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔ موصوف نے ہماری اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے کچھ ہی دنوں میں اپنا مسودہ اکاڈمی کو بھیج دیا۔ ہمیں اس بات کی زیادہ خوشی ہے کہ پروفیسر صاحب نے کتابِ ہذا کو مغربی بنگال کے اردو عوام کے نام منسوب کیا ہے۔

میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی اور ریاست کے اردو دوستوں کی جانب سے پروفیسر خالد ندیم صاحب کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ موصوف کی یہ کاوش 'اقبال شناسی' میں ممد و معاون ثابت ہوگی اور حیاتِ اقبال کے بہت سے پہلوؤں سے ان کے مداحوں کو واقف کرائے گی۔

محمد شاہد

سکریٹری، مغربی بنگال اردو اکاڈمی

پیش گفتار

آپ بیتی تحریر کرنا کسی شخص کی اپنی ذمہ داری ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہی اپنی خودنوشت لکھ سکتا ہے، لیکن ہمارے ہاں ماضی میں چونکہ اس طرف ذرا کم ہی توجہ دی گئی ہے؛ ایک تو اس لیے کہ ہمارے اکابر تخلیق کے برعکس اسے کوئی اہم کام تصور نہیں کرتے تھے، دوسرے ہماری تہذیبی اقدار بھی خودنمائی سے پرہیز کا درس دیتی رہی ہیں؛ چنانچہ کتنے ہی مشاہیر کے سوانحی حالات اور شخصی اوصاف وخصائص سے ہم کماحقہ شناسا نہیں ہو پاتے۔

اردو میں اس مسئلے کے حل کے لیے متعدد کاوشیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، جن میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی مرتبہ غالب کی آپ بیتی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی آپ بیتی: رشید احمد صدیقی، پروفیسر زہرا معین کی حرفِ سرور، محمد حمزہ فاروقی کی سہر بیتی اور راقم کی مرتبہ شبلی کی آپ بیتی شامل ہیں۔ یہاں ان آپ بیتیوں کا موازنہ یا تقابل مقصود نہیں، یہ کام ہمارے فاضل ناقدین کا ہے؛ یہاں تو محض یہ کہنا مقصود ہے کہ اردو میں آپ بیتیوں کی اس کمی کو پورا کرنے کی مذکورہ کوششیں لائقِ تحسین بھی ہیں اور قابلِ تقلید بھی۔ اگر ان میں کچھ تشنگی یا نقص رہ گیا ہے تو امکان ہے کہ یہ صنفِ نثر بتدریج نکھرتی اور سنورتی جائے گی اور بالآخر مرتبہ آپ بیتیاں بھی لائقِ اعتنا ٹھہریں گی۔

علامہ اقبال کی زندگی کے تقریباً تمام گوشوں پر لکھا جا چکا ہے۔ حیاتِ اقبال پر مضامین کا سلسلہ خود ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا، چنانچہ اس سلسلے میں پہلا مضمون شیخ عبدالقادر نے لکھا، جو خدنگِ نظر کے شمارے مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس موضوع پر مضامین لکھے جاتے رہے، البتہ اقبال صدی کے موقع پر یہ رفتار تیز تر ہو گئی۔ کتابی صورت میں حیاتِ اقبال پر سوانح عمریوں کی ایک بھی بڑی تعداد معروفِ تحریر میں آئی:

ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	(۱۹۵۵ء)
یادِ اقبال (دوسری اشاعت داستانِ اقبال)	صابر کلوروی	(۱۹۷۷ء)
مفکرِ پاکستان	حنیف شاہد	(۱۹۸۲ء)
حیاتِ اقبال	ایس ایم ناز	(۱۹۸۲ء)
سرگذشتِ اقبال	عبدالسلام خورشید	(۱۹۷۷ء)
زندہ رُود	ڈاکٹر جاوید اقبال	(۱۹۸۴ء)
علامہ اقبال شخصیت اور فکر و فن	رفیع الدین ہاشمی	(۲۰۰۸ء)

علاوہ ازیں جناب خرم علی شفیق اور سید سلطان محمود حسین کی سوانحی کاوشیں بھی منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ بہر حال، زندہ رُود ماخذات اور تحقیقی طریقِ کار کی بنا پر سب سے اہم سوانح عمری ہے۔ یہ تصنیف ایک بیٹے کی طرف سے نہیں، بلکہ ایک محقق، ایک مدبر، ایک تجزیہ نگار اور ایک فن کار کی طرف سے ہے۔ مذکورہ بالا سوانح عمریاں ہمارے معروف محققین نے تحریر کی ہیں اور بعض تسامحات اور کم زوریوں کے باوجود علامہ مرحوم کی سوانح اور شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سوانح نگار ممدوح کو ذاتی تعصّبات، عقائد اور نظریات کی عینک سے دیکھتا ہے، جس سے لامحالہ حالات و واقعات کو معروضی انداز میں پیش نہیں کر پاتا۔ اقبال کے ساتھ یہ معاملہ ان کی شاعری سے شروع ہو کر ان کی سوانح تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر شخص، ہر مکتبہ فکر، ہر مسلک، ہر مذہب اور ہر ملک اپنے تصورات کی تائید میں اقبال کے اشعار پیش کرتا ہے۔ ان کی سوانح عمریوں میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال دِکھائی دیتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اقبال کی بعض سوانح عمریاں تحقیقی اصولوں اور تجزیاتی حوالوں سے مزین ہیں اور عہد حاضر کے مطالبات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں، اس کے باوجود ان پر ممدوح کی شخصیت کے برعکس سوانح نگار کی شخصیت کا رنگ نمایاں رہا ہے؛ جب کہ زیرِ نظر تالیف کے حق میں اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ سوانح عمری نہیں، جس میں مصنف کی شخصیت شامل ہو جائے، بلکہ یہ 'آپ بیتی' ہے، جس میں صرف اقبال ہم کلام ہیں، البتہ مؤلف و مرتب کا

فریضہ صرف یہ رہا ہے کہ اقبال کی تحریر اور گفتگو کو زمانی ترتیب سے مرتب کر دے۔

''جشنِ اقبال'' کے سلسلہ میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا کے زیرِ اہتمام ۲۹ رمئی سے ۳۱ رمئی تک منعقدہ تین روزہ تقریبات میں شرکت کے دوران اکاڈمی کی گورننگ باڈی کے رکن خاص اور جشنِ اقبال تقریبات استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین محبی سلطان احمد (رکن لوک سبھا)، برادرِ عزیز ندیم الحق (رکن، راجیہ سبھا و چیئرمین فائنانس سب کمیٹی، مغربی بنگال اردو اکاڈمی)، اکاڈمی کے نائب چیئرمین پروفیسر (ڈاکٹر) سید منال شاہ القادری اور سکریٹری جناب محمد شاہد (ڈبلیو بی سی ایس) کو اس تالیف کے بارے میں معلوم ہوا تو انھوں نے اس کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا۔ مَیں اپنے ان دوستوں کا بے حد ممنون ہوں، جن کی تشویق اور تاکید سے یہ تالیف منصۂ شہود پر آسکی۔

عزیز دوست ڈاکٹر نعیم انیس کا بے حد ممنون ہوں، جنھوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود کتاب کا اشاریہ مرتب کرنے کی زحمت گوارا کی۔ اللہ انھیں سلامت رکھے۔

یہ اعتراف ضروری ہے کہ محبی محبوب عالم تھابل نے اس تالیف کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد کئی ایک مفید تجاویز دیں، جن پر عمل کرنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی۔ استادِ گرامی پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ہمیشہ کی طرح میری سرپرستی فرماتے رہے۔ اس تالیف کی تیاری میں متعدد نادِر کتب انھی کے کتب خانے سے فراہم ہوئیں۔

یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ پاورق میں کلیاتِ مکاتیبِ اقبال کو اس کی جلد کے شمار (یعنی اوّل، دوم، سوم، چہارم) سے ظاہر کیا گیا ہے۔

خالد ندیم

dr.khalidnadeem@gmail.com

۹ر اکتوبر ۲۰۱۵ء

میں اپنے دِل و دِماغ کی سرگذشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگذشت [میرے] کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اِس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دِلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔

(اقبال بنام سید سلیمان ندوی، مرقومہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۹ء)

اجداد

جب مسلمانوں کا کشمیر میں دَور دَورہ ہوا تو براہمۂ کشمیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف بوجہ قدامت پرستی یا اَور وجوہ کے توجہ نہ کرتے تھے۔ اس قوم میں سے پہلے جس گروہ نے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کر کے حکومتِ اسلامی کا اعتماد حاصل کیا، وہ سپرو کہلایا۔ اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص، جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے (یا جس نے سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا)۔ 'س' تقدم کے لیے کئی زبانوں میں آتا ہے اور 'پرو' کا روٹ وہی ہے، جو ہمارے مصدر 'پڑھنا' کا ہے۔ والد مرحوم [شیخ نور محمد] کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے اُن بھائی بندوں کو ازراہِ تعریض و تحقیر دیا تھا، جنھوں نے قدیم رسوم و تعلقاتِ قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نام ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا ہے؛ [جب کہ کمشنر پنجاب] دیوان ٹیک چند نے مجھ سے کہا تھا کہ لفظ 'سپرو' کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاہ پور سے ہے اور سپرو حقیقت میں ایرانی ہیں، جو اسلام سے پہلے ایران چھوڑ کر کشمیر میں آباد ہوئے اور اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے برہمنوں میں داخل ہو گئے [۱]

[میرے جدِ امجد] حضرت 'بابا لول حج' کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ان کا اصلی گاؤں نو چر نہ تھا، بلکہ موضع چکو پرگنہ آدرن تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے، اس واسطے ترکِ دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آ کر اشارۂ غیبی پا کر حضرت بابا نصر الدین کے

۱: بنام فوق، ۱۶/۱/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۵۱-۴۵۲

مرید ہوئے، جو حضرت نورالدین ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر انھوں نے بابا نصرالدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔[2]

ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا پیر تھے، ان کا نام تھا شیخ اکبر۔ انھیں پیری اس طرح ملی کہ [ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں] سن کھترا میں سادات کا ایک خاندان تھا، جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے اور اس لیے ان پر ہمیشہ طعن و تشنیع ہوا کرتی تھی۔ اس خاندان کے سربراہ کو ایک روز جو غصہ آیا تو ایک سبز کپڑا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے، جس کے متعلق روایت تھی کہ حضرت امام حسینؑ کی یادگار ہے۔ اس کی برکت سے آگ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔ مخالفوں نے یہ دیکھا تو انھیں یقین ہو گیا کہ وہ فی الواقعہ سید ہیں۔ ان کا انتقال ہوا تو شیخ اکبر نے ان کے مریدوں کو سنبھالا اور خاندان کی خدمت کرنے لگے۔[3]

[ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ] میرے والد ایک روز گھر آ رہے تھے، ہاتھ میں رومال تھا، رومال میں تھوڑی سی مٹھائی۔ اثنائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا، مٹھائی سمیت رومال اس کے آگے ڈال دیا۔ کتے نے مٹھائی کھانا شروع کر دی۔ مٹھائی کھا چکا تو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اسے پانی کی طلب ہے۔ والد ماجد نے اسے کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا۔ رات کو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے، جس میں مٹھائی کے طبق ہی طبق رکھے ہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ اس نیک عمل کا ثمرہ تھا، جو کل ان سے سرزد ہوا؛ چنانچہ اُس روز سے انھیں یقین ہو گیا کہ ہمارے دِن پھرنے والے ہیں۔ ...... ایک مرتبہ اسی [پیر شیخ اکبر کے] خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا، 'آپ دھسوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے؟' اُس زمانے میں معمولی دھسوں کی قیمت دو روپے فی دھسہ سے زیادہ نہ تھی۔ والد ماجد نے کوئی دو چار سو دھسے تیار کیے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں پر بک گئے، حالانکہ فی دھسہ آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہیں آئی تھی۔ دو

۲: بنام شیخ عطا محمد، ۱۹۲۵/۱۰/۵ء، سوم، ۶۰۸

۳: اقبال کے حضور، ۱۶۹-۱۷۰

چار سو دھسے فروخت ہو گئے تو کافی روپیہ جمع ہو گیا۔ بس یہ ابتدا تھی ہمارے دِن پھرنے کی۔ پھر [میرے بڑے] بھائی [شیخ عطا محمد] صاحب بھی [محکمہ تعمیراتِ عامہ میں] ملازم ہو گئے۔[۴]

۴: اقبال کے حضور، ۱۶۹، ۱۷۰

۱۸۷۷ء - ۱۸۹۴ء

ایک رات میرے والد نے خواب میں دیکھا، ایک سفید کبوتر بہت اونچا اُڑ رہا ہے اور پھر اُڑتے اُڑتے دفعتۂ ان کی جھولی میں آ گرا۔ یہ خواب میری پیدائش سے کچھ دِن پہلے کا ہے۔ وہ اسے اشارۂ غیبی سمجھے۔[۱]

مَیں ۳ رذیقعد ۱۲۹۴ھ [۹ رنومبر ۱۸۷۷ء] کو سیالکوٹ، پنجاب (ہندوستان) میں پیدا ہوا۔[۲] پنجاب میں اُن دِنوں علم وحکمت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میرے والد کو بڑی خواہش تھی، مجھے تعلیم دِلوائیں۔ انھوں نے اوّل تو مجھے محلے [میں مولانا غلام حسین] کی مسجد میں بٹھا دیا، پھر [مولانا سید میر حسن] شاہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔...... والد محترم اور شاہ صاحب ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔[۳] میری تعلیم کی ابتدا عربی اور فارسی کے مطالعے سے ہوئی۔[۴] چند برس بعد مَیں نے شہر کے ایک اسکول [اسکاچ مشن اسکول] میں داخلہ لیا، [جہاں سید میر حسن استاد تھے]۔[۵]

میرے والد کو فتوحات اور فصوص سے کمال توغل رہا ہے اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان [کتابوں] کا نام اور ان [کی] تعلیمات پڑنی شروع ہوئیں۔ برسوں تک ان دونوں کتابوں کا درس ہمارے گھر میں رہا۔ گو بچپن کے دِنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہیں تھی، تاہم محفل درس میں ہر روز شریک ہوتا۔ بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔[۶]

۱: اقبال کے حضور، ۹۵
۲: نقش اقبال، ۱۷
۳: اقبال کے حضور، ۹۴
۴: نقش اقبال، ۱۷
۵: ایضاً
۶: بنام پھلواروی، ۲۴/۲/۱۹۱۶ء، اوّل ۴۷۴-۴۷۵

جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی، ایک رات مَیں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہی ہیں۔ مَیں فوراً [اپنے] بستر سے اُٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا، جو اَدھ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ والدہ اس دروازے میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ مَیں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مَیں نے والد کے پاس جانا چاہا، لیکن والدہ نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو مَیں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا، تاکہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انھیں اپنا ایک رویا سنا رہے تھے، جو رات انھوں نے بحالتِ بیداری دیکھا تھا۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے، جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر مقیم ہوا ہے۔ اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے، لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگا منگایا۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیے۔ چند گھنٹوں میں تانگا اُس مقام پر پہنچ گیا، جہاں کارواں کا ڈیرا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے، جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے کے لیے پنجاب آئے ہیں۔ والد نے تانگے سے اُترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔ سالار بے حد متعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے، جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے، لیکن وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ہے اور اس کے بعض اعضا اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیز نکالی، جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی۔ وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضا پر مَل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ہو گی۔ اُس

پر وقت تو نہ مجھے یقین آیا، نہ مریض کے لواحقین ہی نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی، لیکن چوبیس ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی، جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے۔[7]

....

مَیں نے پنجاب یونیورسٹی [کے زیرِ اہتمام مڈل] کا پہلا پبلک امتحان ۱۸۹۱ء میں پاس کیا [اور ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا]۔

انھیں [یعنی میرے والد مکرم کو] میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہ تھا، بالخصوص جب کہ مَیں نے ایسے کسی حبالۂ عقد میں داخل ہونے سے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔[8] [اس کے باوجود ۴ رمئی کو گجرات میں مقیم سرجن ڈاکٹر عطا محمد کی صاحب زادی کریم بی بی سے میری شادی کر دی گئی۔[9]]

میٹرک کے امتحان میں [درجۂ اوّل میں] کامیابی کے بعد [۵ رمئی ۱۸۹۳ء کو] میں اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گیا۔[10]

کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرا معمول تھا، ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا۔ اِس دَوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ مَیں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا، کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے، والد ماجد حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے، مَیں تلاوت میں مصروف تھا، مگر وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ مَیں تلاوت کرتے کرتے رُک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہنے لگے، 'تم کیا پڑھا کرتے ہو'۔ مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا، بلکہ ملال بھی۔ انھیں معلوم تھا، مَیں قرآنِ پاک کی تلاوت

۷: ذکرِ اقبال، ۱۲۔۱۴

۸: بنام عطیہ، ۹/۴/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۷۴

۹: بحوالہ زندہ رُود، ۹۴

۱۰: نقش اقبال، ۱۷

کر رہا ہوں۔ بہر حال، مَیں نے مؤدبانہ عرض کیا، 'قرآنِ پاک'۔ کہنے لگے، 'تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو؟' مَیں نے کہا، 'کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں'۔ انھوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مَیں حیران تھا، آخر اس سوال سے اُن کا مطلب کیا ہے؟ کچھ دِن گزر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہوگئی، لیکن اس واقعے کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے مَیں حسب معمول قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا تھا، والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور مَیں نے تلاوت ختم کی تو انھوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے، 'بیٹا! قرآنِ مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جس پر اُس کا نزول ہو'۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالت مآبؐ کے بعد قرآنِ پاک کیسے کسی پر نازل ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے، 'تمھیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآنِ مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو، جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمھاری رَگ وپے میں سرایت کر جائے گا'۔ مَیں ہمہ تن گوش والد ماجد کی بات سنتا رہا، بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآنِ مجید کی تلاوت ویسے ہی کروں، جیسے اُن کا ارشاد ہے کہ انھوں نے کہا، 'سنو! اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالمِ انسانیت کو جس معراجِ کمال تک پہنچانے کا تھا، اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا، لہٰذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور رسالت مآبؐ تک کہ خاتم الانبیا ہیں، جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے، ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارجِ محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا، جس کا خاتمہ ذاتِ محمدیہ کی تشکیل پر ہوا'۔ والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے اس ارشاد کی تشریح کی۔ انھوں نے کہا، 'شعورِ انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پالے تو ذاتِ محمدیہ بھی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہوگئی۔ حضور رسالت مآبؐ تشریف لائے، بابِ نبوت بند ہوا، انسانیت اپنے معراجِ کمال کو پہنچی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ و کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لیے حجت، مثال اور

نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا، اُتنا ہی قرآنِ مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآنِ مجید اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے، جس پر اس کا نزول ہوئے[11]

....

آبِ تیغِ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا
باغِ جنت میں خدا نے آبِ کوثر رکھ دیا
ہنس کے پوچھا اس صنم نے، کون ہے تیرا رقیب
مَیں نے اس کے سامنے آئینہ لے کر رکھ دیا[12]

[زبان دہلی، ستمبر ۱۸۹۳ء]

جان دے کر تمھیں جینے کی دُعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں
گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بُت اقبال
حضرتِ داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں[13]

[زبان دہلی، فروری ۱۸۹۴ء]

11: اقبال کے حضور، ۶۰-۶۱
12: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ۲۳۷
13: ایضاً، ۲۴۱، ۲۴۲

۱۸۹۵ء-۱۹۰۲ء

دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد مَیں نے پنجاب یونیورسٹی کا انٹرمیڈیٹ امتحان ۱۸۹۵ء میں [درجۂ دوم کے ساتھ] پاس کیا[۱] [اور لاہور آ کر گورنمنٹ کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا[۲]]۔

[مشاعرہ منعقدہ نومبر ۱۸۹۵ء بر مکان حکیم امین الدین[۳]]

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مِرے عرقِ انفعال کے[۴]

....

[نظم 'فلاحِ قوم'، فروری ۱۸۹۶ء، زیرِ اہتمام: انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور]

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں
بدن میں جان تھی، جیسے قفس میں صیدِ زبوں
ز بسکہ غم نے پریشاں کیا ہوا تھا مجھے
یہ فکر مجھ کو لگی تھی کہ ہو نہ جائے جنوں
جو سامنے تھی مِرے قوم کی بُری حالت
اُڈ گیا مِری آنکھوں سے خون کا سیحوں

۱: نقش اقبال، ۱۷
۲: ماخوذ زندہ رُود، ۱۰۰
۳: ایضاً، ۱۰۴
۴: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ۲۴۴

ہزار شکر کہ اِک انجمن ہوئی قائم
یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالعِ واژوں[5]

....

[۱۸۹۶ء میں ایک بیٹی معراج بیگم پیدا ہوئی۔[6]]

....

۱۸۹۷ء میں مَیں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے [انگریزی، عربی اور فلسفہ کے ساتھ] بی اے [کے امتحان میں درجۂ دوم] میں کامیابی حاصل کی۔[7]

....

[اپریل/مئی ۱۸۹۸ء میں ایک بیٹا آفتاب اقبال پیدا ہوا۔[8]]

....

مَیں تمام لیکچروں میں حاضری اور تمام فیسوں کی مکمل ادائیگی کے بعد [دسمبر] ۱۸۹۸ء میں قانون کے ابتدائی امتحان میں شریک ہوا تھا، مگر بدقسمتی سے فلسفۂ قانون [جورس پروڈنس[9]] کے پرچے میں ناکام رہا۔[10]

....

مَیں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں، چنانچہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعرا کے فوٹوز کے لیے امریکا لکھا ہے۔ غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت [داغ] کا فوٹو ضرور ہوگا۔ حضرتِ امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔[11]

....

پنجاب یونیورسٹی سے [درجۂ سوم میں] فلسفہ میں ایم اے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا[12] اور

۵: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ۳۲، ۳۳
۶: ماخوذ زندہ رُود، ۹۴
۷: نقشِ اقبال، ۱۷
۸: ماخوذ زندہ رُود، ۹۴
۹: زندہ رُود، ۱۰۲
۱۰: بنام رجسٹرار چیف کورٹ، ۱۹۰۰/۶/۲ء، اوّل، ۶۳
۱۱: بنام احسن مارہروی، ۱۸۹۹/۲/۲۸ء، اوّل، ۶۲
۱۲: بنام سینئر ٹیوٹر ٹرینٹی کالج کیمبرج، ۱۹۰۵/۹/۲۹ء (بحوالہ نوادرِ اقبال یورپ میں، ۱۷۸)

پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربیک ریڈر تعینات ہوا، جہاں مَیں نے تین سال تک ہسٹری اور پولیٹکل اکانومی کے موضوعات پر لیکچر دیے۔[۱۳]

یہاں [ہندوستان میں] کچھ لوگ امریکی یونیورسٹیوں میں داخلے کا ارادہ کرنے لگے ہیں اور مَیں بھی اُن میں سے ایک ہوں۔[۱۴]

....

آج کل بعض اخباروں اور رسالوں میں اہلِ پنجاب کی اردو پر بڑی لے دے ہو رہی ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس بحث کے فریق زیادہ تر ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ اِدھر ایک صاحب 'تنقید ہمدرد' جو اخلاقی جرأت کی کمی یا کسی نامعلوم مصلحت کے خیال سے اپنے نام کو اس نام کی نقاب میں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں، [خوشی محمد] ناظر و اقبال کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے پنجابیوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ اِدھر ہمارے معزز و محترم دوست میر ممتاز علی ایڈیٹر تالیف و اشاعت اور انبالوی صاحب اپنے محققانہ مضامین سے اپنی وسعتِ خیال کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہمارے دوست 'تنقید ہمدرد' اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروّج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو؛ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔ جو زبان بہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطالب پر قادر ہو، اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کا معیار خود بخود قائم ہو جاتا ہے، لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات و الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کیے جا رہے ہوں، اُس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات میں سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، اردو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی، مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادّہ تھا، اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیرِ نگیں ہو جائے۔ ایسی

۱۳: نقش اقبال، ۱۷

۱۴: بنام مسز سٹرے ٹن، ؟؟/؟/۱۹۰۲ء، اول، ۶۸

صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو، وہاں کے لوگوں کے طریقِ معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرزِ بیان اس پر اثر کیے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلّم اصول ہے، جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے کو بلا تکلف استعمال کرو، لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُرمعنی پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو۔ اَور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو، مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن، یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے، جو علمِ زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فردِ بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے، جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کیے جائیں تو عذرِ بے جا ہوگا؛ اردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے، جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ...... بازار، لوٹ، چالان وغیرہ لے لیے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔[۱۵]

....

دو تین روز سے طبیعت بہ سبب دَورۂ درد کے علیل ہے۔[۱۶]

۱۵: مقالاتِ اقبال، ۵۱-۵۳ ۱۶: بنام سراج الدین، ؟/؟/۱۹۰۲ء، اوّل، ۶۴

۱۹۰۳ء

ماہِ رواں کے کسی اخبار میں مَیں نے پڑھا تھا کہ فنِ سخن کے استاد اور ملکِ نظم کے بادشاہ حضرتِ امیر مینائی کی لائف ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ بے شک یہ حیرانی کی بات ہے کہ کیوں اب تک فنِ سخن کے قدر دان بزرگوں نے امیر مرحوم کی شاعرانہ اور پبلک زندگی کو کاغذی جامہ نہیں پہنایا، جس کے دیکھنے کے لیے سخن فہم طبیعتیں بے چینی سے منتظر ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ایسے صاحبِ کمال کی سوانح عمریاں ایک نہیں، کئی لکھی جاتیں اور کئی بار چھپتیں۔ ع

اے کمال افسوس ہے تجھ پر، کمال افسوس ہے

حضرت امیر کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ اُن کا درجہ شاعری سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اُن کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد اور ایک خاص قسم کی لَے پائی جاتی ہے، جو صاحب دلوں کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ آہ! ایسے بے نظیر شخص کے حالات، جو اصلی معنوں میں تلمیذ الرحمن کہلانے کا مستحق ہو، ابھی تک گم نامی میں پڑے ہیں، اندھیر نہیں تو اَور کیا ہے؟ اگر یہی شخص یورپ یا امریکا میں ہوتا تو اس کی زندگی میں ہی اس کی کئی سوانح عمریاں نکل جاتیں؛ مگر افسوس ہے، ہندوستان میں ان کی زندگی میں تو درکنار، اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کی کوئی لائف نہ لکھی گئی۔ میرا ایک عرصے سے خیال تھا کہ حضرتِ امیر کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات قلم بند کروں، مگر اب مرحوم کی لائف کے متعلق ایک تازہ مضمون دیکھ کر پھر اُمنگ آئی ہے کہ جس

طرح ہو، مَیں اپنے کام کو پورا کروں اور بہت جلد۔ میرا مقصد اصل میں حضرتِ امیر کی شاعری اور شاعرانہ لائف پر بحث کرنے سے ہے۔[1]

۱۹۰۳ء میں میرا تقرر لاہور گورنمنٹ کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ ہوا۔[2]

اس سال مجھے اُمید نہ تھی کہ [انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں] مَیں کوئی نظم پڑھ سکوں گا۔ مڈل کے امتحان کے پرچوں سے فراغت نہ ہوئی، طبیعت کو یکسوئی کس طرح نصیب ہوتی۔...... ایف اے کے امتحان کے پرچے مضمون 'تاریخِ یونان و روم' کے دیکھ رہا ہوں، سامنے بنڈل رکھا ہے اور نتیجہ بھیجنے میں چار دِن کا عرصہ باقی رہ گیا ہے۔[3]

....

افسوس کہ اب کے [۱۰/ مارچ] ...... [مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی] تشریف نہ لا سکے۔ میر نیرنگ تشریف لائے تھے، چودھری خوشی محمد تھے، مولانا گرامی بھی تھے؛ غرض یہ کہ محفل احباب کے سب ارکانِ مشیدہ موجود تھے۔ اگر...... [مولانا شروانی بھی] ہوتے تو ایک آدھ رات خوب گزر جاتی۔ حبیب کی موجودگی شعرا کے لیے کافی سامان ہے اور بالخصوص جب کہ حبیب شعر فہم اور شعر گو بھی ہو۔[4]

آج [۱۱/ مارچ کو] عید کا دِن ہے اور بارش ہو رہی ہے۔ گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے، شیخ عبدالقادر ابھی اُٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں، سید بشیر حیدر بیٹھے ہیں اور 'ابرِ گہر بار' کی اصل علت کی آمد آمد ہے۔[5] 'ابرِ گہر بار' شروع کرنے سے پیشتر مَیں نے اس خیال سے کہ کوئی...... اس کے بعض اشعار پر کوئی فتویٰ نہ دے دے، چند باتیں تمہید میں بھی کہی تھیں اور ایک غزل بھی کہی تھی:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دِل وا کرے کوئی

1: بنام پنجہ فولاد، ۱۹۰۳/۲/۲۸ء، اوّل، ۶۹-۷۰
2: بنام سینئر ٹیوٹر ٹرینٹی کالج کیمبرج، ۱۹۰۵/۹/۲۹ء
3: بنام شروانی، ؟/۱۹۰۳/۳ء، اوّل، ۷۵، ۷۶
4: ایضاً، ۷۵-۷۶
5: بنام سراج الدین، ۱۹۰۳/۳/۱۱ء، اوّل، ۷۱

منصور کو ہُوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

مَیں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق ، ہم نشیں!
پھر اَور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی

اَڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائے، کیا مزے ہیں، تمنائے شوق میں
دو چار دِن جو میری تمنا کرے کوئی[6]

....

ترتیبِ اشعار کی خود مجھے فکر ہو رہی ہے، مگر یہ خیال ہے کہ ابھی کلام کی مقدار تھوڑی ہے۔ بہر حال، جب یہ کام ہو گا تو...... [منشی سراج الدین] کے صلاح و مشورہ کے بغیر نہ ہو گا۔[7] ملٹن کی تقلید میں ...... [ایک مثنوی] لکھنے کا ارادہ مدت سے ہے اور وہ وقت قریب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اِن دِنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا، جس میں اس کی فکر نہ ہو۔

۶: بنام سراج الدین، ۱۱/۳/۱۹۰۳ء، اوّل، ۷۲-۷۳ ۷: ایضاً، ۷۲

پانچ چھ سال سے اس آرزو کی دِل میں پرورش کر رہا ہوں، مگر جتنی کاوِش آج کل محسوس ہوتی ہے، اس قدر کبھی نہ ہوئی۔ فکرِ روزگار سے نجات ملتی ہے تو اس کام کو باقاعدہ شروع کروں گا۔[8]

....

[بھائی شیخ عطا محمد کے خلاف ایک مقدمے کے سلسلے میں ہم لوگ] آج مقام مغل کوٹ [بلوچستان] پہنچے۔ [جون کا مہینا اور] گھوڑے کا سفر، اور گھوڑے سے اُکتائے تو اونٹ کا سفر: خدا کی پناہ! پہلے روز سینتیس میل کا سفر گھوڑے پر کیا۔ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی؟ لیکن جو تکلیف محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو، وہ لذیذ ہو جاتی ہے۔ فورٹ سنڈیمن ابھی یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ پرسوں پہنچیں گے، بشرطیکہ کوئی بارش نہ ہوئی۔

بھائی صاحب کے متعلق خبر ملی، ان کو رائل انجینئر کوئٹہ کے تار پر تار دینے کی وجہ سے حراست سے نکال دیا ہے۔ اُس نے متواتر تاریں دیں کہ ایک معزز افسر کو بغیر منظوری شملہ کیوں حراست میں دیا گیا ہے۔ اسی متواتر تاروں کے دَوران میں وہاں کے پولیٹکل ایجنٹ کی تبدیلی بھی ہوگئی ہے۔ سنا ہے کہ اس مقدمے میں اس کی ہی شرارت تھی۔ خدا انجام بخیر کرے گا۔ اُمید ہے کہ اس مقدمے کا نتیجہ بھائی صاحب کے حق میں اچھا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے، کوئٹہ کے حکام کو ان کی دیانت وغیرہ کا ثبوت کافی مل گیا ہے۔ ایجنٹ کوئٹہ نے فورٹ سنڈیمن کے ایجنٹ کی فوراً تبدیلی کر دی ہے۔ مجھے سارے حالات ابھی معلوم نہیں ہوئے، تاہم جو کچھ معلوم ہوئے، اُن سے یہی اندازہ کر سکا کہ اس کی تہہ میں عداوتِ محض ہے۔[9]

....

امیر [بائی کے سلسلے میں] ...... مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے، اس میں کیا راز ہے؛ جتنا [اُس سے] دُور ہو رہا ہوں، اُتنا ہی اُس سے قریب ہو رہا ہوں۔[10]

۸: بنام سراج الدین، ۱۱/۳/۱۹۰۳ء، اوّل ۹: بنام محمد تقی شاہ، ؟/۵/۱۹۰۳ء، اوّل، ۷۷-۷۸
۱۰: ایضاً، ۸۰-۷۷-۷۹

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر ، اقبال!
مَیں بُت پرست ہوں ، رکھ دی کہیں جبیں مَیں نے [11]

....

خدا کے فضل سے [اگست میں] اس تشویش کا خاتمہ ہوا۔ بھائی جان پر، جو بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل افسر ملٹری ورک تھے، اُن کے مخالفین نے ایک خوفناک فوج داری مقدمہ بنا دیا تھا، لیکن الحمدللہ کہ دشمنوں کے منہ میں خاک پڑی، بھائی صاحب بَری ہوئے۔ اگرچہ روپیہ کثیر صَرف ہوا، تاہم شکر ہے، ہماری مصیبت کا خاتمہ ہوا۔ ہم باقی رہ گئے اور ہماری مصیبت دشمنوں کی تلاش میں پھر بلوچستان کی طرف عود کر گئی۔ بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ ناانصافی کرنے پر آمادہ تھے، مگر خدا لارڈ کرزن کا بھلا کرے کہ میرے لکھنے پر معاملہ دِگرگوں ہو گیا۔[12]

11: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ۲۲۲
12: بنام شروانی، ۶/۸/۱۹۰۳ء، اوّل، ۸۱

۱۹۰۴ء

استاذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد ان کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دِنوں تک سکینت قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک روز زورِ تخیل نے ان کے مکان کے سامنے لا کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پر آ گئے، جن کی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی رخصت کے موقع پر بہت سے الوداعی جلسے کیے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں اور یہ نظم اُس وقت لکھی بھی جا چکی تھی، تاہم اس خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک دردآمیز اظہار تھا، کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ بعد کی تشریف بری کے بعد دِلی تاثرات کی شدت اَور بھی بڑھ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظم [نالۂ فراق] میں بہت سی تبدیلی ہوگئی[۱]:

جا بسا مغرب میں آخر ، اے مکاں! تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں
آ گیا آج اس صداقت کا مِرے دِل کو یقیں
ظلمتِ شب سے ضیاے روزِ فرقت کم نہیں

'تا ز آغوشِ وِداعش داغِ حیرت چیدہ است
ہمچو شمعِ کشتہ در چشمِ نگہ خوابیدہ است'

کشتۂ عزلت ہوں ، آبادی سے گھبراتا ہوں مَیں
شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں مَیں

۱: مخزن، اپریل ۱۹۰۴ء، بحوالہ مطالب بانگِ درا، ۱۱۰

یادِ ایامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں مَیں
بہرِ تسکیں تیری جانب دَوڑتا آتا ہوں مَیں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا مِری رفتار سے

ذرّہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئنہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا

نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ! کیا جانے کوئی، مَیں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من بر چید و رفت
اندکے بر غنچہ ہاے آرزو بارید و رفت

تُو کہاں ہے، اے کلیم ذروۂ سینائے علم!
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم

اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

'شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند'

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا مَیں پنجاب کی زنجیر کو

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو

'تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو، ہے سخن تصویر کا'[۲]

۲: کلیاتِ اقبال اردو، ۱۰۴-۱۰۵

[ماہِ اگست میں] مَیں کئی دِنوں سے [برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد کے] یہاں [ایبٹ آباد میں] ہوں، لیکن افسوس کہ یہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گیا۔ ابھی پورا افاقہ نہیں ہوا[3]

....

سینٹ کی میٹنگ میں، جو نئے قوانین کے تحت نئے فیلوز کا انتخاب کرنے کے لیے ۷رنومبر کو منعقد ہو گی، آنریبل مسٹر شاہ دین فیلوشپ کے لیے میرا نام تجویز کرنے والے ہیں۔ ذاتی طور پر یہ مجھے زیب نہیں دیتا کہ اِدھر اُدھر جا کر اس حقیر اعزاز کے لیے سینٹ کے ممبروں کو اپنے حق میں آمادہ کروں، مگر مسلمان فیلوز کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ یہ حکومت کے نامزد کردہ کُل چھ ہیں، جن میں سے تین (مولوی ہونے کے اعتبار سے) عملاً گویا نہیں ہیں۔ لوگ ان باتوں کو دوسرے ڈھنگ سے لیتے ہیں اور مجھے دوستوں نے مجبور کیا ہے کہ کوشش کروں اور ہو سکے تو فیلوشپ حاصل کروں؛ اس لیے مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ مَیں ووٹ حاصل کرنے کے لیے اِدھر اُدھر گھوموں۔ کسی اتنی سی چیز کے لیے اپنے نام کو آگے بڑھانا ایک بھدی سی بات ہے، اس لیے جو پہلے سے نامزد ہیں، مجھے ان کے دوستوں کی تلاش ہے، تاکہ انھیں اپنے دوستوں کی رائے پر میرے حق میں اثر انداز ہونے کے لیے آمادہ کر سکوں۔ جناب شاہ دین نے میری طرف سے کچھ لوگوں سے ملاقات کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔[4]

۳: بنام دیانرائن نگم، ۱۰/۸/۱۹۰۴ء، اوّل ۸۴

۴: بنام شیخ عبدالعزیز، ۲۳/۱۰/۱۹۰۴ء، اوّل ۸۸-۸۹

۱۹۰۵ء

[دہلی کے] ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا۔ ازاں بعد حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن وہیں بسر کیا۔ اللہ اللہ! حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔ شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے، جہاں وہ گنجِ معانی[1] مدفون ہے، جس پر خاکِ دہلی ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام تھا، اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر...... دِل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی...... کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں، بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس

۱: غالب کے مزار پر میر مہدی مجروح کا کہا ہوا قطعہ تاریخ وفات نصب ہے، جس کا مادۂ تاریخ یہ ہے:
ہاتف نے کہا، گنجِ معانی ہے تہِ خاک (بحوالہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، اوّل، ۹۵)

حسرت کدے سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دِل کو تڑپاتا ہے۔

اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں، مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے پر فاتحہ پڑھا، داراشکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے ھو الموجود کی آواز سنی اور دہلی کی عبرتناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا، جو صفحہ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔ ۳؍ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ۴؍[ستمبر] کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل میں پہنچا۔[۲]

....

[بمبئی] ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں، مگر مَیں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربے سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلبہ کے لیے، جو ولایت جارہے ہوں، نہایت موزوں ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے، گھاٹ یہاں سے قریب ہے، ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب ہے؛ غرض کہ ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام ہوٹلوں کی نسبت ارزاں ہے۔ صرف تین روپیہ یومیہ دو اور ہر قسم کا آرام حاصل کرلو۔[۳]

یہاں کا منتظم ایک پارسی پیرمرد ہے، جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے وخشور (نبی) یاد آجاتے ہیں۔ دُکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھایا ہے کہ ہمارے بعض علما میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے، 'محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے'۔ میرے دل پر اس پیرمرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں، لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازے سے زیادہ ہو

۲: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اوّل، ۹۵-۹۶ ۳: ایضاً، ۹۶

گئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مَیں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا۔ اُس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی اور مَیں نے دُور سے تاڑ کر آواز دی کہ 'سیٹھ صاحب! ہم سے کیوں چھپاتے ہو، خوشی سے اس کا شوق کرو'۔ ذرا مسکرایا اور کچھ پیے ہوئے بھی تھا، بولا 'سرابِ شوک پینے سے سبھی گم دُور ہو جائے'۔ مَیں نے سن کر کہا، واہ رے بڈھے! خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہو کر بمبئی کی کھیتی باڑی میں بکتا پھرے۔[۴]

اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آ کر مقیم ہوا، جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا تھا۔ مَیں نے ایک روز اُس سے پوچھا، 'تم کہاں سے آئے ہو؟' بولا، 'چین سے آیا ہوں، اب ٹوانسول جاؤں گا'۔ مَیں نے پوچھا، 'چین میں تم کیا کرتے تھے؟' کہنے لگا، 'سوداگری کرتا تھا، لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے'۔ مَیں نے سن کر دل میں کہا، 'ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقل مند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو! شاباش، نیند سے بیدار ہو جاؤ، ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ ہاں، ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو ازسرِ نو قائم کرنے میں تمھاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروّت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اُس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں، جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں، جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش! خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں'۔[۵]

ایک شب مَیں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں۔ فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر

۴: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اوّل، ۹۷   ۵: ایضاً، ۹۷-۹۸

اُٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی، جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کس طرح ان سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز مَیں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ مَیں نے پوچھا، 'فارسی جانتے ہو'۔ بولا، 'بہت کم'۔ پھر مَیں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی، لیکن وہ نہ سمجھتا تھا؛ آخر بہ مجبوری ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔ یہ نوجوان ترک ینگ ٹرک پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف تھا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ مَیں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا، 'مَیں کمال بے (ترکی کا سب سے مشہور شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹکل معاملات پر لکھتا ہوں'۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے، سب کے سب نہایت عمدہ تھے، لیکن جو شعر اپنے سنائے، وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے۔ اس مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور مَیں نے اسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کیونکہ جس طریق سے رعایائے انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹکل حقوق حاصل کیے، وہ طریق سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت وخون کے ہو جانا یہ کچھ خاکِ انگلستان ہی کا حصہ ہے۔[٦]

ایک روز سرِ شام بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں اسکولوں کی گراؤنڈ میں مسلمان طلبہ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں۔ مَیں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی؟ کیا فنڈ نہیں ہے یا اَور کوئی وجہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے، کیونکہ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول سوداگر موجود ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبہ پڑھنے کے لیے نہیں آتے۔ اس کے علاوہ اَور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں اور جیسی تعلیم اُن میں ہوتی ہے، ویسی

٦: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اوّل، ۹۸-۱۰۰

سرِ دست ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے۔ یہ جواب سن کر مَیں بہت خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بمبئ جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا، کیونکہ یہاں کے مسلمان تمول میں کسی اَور قوم سے پیچھے نہیں ہیں، لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ اُن میں عقل بھی ہے۔ ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارتی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نفع ونقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں۔[۷]

یہاں پارسیوں کی آبادی اسّی نوے ہزار کے قریب ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے۔ اس قوم کی صلاحیت نہایت قابلِ تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ؛ مگر اس قوم کے لیے کسی اچھی فیوچر (future) کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اَور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ علاوہ اس کے، نہ کوئی ان کی زبان ہے اور نہ ان کا لٹریچر ہے اور طرہ یہ کہ فارسی کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افسوس! یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں، ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ وریشے میں ہے اور اسی پر اس کے حسن کا دارومدار ہے۔ مَیں نے اسکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا۔ چستی کی مورتیں تھیں، مگر تعجب ہے کہ ان کی خوب صورت آنکھیں اسّی فی صدی کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔[۸]

اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ مَیں نے اس سے پوچھا، 'نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے'؟ بولا، 'حجور کالوں کے لیے لڑتا

۷: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اول، ۱۰۰ ۸: ایضاً، ۱۰۱

ہے۔ ہوٹل کے نیچے مسلمان دُکاندار ہیں۔ مَیں نے دیکھا، ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔ مَیں نے ایک روز ان سے پوچھا، 'تم اردو پڑھ سکتے ہو' کہنے لگا، 'نہیں، سمجھ سکتے ہیں، پڑھنا نہیں جانتے'۔ مَیں نے پوچھا کہ جب مولوی تمھارے نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے۔ مسکرا کر بولا، 'اردو'۔ یہاں پر ہر کوئی اردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ کبھی ہندوستان نہیں گیا، مگر اردو خاصی بولتا تھا۔[9]

مَیں بمبئ، یعنی بابِ لندن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں۔ خدا جانے لندن کیسا ہوگا، جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے۔ اچھا دیدہ خواہد شد۔[10]

۷ ستمبر کو دو بجے ہم وکٹوریا ڈاک گھاٹ پر پہنچے، جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر! یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سیکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈر، خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح وسلامت منزلِ مقصود پر پہنچا دیں گے۔ خیر طبی معائنے کے بعد مَیں اپنے جہاز پر سوار ہوا۔ لالہ دھنپت رام وکیل لاہور اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب اس روز حسنِ اتفاق سے بمبئ میں تھے۔ مَیں ان کا نہایت سپاس گذار ہوں کہ یہ دونوں صاحب مجھے رخصت کرنے کے لیے ڈاک پر تشریف لائے۔ بہت سے اَور لوگ بھی جہاز پر سوار ہوئے اور ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے، یہاں تک کہ موجیں اِدھر اُدھر سے آ کر ہمارے جہاز کو چومنے لگیں۔[11]

....

فرانسیسی قوم کا مذاق اس جہاز کی عمدگی اور نفاست سے ظاہر ہے۔ ہر روز صبح کو کئی آدمی جہاز کی صفائی میں مصروف رہتے ہیں اور ایسی خوبی سے صفائی کرتے ہیں کہ ایک تنکا تک جہاز پر نہیں رہنے دیتے۔ ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی ہیں، جو مسلمان ہیں اور عربی

۹: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اوّل، ۱۰۱ ۱۰: ایضاً، ۱۰۲

۱۱: ایضاً

بولتے ہیں۔ جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خلق ہیں اور ان کے تکلفات کو دیکھ کر لکھنؤ یاد آجاتا ہے۔ ایک روز ایک افسر تختہ جہاز پر کھڑا تھا کہ ایک حسین عورت کا اُدھر سے گزر ہوا، اتفاق سے یا غالباً ارادۃً یہ عورت اس افسر کے شانے پر ہاتھ رکھتی ہوئی گزری۔ ہمارے نوجوان افسر نے اس توجہ کے جواب میں ایک ایسی ادا سے جنبش کی کہ ہمارے ملک کے حسین بھی اس کی نقل نہیں اُتار سکتے۔[12]

کھانے کا انتظام بھی نہایت قابلِ تعریف ہے۔ میز بھی فرانسیسی تکلف کی گواہی دے رہا ہے، مگر اس جہاز پر ہم ہندوستانیوں کے لیے ایک بڑی دِقت ہے اور وہ یہ کہ جہاز کے تقریباً سب مسافر فرانسیسی بولتے ہیں، انگریزی کوئی نہیں جانتا۔ جہاز کے تمام ملازم فرانسیسی بولتے ہیں اور بعض اوقات اُن کو اپنا مطلب سمجھانے میں بڑی دِقت ہوتی ہے۔[13]

ہم لوگ رات کو اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں اور صبح سے شام تک تختہ جہاز پر کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی پڑھتا ہے، کوئی باتیں کرتا ہے، کوئی پھرتا ہے۔ کیبن میں جہاز کی جنبش کی وجہ سے طبیعت بہت گھبراتی ہے، مگر تختہ جہاز پر بہت آرام رہتا ہے۔ میرے تمام ساتھی دوسرے ہی روز مرضِ بحری میں مبتلا ہو گئے، مگر الحمد للہ کہ مَیں محفوظ رہا۔ مجھ سے اکثروں نے دریافت کیا کہ کیا تم نے پہلے بھی بحری سفر کیا ہے۔ جب مَیں نے جواب دیا کہ نہیں تو وہ حیران ہوئے اور کہا کہ تم بڑے مضبوط آدمی ہو۔ بمبئی سے ذرا آگے نکل کر سمندر کی حالت کسی قدر متلاطم تھی، خواجہ خضر صاحب کچھ خفا سے معلوم ہوتے تھے۔ اتنی اونچی اونچی موجیں آتی تھیں کہ خدا کی پناہ! دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ ایک شب ہم کھانا کھا کر تختہ جہاز پر آ بیٹھے۔ کچھ عرصے کے بعد سمندر کی سرد ہوا نے ہم سب کو سلا دیا، مگر دفعتہً ایک خوفناک موج نے اُچھل کر ہم پر حملہ کیا اور تمام مسافروں کے کپڑے بھیگ گئے۔ عورتیں اور بچے اور مرد نیچے بھاگ کر اپنے اپنے کمروں میں جا سوئے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے جہاز کے ملازموں اور افسروں کے تمسخر کا باعث بنے رہے۔ رستے میں ایک آدھ بارش

12: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اوّل
13: ایضاً، ۱۰۳

بھی ہوئی، جس سے سمندر کا تلاطم نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت اس نظارے کی یکسانیت سے اُکتانے لگی۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں، جو زور سے اٹھتی ہیں، ان کو سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سی پہنا دیتی ہیں اور دُور دُور تک ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا کسی نے سطحِ سمندر پر رُوئی کے گالے بکھیر ڈالے ہیں۔ یہ نظارہ نہایت دلفریب ہے، اگر اس میں موجوں کی دہشت ناک کشاکش کی آمیزش نہ ہو۔ ان کی قوت سے جہاز ایک معمولی کشتی کی طرح جنبش کرتا ہے۔ آسمان اوپر تلے ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، مگر آنکھیں چونکہ اس نظارے سے کسی قدر مانوس ہوگئی ہیں اور نیز جہاز والوں کے چہروں کا اطمینان یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک معمولی بات ہے۔ اس واسطے ہم کو بھی خوف کا احساس نہیں ہوتا۔ یورپین لڑکے لڑکیاں تختہ جہاز پر دوڑتے پھرتے ہیں اور محسوس بھی نہیں کرتے کہ جہاز میں ہیں۔[14]

ہمارا ایک ہم سفر پادری ہے، جو جنوبی ہندوستان سے آیا ہے اور اب اٹلی کو جا رہا ہے۔ گذشتہ رات مجھ سے کسی نے کہا کہ یہ فرانسیسی پادری بہت سی زبانیں جانتا ہے اور روسی زبان خوب بولتا ہے۔ مَیں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے؟ اس نے میرے سوال پر نہایت حیرانی ظاہر کی اور پوچھا کونٹ ٹالسٹائی کون ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ یہ شخص روسی زبان جانتا ہے اور کونٹ کے مشہور نام سے واقف نہیں ہے۔ یہ پادری صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ان میں ایک خاص ہنر ہے اور وہ یہ کہ ہر کسی کو باتوں میں لگا لیتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں، مگر بہت شکستہ اور مجھ کو بلاتے ہیں تو ٹالسٹائی کے نام سے۔ کل مجھ سے پوچھتے تھے کہ تم ہندوستان کا ٹالسٹائی بننا چاہتے ہو۔ مَیں نے جواب دیا، 'ٹالسٹائی بن جانا آسان نہیں ہے۔ زمین سورج کے گرد لاکھوں چکر لگاتی ہے، تب جا کر کہیں ایک ٹالسٹائی پیدا ہوتا ہے'۔[15]

جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوتِ نامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے، شاید ہی کسی اَور چیز سے ہوتا ہو۔ حج

۱۴: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اوّل، ۱۰۳-۱۰۴ ۱۵: ایضاً، ۱۰۴، ۱۰۵-۱۰۶

بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے، جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ شارعِ اسلام کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے: بأبی انت و امی یا رسول اللہ صلی اللہ علیك و سلم۔[16]

کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب، جو اٹھارہ ماہ کی رخصت لے کر ولایت جا رہے ہیں، بڑے باخبر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کل رات اُن سے ہندوستان کے پولیٹکل معاملات پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ عربی اور فارسی جانتے ہیں۔ سر ولیم میور [کی] تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی تو کہنے لگے، 'کاش! یہ شخص ذرا کم متعصب ہوتا'۔ عمر خیام کے بڑے مداح ہیں، مگر مَیں نے ان سے کہا کہ اہلِ یورپ نے ابھی سحابی نجفی کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ عمر خیام کو کبھی کے فراموش کر گئے ہوتے۔[17]

....

ساحل سمندر قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں:

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو اُدھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تُو ایک پتھر تھی، جس کو دنیا کے معماروں نے رَد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے، خدا جانے، تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا، لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کر باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی؛ مگر اے پاک سرزمین! تُو وہ جگہ ہے،

۱۶: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اوّل، ۱۰۴-۱۰۵　۱۷: ایضاً، ۱۰۵، ۱۰۶

جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا، تا کہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سایے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش! میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دِنوں کا کفارہ ہو۔ کاش! مَیں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہُوا اُس پاک سرزمین میں جا پہنچوں، جہاں کی گلیوں میں بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔[۱۸]

....

عدن میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے بنائے ہوئے تالاب ہیں اور یہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک دفعہ بارش کا تمام پانی ہر جگہ سے ڈھل کر ان میں جا گرتا ہے۔ چونکہ ملک خشک ہے، اس واسطے ایسی تعمیر کی سخت ضرورت تھی۔ مَیں بوجہ گرمی کے اور نیز قرنطینہ کے عدن کی سیر نہ کر سکا۔ انجینئری کے اس حیرت ناک کرشمے کی دید سے محروم رہا۔[۱۹]

....

جب ہم نہر سویز پہنچے تو مسلمان دُکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آ موجود ہوئی اور ایک قسم کا بازار تختۂ جہاز پر لگ گیا۔ ان لوگوں کی فطرت میں میلانِ تجارت مرکوز ہے اور کیوں نہ ہو، ان ہی کے آبا و اجداد تھے، جن کے ہاتھوں میں کبھی یورپ اور ایشیا کی تجارت تھی۔ سلیمانِ اعظم انھی میں کا ایک شہنشاہ تھا، جس کی وسعت تجارت نے اقوامِ یورپ کو ڈرا کر ان کو ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی تحریک کی تھی۔ کوئی پھل بیچتا تھا، کوئی پوسٹ کارڈ دِکھاتا تھا، کوئی مصر کے پرانے بُت بیچتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا تھا کہ یہ ذرا سا بُت اٹھارہ ہزار برس کا ہے، جو ابھی کھنڈر کھودنے پر ملا ہے۔ غرضکہ یہ لوگ گاہکوں کو قید کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ انھی لوگوں میں ایک شعبدہ باز

۱۸: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۲/۹/۱۹۰۵ء، اوّل، ۱۰۶-۱۰۷ ۱۹: بنام انشاء اللہ خاں، ۲۵/۱۱/۱۹۰۵ء، اوّل، ۱۱۰

بھی ہے کہ ایک مرغی کا بچہ ہاتھ میں لیے ہوئے ہے اور کسی نامعلوم ترکیب سے ایک کے دو بنا کر دِکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دُکاندار سے مَیں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں مَیں نے اس سے کہا کہ مَیں مسلمان ہوں۔ مگر چونکہ میرے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا کہ تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ جب وہ میرے اسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا کہ 'تم بھی مسلم، ہم بھی مسلم' تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ مَیں نے اسے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمان داڑھی منڈی ہو تو اس کو ترکی ٹوپی، یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیے، ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہوگی۔ مَیں نے دل میں کہا کہ کاش! ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ مروّج ہو جاتا، تاکہ ہمارے دوست موسّی علما کے حملوں سے مامون و مصئون ہو جاتے۔ خیر، آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چونکہ حافظِ قرآن تھا، اس واسطے مَیں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ باقی تمام دُکانداروں کو مجھ سے ملایا اور وہ لوگ میرے گرد حلقہ باندھ کر 'ماشاء اللہ'، 'ماشاء اللہ' کہنے لگے اور میری غرضِ سفر معلوم کر کے دعائیں دینے لگے۔ یا یوں کہیے کہ دو چار منٹ کے لیے وہ تجارت کی پستی سے اُبھر کر اسلامی اخوت کی بلندی پر جا پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوب صورت گروہ جہاز کی سیر کے لیے آیا۔ مَیں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے اور مَیں بھی دخل در معقولات ان میں جا گھسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوب صورت عربی بولتا تھا کہ جیسے حریری کا کوئی مقام پڑھ رہا ہو۔ آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سویز کینال میں جا داخل ہوا۔[۲۰]

۲۰: بنام انشاء اللہ خاں، ۲۵/۱۱/۱۹۰۵ء، اول، ۱۱۰۔ ۱۱۲

یہ کینال، جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے تعمیر کیا تھا، دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا، جس قدر اس مغربی دماغ نے زمانۂ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہُنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا، جس نے اقوامِ عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی، جس نے حال کی دنیا کی تہذیب وتمدن کو اَور سے کچھ اَور کر دیا۔ بعض بعض جگہ یہ کینال ایسی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں سے گزر سکتے ہیں اور کسی کسی جگہ ایسی بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم چاہے کہ رات بھر میں اسے مٹی سے پُر کر دے تو آسانی سے کر سکتا ہے۔ سیکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں، جب ٹھیک رہتی ہے اور اس کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریگ ہَوا سے اُڑ کر اس میں گرتی رہتی ہے، اس کا انتظام رہے۔ کنارے پر جو مزدور کام کرتے ہیں، بعض بعض نہایت شریر ہیں۔ جب ہمارا جہاز آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور جہاز کی چند انگریزی بیبیاں کھڑی ساحل کی سیر کر رہی تھیں تو اُن میں سے ایک مزدور از سرتا پا برہنہ ہو کر ناچنے لگا۔ یہ بیچاری دوڑ کر اپنے کمروں میں چلی گئیں۔[21]

جہاز سے گزرتے ہوئے ایک اَور دلچسپ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ ہم نے ایک مصری جہاز گزرتے ہوئے دیکھا، جو بالکل ہمارے ہی پاس سے ہو کر گزرا۔ اس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوش الحانی سے عربی غزل گاتے جاتے تھے۔ یہ نظارہ ایسا پُر اثر تھا کہ اس کی کیفیت اب تک دل پر باقی ہے۔[22]

ابھی ہم پورٹ سعید نہ پہنچے تھے کہ ایک بارود بھرے ہوئے جہاز کے پھٹ جانے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غرق ہو جانے کی خبر آئی۔ تھوڑی دیر میں اس کے ٹکڑے کینال سے گزرتے ہوئے دِکھائی دیے۔ جان و مال کا بے اندازہ نقصان ہوا اور تھوڑی دیر کے لیے ہماری طبیعت اس مصیبت پر بہت متاثر رہی۔[23]

۲۱: بنام انشاء اللہ خاں، ۲۵/۱۱/۱۹۰۵ء، اوّل، ۱۱۲-۱۱۳   ۲۲: ایضاً، ۱۱۳

۲۳: ایضاً

پورٹ سعید پہنچ کر پھر مسلمان تاجروں کی دُکانیں تختۂ جہاز پر لگ گئیں۔ مَیں ایک کشتی پر بیٹھ کر مع پارسی ہم سفر کے بندرگاہ کی سیر کو چلا گیا۔ پورٹ سعید جہازوں کو کوئلہ مہیا کرنے والے بندرگاہوں میں سب سے بڑا ہے اور سعید پاشا کے نام سے مشہور ہے، جس نے سویز کینال بنانے کی اجازت دی تھی۔ عمارات کا نظارہ نہایت ہی خوب صورت ہے اور شہر چھوٹی موٹی بمبئی ہے، جس کے متعلق خیال ہے کہ یہ کبھی دنیا کے تجارتی مراکز میں سے ایک ہوگا۔ مدرسہ دیکھا، مسجدوں کی سیر کی، اسلامی گورنر کا مکان دیکھا، موجود سویز کینال کا مجسمہ دیکھا؛ غرض کہ خوب سیر کی۔ یہاں کے مدرسے میں عربی اور فرانسیسی پڑھاتے تھے۔ جس حصے میں انگریز آباد ہیں، وہ حصہ خصوصیت سے خوب صورت اور پاکیزہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ جہاں مسلمان آباد ہیں، وہ جگہ بہت میلی ہے۔ یہودی، فرانسیسی، انگریز، یونانی، مسلمان، غرض کہ دنیا کی تمام اقوام یہاں آباد ہیں۔ سب کے محلے جدا جدا ہیں، ہوٹل بھی جدا جدا ہیں اور چرچ بھی۔ شہر کی سیر کر کے پورٹ آفس میں آیا۔ ملازم قریباً تمام مسلمان ہیں اور خوب انگریزی اور عربی بولتے ہیں۔ اس عمارت میں داخل ہو کر مَیں نے 'نوٹس بورڈ' سے کئی نئے عربی الفاظ سیکھے، جن کو ایک کاغذ پر مَیں نے نوٹ کر لیا، لیکن افسوس ہے کہ بعد میں وہ کاغذ بھی کھو گیا۔ کچھ ٹکٹ پوسٹ آفس سے خرید کیے اور خطوں پر لگا کر ڈاک میں ڈالے۔ تعجب ہے کہ ان میں سے کسی خط کی رسید نہیں آئی۔ آخر اپنے مسلمان راہنما کو، جو اکثر زبانیں جانتا تھا، کچھ انعام دے کر جہاز کو لوٹا۔[۲۴]

تختۂ جہاز پر تین اطالین عورتیں اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا۔ ان عورتوں میں ایک لڑکی، جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی، نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانت داری سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے حسن نے تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر سخت اثر کیا، لیکن جب اس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو تمام اثر زائل ہو گیا، کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن، جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو،

۲۴: بنام انشاء اللہ خاں، ۲۵/۱۱/۱۹۰۵ء، اوّل، ۱۱۳۔ ۱۱۴

بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔[۲۵]

بحیرۂ روم کے ابتدائی حصے میں سمندر کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور ہَوا میں ایسا اثر تھا کہ غیر موزوں طبع آدمی بھی موزوں ہو جائے۔ میری طبیعت قدرتاً شعر پر مائل ہو گئی اور مَیں نے چند اشعار کی غزل لکھی:[۲۶]

مثالِ پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

خصوصیت نہیں کچھ اس میں، اے کلیم! تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

نیا جہاں کوئی، اے شمع! ڈھونڈیے کہ یہاں
ستم کش تپش ناتمام کرتے ہیں

عجب تماشا ہے مجھ کافرِ محبت کا
صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں

ہَوا جہاں کی ہے پیکار آفریں کیسی
کہاں عدم کے مسافر قیام کرتے ہیں

نظارہ لالے کا تڑپا گیا مِرے جی کو
بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں

رہینِ لذتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرار
یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں

بھلی ہے، ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی
کہ خوش نواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں

غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

۲۵: بنام انشاء اللہ خاں، ۲۵/۱۱/۱۹۰۵ء، اوّل ۱۱۴ ۲۶: ایضاً ۱۱۴

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

مَیں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے
نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر، اے واعظ!
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو!
جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز، اقبال!
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

مازنی اٹلی کے محسنین کا سرگروہ تھا۔ یہ شعر اُس وقت لکھا گیا، جب کہ ملک کا ساحل نظر کے سامنے تھا۔[27]

مارسیلز تک پہنچنے میں چھ روز صرف ہوئے، کچھ تو اس وجہ سے کہ سمندر کا آخری حصہ بہت متلاطم تھا اور کچھ اس خیال سے کہ اصلی راستہ میں طوفان کا اندیشہ ہوگا، ہمارا کپتان جہاز کو ایک اَور راستے سے لے گیا، جو معمولی رستے سے کسی قدر لمبا تھا۔ ۲۳ر کی صبح کو مارسیلز، یعنی فرانس کی ایک مشہور تاریخی بندرگاہ پر پہنچے اور چونکہ ہمیں آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ مل گیا تھا، اس واسطے بندرگاہ کی خوب سیر کی۔

مارسیلز کا نوٹرڈام گرجا نہایت اونچی جگہ تعمیر ہوا ہے اور اس کی عمارت کو دیکھ کر دل پر یہ بات منقوش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثیر ہی حقیقت میں تمام علوم وفنون کی محرک ہوئی

۲۷: بنام انشاء اللہ خاں، ۱۹۰۵/۱۱/۲۵ء، اوّل ۱۱۴-۱۱۶

ہے۔ مارسیلز سے گاڑی پر سوار ہوئے اور فرانس کی سیر بھی 'حسن رہگذر' کے طریق پر ہو گئی۔ کھیتیاں، جو گاڑی کے اِدھر اُدھر آتی ہیں، ان سے فرانسیسی لوگوں کا نفیس مذاق مترشح ہوتا ہے۔ ایک رات گاڑی میں کٹی اور دوسری شام ہم لوگ برٹش چینل کو کراس کر کے ڈوور اور ڈوور سے لندن پہنچے۔ شیخ عبدالقادر کی باریک نگہ نے باوجود میرے انگریزی لباس کے، مجھے دُور سے پہچان لیا اور دوڑ کر بغل گیر ہو گئے۔ مکان پر پہنچ کر رات بھر آرام کیا، دوسری صبح سے کام شروع ہوا، یعنی اُن تمام فرائض کا مجموعہ، جن کی انجام دہی نے مجھے وطن سے جدا کیا تھا اور میری نگاہ میں ایسا ہی مقدس ہے، جیسے عبادت۔[۲۸]

....

مَیں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی، میرے قیام کا انتظام ایسے گھر میں کروا دیا جائے، جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ میں صرف یہودی اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ اپنا ذبیحہ کھائیں، چنانچہ ایک اچھے یہودی کے گھر میں میری رہائش کا انتظام کروا دیا گیا۔ ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اپنی نماز باقاعدہ پڑھتے تھے۔ جب مَیں گھر میں ہوتا تو مَیں بھی شریک ہو جاتا تھا۔ مَیں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے بھی پیغمبر ہیں اور مَیں اُن کی روِش پر چل سکتا ہوں، وغیرہ؛ لیکن کچھ عرصے کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔ مجھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر اُس چیز میں، جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو مَیں ان کے ذریعے منگواتا تھا، یہ لوگ دُکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے۔ ان کی اسی ایک عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔[۲۹]

۲۸: بنام انشاء اللہ خاں، ۲۵/۱۱/۱۹۰۵ء، اوّل، ۱۱۶۔۱۱۷ ۲۹: اقبال کے چند جواہر ریزے، ۱۱، ۱۲

۱۹۰۶ء

مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز میں پکارتا...... All change......یعنی سب بدلو۔ ایک روز مَیں حسبِ معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں۔ ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے، چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا۔ مَیں نے کہا، 'ابھی جواب دیتا ہوں'۔ یہ کہہ کر مَیں چپ رہا۔ چند منٹوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔ مَیں نے پھر کہا، 'ابھی جواب دیتا ہوں'۔ وہ کہنے لگے، 'شاید آپ سوچ رہے ہیں'۔ مَیں نے کہا، 'ہاں'۔ اس دَوران میں اسٹیشن آ گیا۔ گارڈ All change پکارنے لگا۔ مَیں نے کہا، 'بس یہی بدھ مذہب ہے'۔[1]

....

مجھے سخت افسوس ہے کہ یہاں کے مشاغل سے مطلق فرصت نہیں ملتی، ایسے حالات میں مضامین لکھنے کی کہاں سوجھتی ہے؛ البتہ شعر ہے، جو کبھی کبھی خود موزوں ہو جاتا ہے، سو شیخ عبدالقادر (ایڈیٹر مخزن) لے جاتے ہیں۔[2]

....

۱: اقبال کے چند جواہر ریزے، ۱۲، ۱۳ ۲: بنام فوق، ؟/۳/۱۹۰۶ء، اول، ۱۲۴-۱۲۵

تعطیلات کے زمانے میں پچھ دِنوں کے لیے مَیں اپنے ایک ہم سبق انگریز دوست کے ہمراہ اس کے وطن چلا گیا۔ اس کا گھر اسکاٹ لینڈ کے ایک دُور افتادہ قصبے میں تھا۔ مجھے وہاں گئے چند روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا کہ ایک مشنری، جو ہندوستان سے آئے ہیں، آج شام کو قصبے کے اسکول میں لیکچر دیں گے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو کس قدر فروغ ہو رہا ہے۔ مَیں اور میرا میزبان دونوں لیکچر سننے کے لیے پہنچے۔ سامعین میں عورتیں ورمرد کافی تعداد میں تھے۔ مشنری نے بتایا کہ ہندوستان میں تیس کروڑ انسان آباد ہیں، لیکن ان لوگوں کو انسان کہنا جائز نہیں۔ عادات وخصائل اور بود وباش کے اعتبار سے یہ لوگ انسانوں سے بہت پست اور حیوانوں سے کم اوپر ہیں۔ ہم نے سالہا سال کی جدوجہد سے ان حیوان نما انسانوں کو تھوڑی بہت تہذیب سے آشنا کیا ہے، لیکن کام بہت وسیع اور اہم ہے، آپ ہمارے مشن کو دل کھول کر چندہ دیجیے، تاکہ اس عظیم الشان مہم میں، جو ہم نے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے جاری کر رکھی ہے، زیادہ سے زیادہ کامیابی ہو۔ یہ کہہ کر مشنری نے میجک لینٹرن سے سامنے لٹکے ہوئے پردے پر ہندوستانیوں کی تصویریں دِکھانا شروع کیں۔ ان میں بھیل، گونڈ، دراوڑ اور اڑیسہ کے جنگلوں میں بسنے والی قوم کے نیم برہنہ افراد کی نہایت مکروہ تصاویر تھیں۔ جب لیکچر ختم ہو گیا تو مَیں نے کھڑے ہو کر صدرِ جلسہ سے کچھ کہنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے بخوشی اجازت دے دی تو مَیں نے بڑے جوش سے پچیس منٹ تقریر کی۔ مَیں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ مَیں خالص ہندوستانی ہوں۔ میرا خمیر اُسی ملک کی سرزمین سے اُٹھا ہے۔ آپ میری وضع قطع، رنگ روپ، چال ڈھال دیکھ لیجیے۔ مَیں آپ لوگوں کی زبان میں اسی روانی سے تقریر کر رہا ہوں، جس روانی سے مشنری صاحب نے بزعمِ خود حقائق ومعارف کے دریا بہائے ہیں۔ مَیں نے ہندوستان ہی میں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے، اب مزید تعلیم کے لیے کیمبرج میں آیا ہوں۔ آپ میری شکل و صورت دیکھ کر اور میری باتیں سن کر خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ مشنری صاحب نے ہندوستان کے باشندوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ کہاں تک درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

ہندوستان مشرقی دنیا کا ایک متمدن و مہذب ملک ہے، جس نے صدیوں تک تہذیب اور علم کی شمع بلند رکھی ہے۔ [اب] اگرچہ ہم سیاسی طور پر انگلستان کے غلام ہوگئے ہیں، لیکن ہمارا اپنا ادب ہے، اپنا تمدن ہے، اپنی قومی روایات ہیں، جو کسی طرح مغربی قوموں کی روایات سے کم شاندار نہیں ہیں۔ مشنری صاحب نے محض آپ کے جذبات کو برانگیختہ کر کے آپ کی جیبیں خالی کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی یہ گھناؤنی اور خوف ناک تصویر پیش کی ہے...... جونہی میری تقریر ختم ہوئی، جلسے کا رنگ بالکل بدل گیا۔ سب لوگ میرے ہم خیال ہو گئے اور مشنری صاحب کو حد درجہ مایوس ہو کر وہاں سے خالی ہاتھ نکلنا پڑا۔[۳]

....

جب مَیں نے زمانے کی حقیقت پر ایک مقالہ لکھا تو میرے استاد ڈاکٹر میک ٹیگرٹ نے اسے دیکھا، مگر اس قدر ناپسند کیا کہ مَیں نے دل برداشتہ ہو کر اسے تلف کر دیا؛ لیکن تھوڑے ہی دِنوں میں جب برگساں نے اس موضوع پر ویسے ہی اظہارِ خیال کیا اور اس کے نظریے کی اشاعت ہونے لگی تو میک ٹیگرٹ کو بڑا دُکھ ہوا، اس لیے کہ برگساں نے بھی کم و بیش وہی نظریہ قائم کیا تھا، جسے پہلے مَیں اپنے مقالے میں پیش کر چکا تھا۔ میک ٹیگرٹ نے مجھ سے کہا، 'افسوس ہے، مَیں نے اپنا فریضۂ استادی ادا نہیں کیا۔ مَیں نے تم پر بڑا ظلم کیا کہ ایک بہت بڑے کارنامے سے محروم کر دیا۔' مجھے بھی رنج تھا کہ مَیں نے اپنا مقالہ کیوں تلف کر دیا۔[۴]

فارسی و عربی میں اپنے علم اور یورپی فلسفے سے اپنی شناسائی کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ مَیں اسلامی فلسفے کے کسی شعبے میں مغرب کے علم میں شاید کوئی اضافہ کر سکوں، اس لیے مَیں ایران میں مابعد الطبیعیاتی تصورات کا آغاز و ارتقا کو اپنے موضوعِ تحقیق کے طور پر تجویز کرتا ہوں۔[۵]

....

۳: آثارِ اقبال، ۳۹-۴۱

۴: اقبال کے حضور، ۶۶-۶۷

۵: بنام سینئر ٹیوٹر ٹرینٹی کالج کیمبرج، ۲۹/۹/۱۹۰۵ء

مَیں لندن آ رہا ہوں اور...... [عطیہ فیضی] سے ملنے کا مشتاق ہوں۔[۶]

۶: بنام عطیہ فیضی، ؟/۳/۱۹۰۶ء، اوّل، ۱۲۶

۱۹۰۷ء

مَیں ...... [عطیہ] کو مسٹر اور مسز سید علی بلگرامی کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں کہ کیمبرج میں اُن کی مہمان بنیں اور میرا مشن یہ ہے کہ مَیں بغیر کسی رکاوٹ کے ...... [عطیہ] کی منظوری اُن تک پہنچا دوں۔ اگر انکار کریں گی تو اس ناکامی کا داغ مجھ پر رہے گا، جسے مَیں نے آج تک کبھی قبول نہیں کیا اور اگر دعوت منظور کر لیں گی تو درحقیقت میزبانوں کی عزت افزائی کریں گی۔[1]

....

مَیں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں؛ ظاہری شخصیت کار آمد اور عملی ہے اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے فلسفی اور صوفی کی سی ہے۔[2] فلسفے کا مجھے زیادہ شوق ہے۔ یورپ میں جو کچھ میسر ہے، اُسے حاصل کروں گا۔ جرمنی اور فرانس بھی جاؤں گا، وہاں بہت کچھ ہے، جو یہاں پر نہیں ہے۔[3]

جب مَیں حافظؔ کے رنگ میں ہوتا ہوں، اُس وقت اُن کی رُوح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت شاعر کی شخصیت میں گم ہو جاتی ہے اور مَیں خود حافظؔ بن جاتا ہوں۔ بابا فغانی کی بہت کم تصانیف ہندوستان میں دستیاب ہوتی ہیں، لیکن اُن کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ وہ ایک جداگانہ زاویۂ نگاہ پیش کرتی ہیں۔[4]

....

اگر زندگی میں مجھے کبھی ناکامی کا خطرہ پیش آیا تو وہ اُس وقت تھا، جب کہ مَیں مس

۱: اقبال از عطیہ، مترجمہ ضیاء الدین برنی، ۲۳   ۲: ایضاً
۳: ایضاً، ۹۷   ۴: ایضاً، ۲۴

فیضی سے ملا، جنھوں نے محض...... [سید علی بلگرامی] کے احترام میں دعوت نامے کو رد نہ کر کے میری لاج رکھ لی۔[۵]

[عطیہ کے لیے] حسب وعدہ اپنی ایک نظم بھیج رہا ہوں۔ خیال تھا کہ اپنی کتاب علم الاقتصاد بھی پیش کرتا۔ افسوس ہے، میرے پاس یہاں کوئی نسخہ موجود نہیں۔[۶]

اے گُل ز خارِ آرزو آزاد چوں رسیدۂ
تو ہم ز خاکِ ایں چمن مانندِ ما دمیدۂ

اے شبنم از فضاے گُل آخر ستم چہ دیدۂ
دامن ز سبزہ چیدۂ ، تا بفلک رمیدۂ

از لوحِ خویش باز پُرس قصہ جرمہاے ما
آخر جوابِ ناسزا از لبِ ما شنیدۂ

بامن مگو کہ مثلِ گُل ہموارہ شاخ بستہ باش
مانندِ موجِ بُو مرا آوارہ آفریدۂ

ہنگامہ دَیر یک طرف ، شورشِ کعبہ یک طرف
از آفرینشِ جہاں دردِ سرے خریدۂ

ہستیم ما گداے تو یا تو گداے ماستی؟
بہرِ نیاز سجدۂ در پسِ ما دویدۂ

افتی اگر بدست ما حلقہ بگردِ تو کشیم
ہنگامہ گرم کردۂ خود از میاں رمیدۂ

اقبال غربتِ توام نشتر بدل ہمی زند
تو در ہجوم عالمے یک آشنا ندیدۂ[۷]

....

۵: اقبال از عطیہ، مترجمہ ضیاء الدین برنی، ۶۳
۶: بنام عطیہ فیضی، ۲۴/۴/۱۹۰۷ء، اقبال نامہ، ۴۲۴
۷: اقبال از عطیہ، مترجمہ ضیاء الدین برنی، ۲۷

لنکنز اِن کی آنریبل سوسائٹی سے مجھ کو جولائی میں کامیاب قرار دیا گیا۔[8]

....

اہل اللہ کے حالات، جو...... [منشی محمد الدین فوق] نے بنام یادِ رفتگاں تحریر فرمائے ہیں، مجھ پر بڑا اثر کیا اور بعض باتوں نے مجھے اتنا رُلایا کہ مَیں بے خود ہو گیا۔ زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ اُن لوگوں کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل علت حسنِ ظن کو دُور ہو جانا ہے۔[9]

....

کچھ روپیہ میرے پاس موجود تھا، لیکن زیادہ تر رقم میرے بھائی صاحب نے مجھ کو دی تھی۔ ولایت کے قیام کے دَوران بھی وقتاً فوقتاً مجھ کو روپے بھیجتے رہتے تھے۔ جب مَیں نے کیمبرج سے بی اے کر لیا تو انھوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس پورا کر کے واپس آ جاؤ، لیکن میرا ارادہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا، اس لیے مَیں نے جواب دیا کہ کچھ رقم بھیجیے، تاکہ جرمنی جا کر ڈاکٹری کی سند لے لوں۔ انھوں نے مجھے مطلوبہ رقم بھیج دی۔ اُنھی دِنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا، 'کیوں شیخ صاحب! سنا ہے، اقبال نے ایک اَور ڈگری لے لی ہے؟' بھائی صاحب نے جواب دیا، 'بھئی! کیا بتلاؤں، ابھی تو وہ ڈگریوں پر ڈگریاں لیے جا رہا ہے۔ خدا جانے، ان ڈگریوں کا اجرا کب ہو گا؟'[10]

....

مَیں ہائیڈل برگ میں اُن ایام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، جب...... [میری جرمن استانی ایما ویگے ناسٹ] نے مجھے گوئٹے کا فاؤسٹ پڑھایا تھا اور ہر طرح میری امداد کی تھی۔ وہ واقعی بڑے خوش گوار دِن تھے۔[11] [یہاں میونخ میں] مَیں نے اخبار میں ایک اشتہار دے دیا ہے کہ مجھے ایک استانی کی ضرورت ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ہائیڈل برگ

۸: بنام جج چیف کورٹ، ؟/۱۰-۱۱/۱۹۰۸ء

۹: بنام فوق، ۷/۱۰/۱۹۰۷ء، اوّل، ۱۲۹-۱۳۰

۱۰: آثارِ اقبال، ۳۶

۱۱: بنام ایما، ۳۰/۱۰/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۵۱

کے قیام کے دَوران مَیں نے جرمن لکھنے کی مشق نہ کی۔[۱۲]

مجھے میونخ بڑا پسند آیا ہے۔ جناب رائنر [Reiner] نے یہاں اپنی ایک جاننے والی کو لکھا تھا اور انھوں نے میرے لیے ایک استانی ڈھونڈ لی ہے۔ اگرچہ اس مکان میں جرمن زبان بولنے کا کوئی موقع میسر نہیں آتا، تاہم مَیں اپنی دونوں استانیوں کے ساتھ کافی گفتگو کر لیتا ہوں۔ کل ہم لوگ ایک نمائشِ ہُنر دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اتنی بہت (سی) خوب صورت تصویریں ہیں کہ انسان خود کو ایک دنیائے خواب میں محسوس کرتا ہے۔ ہم نے وہاں دو گھنٹے گزارے اور میری استانی، جو آرٹ کی سمجھ رکھتی ہیں، میرے لیے ایسی باتوں کی وضاحت کرتی رہیں، جن سے مَیں اس سے پہلے بے خبر تھا۔[۱۳]

کل مجھے [ہائیڈل برگ کی] پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا۔ انھیں جناب رائنر سے اطلاع ملی تھی کہ مَیں اس اقامت خانے سے خوش نہیں ہوں۔ مَیں نے انھیں لکھا ہے کہ جو شخص اقامت خانۂ شیرر میں رہ چکا ہو، اسے اَور کوئی اقامت گاہ پسند نہیں آ سکتی۔[۱۴]

[میرا پی ایچ ڈی کا] مقالہ [*Metaphysic of Persia*] منظور ہو چکا ہے، زبانی امتحان عنقریب ہی ہوگا۔[۱۵]

میرا خیال تھا کہ مَیں ہائیڈل برون کے رستے سفر کر سکوں گا، لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ میرے لیے یہ قطعی لازم تھا کہ مَیں پانچ نومبر کو لندن میں رہوں۔ پروفیسر آرنلڈ مصر گئے ہیں اور مَیں عربی کا پروفیسر مقرر رہا ہوں۔ میرے ذمے ہفتے میں دو لیکچر ہیں۔[۱۶]

۱۲: بنام ایما، ۱۹۰۷/۱۰/۱۶ء، اوّل، ۱۳۱
۱۳: بنام ایما، ۱۹۰۷/۱۰/۲۷ء، اوّل، ۱۳۳-۱۳۴
۱۴: ایضاً، ۱۳۴
۱۵: بنام آرنلڈ، ۱۹۰۷/۱۰/۳۱ء (بحوالہ نوادرِ اقبال میں، ۸۹)
۱۶: بنام ایما، ۱۹۰۷/۱۲/۲ء، اوّل، ۱۳۶

۱۹۰۸ء

مَیں گورنمنٹ کالج لاہور کی اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ کی اسامی سے یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء سے تین سال کی رخصت پر ہوں۔ ذاتی حالات کی بنا پر معلّمی کا پیشہ اپنائے رکھنا میرے لیے چنداں سودمند نہیں اور مَیں کوئی اَور پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوں[1]

....

انگلستان میں مَیں نے اسلامی مذہب وتمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے، دوسرا 'اسلامی تصوف' پر فروری کے تیسرے ہفتے میں ہو گا۔ باقی لیکچروں کے معانی [عنوان؟] یہ ہوں گے، 'مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر'، 'اسلامی جمہوریت'، 'اسلام اور عقلِ انسانی' وغیرہ[2]

....

مَیں جولائی کے اوائل میں ہندوستان لوٹ رہا ہوں اور میری تمنا ہے کہ اپنے سفر سے پیشتر...... [ایما] سے ملنے کا موقع مجھے حاصل ہو سکے۔[3]

مس [عطیہ] فیضی اپنی بہن [رفیعہ نازلی سلطان] اور برادرِ نسبتی [نواب سرسدی خاں] کے ساتھ یہاں ہیں۔ مَیں چندروز ہوئے، ان سے ملنے گیا تھا۔[4]

[آٹوگراف برائے نازلی بیگم]

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیضِ آستاں بوسی سے گُل بر سر قمر

۱: اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ۷۶
۲: بنام حسن نظامی، ۱۹۰۸/۲/۱۰ء، اوّل، ۱۴۳
۳: بنام ایما، ۱۹۰۸/۲/۲۶ء، اوّل، ۱۴۴
۴: بنام ایما، ۱۹۰۸/۶/۳ء، اوّل، ۱۴۶

روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر

کاروانِ قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدرِ محفلِ اختر قمر

شمعِ بزمِ اہلِ ملت را چراغِ طور کن
یعنے ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کن[5]

مَیں بہت مصروف ہوں۔ جلد انگلستان سے رخصت ہو رہا ہوں آغازِ جولائی میں۔ معلوم نہیں کہ جرمنی کے رستے میرا سفر کرنا ممکن ہو گا یا نہیں۔ میری شدید تمنا ہے کہ مَیں ہندوستان واپسی سے پہلے...... [ایما] سے ملاقات کر سکوں۔ میرا جسم یہاں ہے، میرے خیالات جرمنی میں ہیں۔[6]

مَیں نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ جرمنی کے رستے سفر کر سکوں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ مَیں ۳/جولائی کو انگلستان سے روانہ ہوں گا اور چند روز پیرس میں رُکوں گا، جہاں مجھے کچھ کام ہے۔[7]

....

جب مَیں ہندوستان پہنچا تو میرے ہم وطنوں نے میرا ایسا شاندار استقبال کیا، جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ملک بھر سے مجھے چالیس کے قریب (تہنیتی) نظمیں موصول ہوئیں۔ جب مَیں لاہور پہنچا تو احباب اور قدر دانوں کی جانب سے سونے کا ہار پہنا کر استقبال کیا گیا۔ بمبئی سے لاہور اور سیالکوٹ تک ہر اسٹیشن پر ہزارہا لوگ جمع تھے۔ چھوٹے بڑے راستے کے اسٹیشنوں پر میری نظمیں گا رہے تھے۔ گھر پہنچا تو والدین کو بخیر و عافیت دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میری بہنیں اور والدہ بڑی مسرور ہیں کہ اب مَیں اُن سے آن ملا ہوں۔[8]

۵: اقبال از عطیہ مترجمہ ضیاء الدین برنی، ۴۶
۶: بنام ایما، ۳/۶/۱۹۰۸ء، اوّل، ۱۴۶
۷: بنام ایما، ۲۷/۶/۱۹۰۸ء، اوّل، ۱۴۷۔۱۴۸
۸: بنام ایما، ۱۱/۱/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۶۲۔۱۶۳

میرے لاہور کے دوستوں نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے لیے لاہور میں کام شروع کرنا اشد ضروری ہے۔ بہت سے اسباب ہیں، جن کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔[9]

مَیں ایک دو ماہ کے لیے سیالکوٹ مقیم رہوں گا، اس کے بعد لاہور بیرسٹری کا کام شروع کروں گا۔ [گورنمنٹ کالج لاہور کی] ملازمت کا سلسلہ ترک کر دیا ہے۔[10] [البتہ] ابھی کچھ عرصے تک کچھ نہ کر سکوں گا، کیونکہ ہمہ تن قانون کی کتب کی طرف متوجہ ہوں۔ چونکہ اس کام کو شروع کیا ہے، اس واسطے ارادہ ہے کہ اس کو حتی الامکان پورے طور پر کروں۔ روٹی تو خدا ہر ایک کو دیتا ہے، میری آرزو ہے کہ مَیں اس فن میں کمال پیدا کروں۔ ان شاء اللہ نومبر میں لاہور چلا جاؤں گا اور مستقل طور پر کام شروع کروں گا۔[11]

....

مَیں کیا اور میرا کلام کیا! نہ مجھے ان اَوراقِ پریشاں کے جمع کرنے کی فرصت ہے، نہ حقیقت میں ان کی ضرورت ہے؛ محض دوستوں کے دل بہلانے کے لیے کبھی کبھی کچھ لکھتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔ گذشتہ تین سال سے بہت کم اتفاق شعر گوئی کا ہوتا ہے اور اب تو مَیں پیشہ اس قسم کا اختیار کرنے [کو] ہوں، جس کو شاعری سے کوئی نسبت نہیں۔[12]

۹: بنام عبدالعزیز، ۱۹۰۸/۸/۲۹ء، اوّل، ۱۴۹
۱۰: بنام شاطر مدراسی، ۱۹۰۸/۸/۲۹ء، اوّل، ۱۵۱
۱۱: بنام فوق، ۱۹۰۸/۸/۲۹ء، اوّل، ۱۵۲
۱۲: بنام شاطر مدراسی، ۱۹۰۸/۸/۲۹ء، اوّل، ۱۵۱

۱۹۰۹ء

ہائیڈل برگ میں میرا قیام مجھے ایک خوب صورت خواب سا لگتا ہے اور مَیں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں[1] کچھ عرصہ بعد، جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو مَیں یورپ میں اپنا گھر بناؤں گا۔ یہ میرا تصور ہے اور میری تمنا ہے کہ یہ سب پورا ہو[2]

....

[عطیہ فیضی کی والدہ کی رحلت پر] ذاتی طور پر تعزیت کے لیے میرا بمبئی آنے کا ارادہ تھا، لیکن بد قسمتی سے ۲۹ر دسمبر کو جب مَیں [امرتسر میں منعقدہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل] کانفرنس کے مباحث میں شریک تھا، وطن سے بھائی جان کی تشویش ناک علالت کی اطلاع بذریعہ تار ملی۔ اسی سہ پہر سیالکوٹ چلا گیا اور بقیہ تعطیلات ان کی تیمارداری میں صرف ہو گئیں۔ خوش قسمتی سے اب وہ صحت یاب ہیں۔ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ازسرِ نو زندگی بخش کر مجھے ایک دردناک حادثے سے بال بال بچا لیا ہے۔ مَیں ان کا کتنا ہی روپیہ [اپنی ذات پر] خرچ کر چکا اور ابھی کر رہا ہوں[3]

جنجیرہ آنے کی دعوت کے لیے...... [عطیہ] کا، نواب [سرسدی خاں] صاحب کا اور بیگم [رفیعہ نازلی سلطان] صاحبہ کا ممنونِ احسان ہوں۔ یہ دعوت میرے لیے مسرت و شفقت کی سرمایہ دار تھی، لیکن مَیں نے ابھی ابھی اپنا کام شروع کیا ہے، جو اس جگہ میری مستقل موجودگی کا متقاضی ہے۔ ان مقاصد کی خاطر، جہاں میری موجودہ حالت کے پیش

۱: بنام ایما، ۱۱/۱/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۶۴ ۲: ایضاً، ۱۶۳

۳: بنام عطیہ فیضی، ۱۳/۱/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۶۵

نظر جبرِ مشیت اَور زیادہ شدت سے اپنے آپ کو محسوس کراتا ہے، مَیں اپنے جذبات کی سختی سے پائمالی پر مجبور ہوں۔ مستقبل قریب میں میرے لیے جنجیرہ آنا ممکن نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، ستمبر کی تعطیلوں میں، جب چیف کورٹ بند ہوتا ہے، مَیں ملاقات کی کوئی سبیل نکالوں گا۔ نواب صاحب، بیگم صاحبہ اور...... [عطیہ] کی مختصر صحبت بھی میرے لیے بیک وقت دِلی مسرت اور ذہنی منفعت کی سرمایہ دار ہے۔[۴] فلسفہ عجم شائع ہو چکا ہے، جلد ایک نسخہ خدمتِ عالی میں مرسل ہوگا۔ غزلوں کا مجموعہ جلد شائع کرنے کا آرزو مند ہوں۔ یہ مجموعہ ہندوستان میں طبع ہوگا، جرمنی میں جلد بندھے گی اور ایک 'ہندوستانی خاتون' [عطیہ؟] کے نام سے فخرِ انتساب حاصل کرے گا۔[۵]

....

حلقہ نظام المشائخ کے متعلق آج مسٹر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا سے سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے ذرا کاروبار کی طرف سے اطمینان ہو لے تو پھر عملی طور پر اس میں دلچسپی لینے کو حاضر ہوں۔[۶]

....

مَیں علی گڑھ کالج کی پروفیسری نامنظور کرنے سے [اپنے دوستوں کی طرف سے] ہدفِ ملامت ہو رہا ہوں۔[۷] چند روز پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے [بھی] انکار کر دیا۔ مَیں ملازمت کرنا ہی نہیں چاہتا۔ میرا ارادہ تو اوّلین فرصت میں اس ملک سے ہجرت کر جانے کا ہے۔ مجھے اپنے بھائی کا ایک طرح کا اخلاقی فریضہ ادا کرنا ہے، جو زنجیرِ پا بنا ہوا ہے۔[۸]

....

میرا یہ نظریہ رہا ہے کہ اس ملک سے مذہبی اختلافات اُٹھ جانے چاہییں اور مَیں اب بھی اپنی نجی زندگی میں اسی اصول پر کاربند ہوں، مگر اب مَیں سوچتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنا اپنا قومی تشخص ایک دوسرے سے الگ برقرار

۴: بنام عطیہ فیضی، ۱۳/۱/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۶۵-۱۶۶
۵: ایضاً، اقبال نامہ، ۴۲۶
۶: بنام حسن نظامی، ۱۴/۱/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۶۷
۷: بنام حسن نظامی، ؟/؟/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۷۱
۸: بنام عطیہ فیضی، ۹/۴/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۷۳-۱۷۴

رکھیں۔ ہندوستان کے لیے ایک مشترک قومیت کا تصور بجائے خود نہایت حسین اور شاعرانہ کشش کا حامل ہے، تاہم موجودہ حالات اور دونوں قوموں کے نادانستہ رجحانات کے پیش نظر وہ ناقابلِ عمل ہے۔[9]

....

میری زندگی حد درجہ تلخ ہے۔...... [والد صاحب] مجھ پر میری بیوی [کریم بی بی] مسلط کر رہے ہیں۔...... مَیں اُس کا نان نفقہ برداشت کرنے کو تو ضرور آمادہ ہوں، لیکن اسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی اجیرن بنانے کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں ہوں۔ ایک انسان ہونے کے ناطے میرا بھی خوشی پر حق ہے۔ اگر سوسائٹی یا نیچر مجھے اس سے محروم کرتی ہے تو مَیں دونوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہوں۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ مَیں اس بد بخت ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دوں یا پھر شراب میں پناہ ڈھونڈوں، جو خود کشی کو آسان تر بنا دیتی ہے۔ یہ کتابوں کے مُردہ بنجر اَوراق میرے لیے سرمایۂ مسرت سے عاری ہیں۔ میری رُوح کا سوزان کے ساتھ تمام سماجی رسوم و رواج کو جلا کر خاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔[10]

گذشتہ رات مَیں خواب میں بہشت میں گیا، لیکن جہنم کے دروازوں سے ہو کر گزرنا پڑا۔ مجھے وہ مقام ہیبت ناک طور پر برفستان لگا۔ دوزخ کے اربابِ اختیار نے میری حیرت دیکھ کر کہا کہ اس مقام کی فطرت وہ حد درجہ باردِ ہے، لیکن یہ گرم ترین مقام بن جاتا ہے، اس کے گرمانے کے لیے ہر شخص اپنا ایندھن ساتھ لاتا ہے۔ مَیں بھی اس سلسلے میں امکان بھر کوئلہ جمع کرنے کی فکر میں ہوں، کیونکہ وہاں (عالمِ بالا میں) کوئلے کی کانوں کی بہت قلت ہے۔[11]

میری کم گوئی اَب بڑھتی جاتی ہے۔ میرا سینہ یاس انگیز اور غم انگیز خیالات کا خزینہ ہے۔ یہ خیالات میری رُوح کی تاریک بانبیوں سے سانپ کی طرح نکلے چلے آتے ہیں۔

۹: بنام غلام قادر فرخ، ۱۹۰۹/۳/۲۸ء بحوالہ زندہ رُود، ۱۶۵

۱۰: بنام عطیہ فیضی، ۱۹۰۹/۴/۹ء، اوّل، ۱۷۴-۷۵ ۱۱: بنام عطیہ فیضی، ۱۹۰۹/۴/۱۷ء، اوّل، ۱۷۹

مجھے خدشہ ہے کہ مَیں ایک سپیرا بن جاؤں گا اور گلیوں میں گھومتا پھروں گا۔ تماش بین لڑکوں کی ایک بھیڑ میرے پیچھے پیچھے ہوگی۔ مَیں کوئی قنوطی نہیں ہوں، میری تیرہ بختی میرے لیے ایک لطف ولذت کی سرمایہ دار ہے۔ مَیں اُن لوگوں پر ہنستا ہوں، جو اپنے کو خوش سمجھتے ہیں۔[12]

....

چند روز گزرے، مَیں نے 'سماج کے ارتقا میں مذہب کے عنصر کا مفہوم' پر ایک جلسۂ عام میں تقریر کی تھی۔ انجمن [حمایتِ اسلام] میں میرا لیکچر 'اسلام ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے' کے زیرِ عنوان انگریزی میں ہوگا۔[13]

فان کریمر نے جرمن زبان میں ایک مبسوط کتاب تاریخ القرآن لکھی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ کبھی فرصت ملے تو اس کے بعض حصص کا ترجمہ اردو میں کر ڈالوں۔ کتاب کا انداز عالمانہ اور منصفانہ ہے، اگرچہ مجموعی لحاظ سے اس کا مقصد ہماری آرا اور عقائد کے خلاف ہے۔ میرا مقصد ترجمے سے صرف یہ ہے کہ ہمارے علما کو یورپ والوں کے طرزِ استدلال و تحقیق معلوم ہو۔[14]

....

حکومتِ پنجاب نے مجھے عارضی طور پر آنجہانی مسٹر جیمس، فلسفے کے پروفیسر کی ذمہ داریاں گورنمنٹ کالج لاہور میں سونپی ہیں۔ کالج کے اربابِ حل وعقد کی اس دُشواری کے پیشِ نظر، جو فلسفے کے پروفیسر کی اچانک وفات سے پیدا ہوگئی ہے۔[15] پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صبح کچہری نہ جا سکتا تھا، چیف جج ہائی کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دِن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں۔[16]

....

مَیں عموماً جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو پھر اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیتا ہوں؛ جدھر چاہیں، بہا لے جائیں۔[17] بلاشبہ ہر شخص کے لیے زندگی موت کے انتظار

۱۲: بنام عطیہ فیضی، ۱۷/۴/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۸۰
۱۳: بنام عطیہ فیضی، ۹/۴/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۷۵-۱۷۶
۱۴: بنام شیخ عطاء اللہ، ۱۰/۴/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۷۷-۱۷۸
۱۵: بنام چیف کورٹ، ۸/۵/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۸۲
۱۶: بنام شاد، ۱۵/۴/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۸۹
۱۷: بنام عطیہ فیضی، ۱۷/۷/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۸۸

کا نام ہے۔ مَیں بھی اگلے جہان کی سیر کا آرزومند ہوں، وہاں پہنچ کر چاہتا ہوں کہ اپنے خالق کی زیارت کروں اور اُس سے تقاضا کروں کہ میری ذہنی کیفیت کی عقلی وضاحت کی جائے۔[18]

مجھے دوسروں کے اکرام واحترام کی پروانہیں، مَیں دوسروں کی واہ واپر زندہ رہنے کا قائل نہیں:

جینا وہ کیا، جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

میری ایک سیدھی سادی ایماندارانہ زندگی ہے۔ میرا دل میری زبان سے کاملاً ہم آہنگ ہے۔ لوگ منافقت و ریاکاری کی عزت و تعریف کرتے ہیں۔ اگر ریاکاری و منافقت ہی میرے لیے وجہِ حصولِ احترام وعقیدت ہوسکتی ہے تو مجھے گم نام اور بے نام و نشان مرجانا زیادہ پسند ہے۔ عوام کے احترام وعقیدت کا خراج اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو اُن کے غلط نظریاتِ اخلاق و مذہب کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے عوام کے احترام کی خاطر اُن کے نظریات کو قبول کر کے اپنے آپ کو گرانا اور روحِ انسانی کی فطرتی آزادی کو دبانا منظور نہیں۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کو اپنے معاصرین کا احترام حاصل نہ ہو سکا۔ مَیں اگرچہ فنِ شعر میں اُن کی ہمسری کا دعوے دار نہیں ہوسکتا، تاہم مجھے فخر ہے کہ اس اعتبار سے مَیں اُن کی ہم نشینی کا حق دار ضرور ہوں۔[19]

دنیا میری پرستش نہیں کرسکتی، میری پرستش کوئی کیا کرے گا، کیونکہ میری سرشت ہی ایسی ہے کہ مَیں معبود نہیں بن سکتا۔ مجھ میں ایک پرستار کی جبلت اس قدر راسخ ہے؛ لیکن وہ خیالات، جو میری رُوح کی گہرائیوں میں ایک طوفان بپا کیے ہوئے ہیں، عوام پر ظاہر ہو جائیں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔ دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرے گی۔[20]

....

۱۸: بنام عطیہ فیضی، ۱۷/۷/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۸۹ ۱۹: ایضاً، ۱۹۰

۲۰: ایضاً، ۱۹۱

لفٹننٹ گورنر، گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری کے لیے سیکرٹری آف اسٹیٹ سے میری سفارش کرنے پر آمادہ تھے، لیکن مَیں نے اپنے میلانِ طبیعت کے خلاف اس تقرری کے لیے امیدواری سے دست برداری کا فیصلہ کرلیا ہے[۲۱]۔ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور نے مجھ سے اس طرح گفتگو کی، جیسے کوئی اپنے کلرک سے کرتا ہے، اس لیے اُس دِن سے ملازمت سے طبیعت بیزار ہوگئی اور ارادہ کرلیا کہ جہاں تک ہو سکے گا، ملازمت سے گریز کروں گا[۲۲]۔ میرے دِل میں کچھ باتیں ہیں، جنھیں مَیں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں، مگر انگریز کا نوکر رہ کر انھیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا[۲۳]۔

حالات متقاضی ہیں کہ ہر مسئلے میں مالی نقطہ نگاہ کو ملحوظ رکھوں۔ اگر چہ اسی نقطہ نگاہ کے خلاف مَیں نے چند سال قبل بغاوت برپا کررکھی تھی۔ اللہ کے بھروسے پر مَیں نے وکالت کو ہی اپنا پیشہ اختیار کیے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے[۲۴]۔

....

مجھے جرمنی بہت پسند ہے، اس نے میری آدرشوں پر بہت اثر کیا ہے اور جرمنی میں اپنا قیام کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ مَیں یہاں [ہندوستان میں] بالکل اکیلا رہتا ہوں اور خود کو بڑا غمگین پاتا ہوں۔ ہماری تقدیر ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ایک ایسی عظیم قوت ہے، جو ہماری زندگیوں کو منظم کرتی ہے۔ آہ وہ دِن! جب مَیں جرمنی میں تھا۔ بعض اوقات مَیں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں اور میرے دل میں یورپ اور بالخصوص جرمنی کو دوبارہ دیکھنے کی بڑی آرزو پیدا ہوجاتی ہے[۲۵]۔

۲۱: بنام عطیہ فیضی، ۱۷/۷/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۹۱۔ ۱۹۲
۲۲: اقبال کی صحبت میں، ۲۸
۲۳: اقبال نامہ مرتبہ حسرت، ۲۲۔ ۲۳
۲۴: بنام عطیہ فیضی، ۱۷/۷/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۹۲
۲۵: بنام ایما، ۲۰/۷/۱۹۰۹ء، اوّل، ۱۹۳

۱۹۱۰ء

مَیں اگر حیدر آباد چندے اَور ٹھہر جاتا تو مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام مجھے ضرور شرفِ باریابی بخشتے۔ مَیں وہاں کے جملہ اکابر سے ملا، اکثر نے مجھے اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ میرا سفر حیدر آباد بلا مقصد نہ تھا، خاندانِ [اکبر] حیدری سے ملاقات ہی مقصودِ سفر نہ تھا۔ مَیں ان سے اس سفر ہی میں ملا ہوں، قبل ازیں ان سے مجھے نیاز حاصل نہ تھا۔ ان کے ساتھ میرا قیام نہایت درجہ باعثِ لطف رہا۔ بیگم حیدری کا انتہائی کرم ہے کہ انھوں نے ان عنایت آمیز الفاظ میں میرا ذکر فرمایا۔ مجھے ان کے ہاں گھر کی سی آسائش میسر آئی۔ مجھے ان کا اہلِ عرب کا ساجذبہ بے حد پسند آیا اور ان تمام امور میں، جو اُن کی توجہ یا ہمدردی کا مرکز ہیں، ان کی فہم و فراست کا انتہائی مداح ہوں۔ یہ زیادہ تر حیدری صاحب اور بیگم حیدری ہی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے تھا کہ مجھے خوش قسمتی سے حیدر آباد کی معاشرت کے بعض بہترین نمائندوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ حیدری صاحب ایک ثقہ اور وسیع المشرب بزرگ ہیں۔ ان سے ملاقات سے قبل میری رائے تھی کہ وہ اعداد و شمار سے کام رکھنے والے ایک خشک طبع انسان ہوں گے، لیکن مبدءِ فیاض نے انھیں ذہنِ رسا اور دلِ گداختہ سے نوازا ہے۔ ان دونوں کے لیے میرے دل میں بے حد احترام ہے۔ ایک حقیقی گھر کا نقشہ ایک میں نے آرنلڈ صاحب [کے] ہاں دیکھا تھا اور دوسرا ان کے ہاں۔ بیگم حیدری اپنے وِجدان کی بدولت ہم مردوں کی نسبت، جن کا سرمایہ بے جان تجزیاتی استدلال ہے، بہتر معاملہ فہم ہیں[1]

میرے عنایت فرما مسٹر نذر علی بی اے، معتمد محکمہ فنانس، مجھے ایک شب ان شاندار،

۱: بنام عطیہ فیضی، ۳۰/۳/۱۹۱۰ء، اوّل، ۱۹۷-۱۹۹

مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے، جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے تھے۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دِل پر ایسا اثر کیا، جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ نظم [گورستانِ شاہی] ان ہی بے شمار تاثرات کا اظہار ہے۔ اس کو مَیں اپنے سفرِ حیدرآباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی لئیق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام سے منسوب کرتا ہوں، جنھوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیامِ حیدرآباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔[2]

آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے اور عالی جناب ہز ایکسی لینسی مہاراجا کشن پرشاد بہادُر جی سی آئی ای، یمین سلطنت، پیش کارِ وزیرِ اعظم دولتِ آصفیہ المتخلص بہ شاد کی خدمتِ بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسی لینسی کی نوازشِ کریمانہ اور وسعتِ اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا، وہ میری لوحِ دل سے کبھی نہیں مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جنابِ ممدوح نے میری روانگی حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلامِ شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔[3]

مَیں نے اتنا لمبا سفر صرف دوستوں سے ملنے کی خاطر اختیار نہیں کیا تھا، خصوصاً جب کہ میرے پاس قطعاً گنجائش نہ تھی۔[4]

شاید حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ پر، جن کے مرقدِ منور کی مَیں نے زیارت کی سعادت حاصل کی ہے، میری ایک نظم ہوگی، جو میرے آخری اشعار ہوں گے۔ اس نظم کو لکھنا مَیں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر مکمل ہوگئی تو کافی عرصے تک زندہ رہے گی۔[5]

شومیِ قسمت سے میری افتادِ طبیعت ایسی ہے کہ مَیں اپنے دلی جذبات کے اظہار و اعلان کا عادی نہیں۔ میرے تعلق خاطر میں ایک گہرائی و گرم جوشی پائی جاتی ہے، مگر دنیا یہ

۲: بنام مدیرِ مخزن، تاریخ ندارد، اوّل، ۲۰۹۔۲۱۰
۳: ایضاً، ۲۰۹
۴: بنام عطیہ فیضی، ۷/۴/۱۹۱۰ء، اوّل، ۲۰۴
۵: ایضاً، ۲۰۸

سمجھتی ہے کہ مَیں ایک بے حس انسان ہوں۔[۶]

اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کا مجھے خود اعتراف ہے، لیکن بے پروا اور ریا کاری کا کبھی مرتکب نہیں ہوا ہوں۔ مَیں تو خود اپنے لیے بھی ایک معمہ ہوں، جس کو سب جانتے ہیں، ع...... وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہوں مَیں ...... میرے طور طریقے انوکھے ہو سکتے ہیں، لیکن اس دنیا میں ایسوں کی کیا کمی ہے، جن کے اطوار مجھ سے بھی حیرت انگیز ہوں۔ موقع ہی انسان کی اصل فطرت کا امتحان ہے۔ اگر کبھی وقت آیا تو مَیں یقیناً دِکھا دوں گا کہ مجھے اپنے احباب سے کس قدر تعلق خاطر ہے اور ان کے لیے کس قدر دل سوزی مجھ میں پائی جاتی ہے۔[۷]

جب کسی عظیم ذہن سے ہمارا رابطہ قائم ہوتا ہے تو ہماری روح اپنا اکتشاف کر لیتی ہے۔ گوئٹے کے تخیل کی بیکرانی سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامنی منکشف ہوگئی۔[۸]

اگرچہ لوگ بدقسمتی سے مجھے بحیثیت شاعر ہی کے جانتے ہیں، لیکن مَیں شاعر کی حیثیت سے شہرت کا آرزومند نہیں ہوں۔ ابھی چند روز ہوئے، مجھے نیپلز سے ایک اطالوی رئیسہ کا خط آیا تھا، جس میں اس نے میری چند نظمیں مع انگریزی ترجمے کے طلب کی تھیں، لیکن شاعری کے لیے میرے دل میں کوئی ولولہ موجود نہیں۔...... ایسا محسوس کرتا ہوں، کسی نے میری شاعری کا گلا گھونٹ دیا ہے اور مَیں محرومِ تخیل کر دیا گیا ہوں۔[۹]

کل [۱۴؍مئی کی] صبح چار بجے کے قریب مَیں نے کرۂ ارض کے اس عظیم الشان زائر کو دیکھا، جو 'ہیلی کا دُم دار تارا' کہلاتا ہے۔ خلاے بسیط کا یہ پُرشکوہ شناور پچھتر برس میں ایک مرتبہ ہماری فضاے آسمانی پر نمودار ہوتا ہے۔ اب مَیں دوبارہ اس کا مشاہدہ صرف اپنے اخلاف کی آنکھوں سے کر سکوں گا۔ میری ذہنی کیفیت بالکل انوکھی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کوئی شے اپنی ناقابلِ بیان وسعتوں کے ساتھ میرے تنگناے وجود میں سما گئی ہے؛ تاہم

۶: بنام عطیہ فیضی، ۳۰؍۳؍۱۹۱۰ء، اوّل، ۱۹۹ ۷: ایضاً، ۲۰۰

۸: شذراتِ فکرِ اقبال، ۶۵ ۹: بنام عطیہ فیضی، ۷؍۴؍۱۹۱۰ء، اوّل، ۲۰۵، ۲۰۸

اس خیال نے کہ مَیں اس آوارہ مسافر کو دوبارہ نہیں دیکھ سکتا، مجھے اپنی ہیچ مقداری کی اندوہ ناک حقیقت کا احساس دِلایا۔ میرے تمام ولولے اس لمحے میں سرد پڑ گئے۔[10]

یہ بات صحیح ہے کہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد مَیں نے زیادہ تر اپنے مشاغل قانونی کی طرف توجہ رکھی ہے اور شاید مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، کیونکہ کوئی شخص، جو اپنی زندگی میں ناکام رہے، اَوروں کے کام نہیں آ سکتا، تاہم ان نامساعد حالات میں بھی جو کچھ مجھ سے ہو سکا، مَیں نے دریغ نہیں کیا۔[11]

....

اخبار الحکم قادیان مؤرخہ ۲۸؍اگست ۱۹۱۰ء کے صفحہ ۱۳؍ پر مندرجہ ذیل خبر درج ہے:

> بعد نمازِ عصر آپ کی نواسی کا نکاح ہونے والا تھا، مگر مفتی فضل الرحمٰن صاحب کی وقتی غیر حاضری کی وجہ سے بعد نمازِ مغرب پانچ سو روپیہ مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔

اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعہ خطوط استفسار کیا۔ سب حضرات کی آگاہی کے لیے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں۔ جن ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا ذکر ایڈیٹر صاحب الحکم نے کیا ہے، وہ کوئی اَور صاحب ہوں گے۔[12]

....

مَیں نے ہیگل، گوئٹے، میرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ اوّل الذکر دو نے اشیا کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی، تیسرے اور چوتھے نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور مؤخر الذکر نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا۔[13]

۱۰: شذراتِ فکرِ اقبال، ۴۷

۱۱: بنام گوہر علی خاں، ۲۲؍۸؍۱۹۱۰ء، اوّل، ۲۱۴

۱۲: بنام پیسہ اخبار، ۱۰؍۹؍۱۹۱۰ء، اوّل، ۲۱۶۔۲۱۷

۱۳: شذراتِ فکرِ اقبال، ۱۰۵

۱۹۱۱ء

میری بڑی تمنا ہے کہ جرمنی کا دوبارہ سفر کروں؛ نہیں جانتا، یہ کس دِن ممکن ہو سکے گا[1]

بد نصیبی سایے کی طرح میرے ساتھ لگی رہی ہے اور اس کی اس درجہ وفاداری کی وجہ سے مجھے اس سے اُنس ہوتا جا رہا ہے[2]

....

ایک دوست نے میری نظموں کا ایک مرتب کردہ مجموعہ بھیجا ہے۔ کاتب انھیں خوش خط لکھ رہا ہے۔ جب کتابت ختم ہو چکے گی تو نظر ثانی کروں گا۔ جو نظمیں اشاعت کے قابل سمجھی جائیں گی، انھیں دوبارہ لکھواؤں گا۔ یہ مجموعہ دلِ خوں چکاں کے نوا ہائے غم کے سوا کچھ نہیں۔ اُن میں زندہ دلی نام کو بھی نہیں، لہٰذا مَیں نے انتساب میں کہا ہے:

خندہ ہے بہر طلسم غنچہ تمہید شکست
تو تبسم سے مِری کلیوں کو نامحرم سمجھ
درد کے پانی سے ہے سرسبزیِ کشتِ سخن
فطرتِ شاعر کے آئینے میں جوہر غم سمجھ

اشاعت کے لیے انتخاب میرے لیے ایک مشکل مرحلہ ہے۔ گذشتہ پانچ سال سے میری نظمیں بیشتر نجی نوعیت کی ہو کر رہ گئی ہیں اور مَیں سمجھتا ہوں کہ پبلک کو انھیں پڑھنے کا کوئی حق نہیں۔ ان میں سے بعض تو گلّم گُھم مَیں نے تلف کر ڈالی ہیں، اس ڈر سے کہ کہیں کوئی چرا کر انھیں شائع نہ کر دے۔ بہر حال، دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کِیا جا سکتا ہے[3]

۱: بنام ایما، ۱۱/۵/۱۹۱۱ء، اوّل، ۲۲۲
۲: بنام عطیہ فیضی، ۷/۷/۱۹۱۱ء، اوّل، ۲۲۴
۳: ایضاً، ۲۲۴-۲۲۵

قبلہ والد صاحب نے فرمائش کی ہے کہ حضرت بوعلی قلندرؒ کے طرز پر ایک فارسی مثنوی لکھوں۔ اس راہ کی مشکلات کے باوجود مَیں نے کام شروع کر دیا ہے۔ تمہید کا بند:

نالہ را اندازِ نَو ایجاد کن
جرم را از ہائے و ھُو آباد کن

آتش استی بزمِ عالم بر فروز
دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز

سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز
اشکِ خونیں را جگر پرکارِ ساز

پشتِ پا بر شورشِ دنیا بزن
موجۂ بیرونِ ایں دریا بزن[۴]

لاہور ایک بڑا شہر ہے، لیکن مَیں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں، جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے:

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں کہ 'جتنا بڑا شہر ہو، اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے'، سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔[۵]

گزشتہ ماہ میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور ان ہی میں طبعِ سلیم میرے لیے شکنجے کا کام دے گئی۔[۶]

'غرّہ شوال' پر چند اشعار لکھے تھے، زمیندار اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوئے۔ مَیں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے ہیں کہ ترکی و اٹلی کی جنگ نے اُس کی تصدیق کر دی ہے۔[۷]

۴: بنام عطیہ فیضی، ۷/۷/۱۹۱۱ء، اول، ۲۲۵
۵: بنام اکبر، ۶/۱۰/۱۹۱۱ء، اول، ۲۲۷
۶: ایضاً
۷: ایضاً

مدت سے [زیارتِ مدینہ کی] یہ آرزو دِل میں پرورش پا رہی ہے، دیکھیے، کب جوان ہوتی ہے۔[8]

بنگلور اور میسور دیکھنے کا مجھے بھی اشتیاق ہے، مگر سفر طویل ہے اور میری صحت طویل سفر کی اجازت نہیں دیتی۔[9]

ترکوں کی فتح کا مژدۂ جاں فزا پہنچا، مسرت ہوئی، مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں، رُوح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ مَیں ایک زبردست تمنا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں، گو اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔ لاہور کی بستی میں کوئی ہمدمِ دیرینہ نہیں، نام و نمود پر مرنے والے بہت ہیں۔[10]

....

مہاراجا صاحب بہادر سے ملاقات ہوئی، مَیں نے انھی کے دولت خانے میں قیام کیا اور دل کو ان کے شکریوں سے مملو واپس لایا۔ ملازمت کے متعلق انھوں نے مجھ سے گفتگو کی تھی، مگر کوئی خاص بات نہ تھی، عام گفتگو تھی، جس سے مَیں اُن کا عندیہ معلوم نہ کر سکا۔ بہر حال، مجھے بے تابی نہیں۔ مقدر کا قائل جو شخص ہو، اس کی طبیعت مطمئن رہتی ہے۔ مجھ کو، جہاں ہوں، اپنے فرائضِ مفوضہ کی ادائیگی سے کام ہے: خواہ لاہور میں ہوں، خواہ لندن میں ہوں؛ کسی خاص جگہ ملازمت کرنے کی خواہش بھی دل میں پیدا نہیں کرتا، کیونکہ سراپا تن بہ تقدیر رہتا ہوں۔[11]

....

میری نظموں کے متعلق بعض ناخداترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو پان اسلام ازم کی تحریک پھیلانے والا بتایا جاتا ہے۔ مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور

۸: بنام اکبر، ۶/۱۰/۱۹۱۱ء، اوّل، ۲۲۸
۹: بنام عبدالواحد، ۲۱/۱۰/۱۹۱۱ء، اوّل، ۲۲۹
۱۰: بنام اکبر، ۹/۱۱/۱۹۱۱ء، اوّل، ۲۳۲
۱۱: بنام گرامی، ؟/؟/۱۹۱۱ء، اوّل، ۲۳۵

ہماری قوم کا ہے، وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی۔ اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے، اپنی نظموں کے ذریعے قوم کو پہنچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہش مند ہوں، جو ہمارے اسلاف میں تھی کہ باوجود دولت و امارت کے، وہ اس دارِفانی کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ مَیں جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات وغیرہ پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں۔ مَیں نے ابھی ایک شاہی قبرستان میں ایک قبر پر 'الملک للہ' کا کتبہ لکھا ہوا دیکھا، اس سے اس اسلامی جوش کا اظہار ہوتا ہے، جو دولت اور ملک کے زمانے میں مسلمانوں میں تھا۔ جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول ہو، اس کے مستقبل سے نا اُمیدی نہیں ہو سکتی اور یہی وہ پان اسلام ازم ہے، جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے اور اسی قسم کے خیالات کو مَیں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں[12]

....

ہندوؤں نے بنگال کے دو حصوں (ہندو بنگال اور مسلم بنگال) میں تقسیم کو حکومت کی طرف سے بنگالی قومیت کے قلب پر ایک ضربِ کاری سے تعبیر کیا ہے، لیکن حکومت نے دہلی کو دارالسلطنت قرار دے کر اپنے فیصلے کی خود ہی پوری ہوشیاری سے تنسیخ بھی کر دی ہے۔ بنگالی سمجھتا ہے، جیت اس کی رہی، لیکن اُسے نظر نہیں آتا کہ اس کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی گئی ہے۔ اس مسئلے سے متعلق دو شعر ہو گئے ہیں:

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن، گئی
تاجِ شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی[13]

۱۲: مقالاتِ اقبال، ۱۸۴-۱۸۵
۱۳: بنام عطیہ فیضی، ۱۴/۱۲/۱۹۱۱ء، اول، ۲۳۸

۱۹۱۲ء

جو نظم پچھلے سال لکھی تھی، وہ 'شکوہ' تھا اور اس میں خدا کی شکایت تھی اور بعض لوگوں نے اسے بُرا خیال کیا اور یہ سمجھا کہ یہ بہت بڑی جسارت ہے۔ مَیں نے بھی یہی خیال کیا، لیکن پھر بھی وہ اس قدر مقبولِ عام ہوئی کہ آج تک کئی ہزار خطوط اس کی تعریف میں میرے پاس آ چکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بات، جو لوگوں کے دِلوں میں تھی، وہ ظاہر کر دی گئی، لیکن مَیں خیال کرتا ہوں کہ میرا شکوہ خدا کو بھی پسند آیا۔ خیر، اگر وہ نہ بھی بخشے تو مَیں یہی کہوں گا:

یہ بھی رحمت ہے تری، تُو نے دیا دوزخ مجھ کو
میرے مکافات کی تو یہ بھی جگہ نہ تھی

اس لیے مَیں نے خود ایک سزا تجویز کی ہے کہ اپنی شکایت کروں، تاکہ معاوضہ ہو جائے۔ میری نظم [شمع و شاعر] ایسی جامع ہے، جس میں مشکلات کی تصویر اور ان کا حل کرنے کا نسخہ درج ہو گا۔[1]

روٹی کا دھندہ لاہور سے باہر نکلنے نہیں دیتا، عجب طرح کا قفس ہے۔[2] مَیں نے پبلک لائف بوجوہات قریباً ترک کر دی ہے۔[3]

....

اقبال، جس نے اسلامی قومیت کی حقیقت کا راز اُس وقت منکشف کیا، جب ہندوستان والے اس سے غافل تھے اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار، کامریڈ، بلقان،

۱: اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام، ۸۳-۸۴ ۲: بنام حسن نظامی، ۲۴/۶/۱۹۱۲ء، اوّل، ۲۴۰
۳: بنام سید عبدالغنی، ۲۰/۷/۱۹۱۲ء، اوّل، ۲۴۱

طرابلس اور نواب وقار الملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہے؛ کس کا خوشہ چین ہے؟ شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ اُن کا کام بُرا بھلا، جو کچھ بھی ہو، غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر بیں آنکھیں مرئیات کی طرف قدرۃً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں۔ حسن نظامی کو معلوم ہے کہ اس کا دوست اشتہار پسند مزاج لے کر دنیا میں نہیں آیا، مگر یہ مقصد ضرور ہے کہ ایک واقفِ حال دوست کی غلط فہمی دُور ہو، تا کہ اقبال کی وقعت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس خیال سے کم نہ ہو کہ اس نے مسلمانانِ ہند کی بیداری میں حصہ نہیں لیا۔[4]

....

والدہ ماجدہ کی علالت کی وجہ سے...... کئی روز سے سیالکوٹ میں مقیم ہوں اور ابھی ان کو کوئی افاقہ نہیں۔ طبیعت نہایت متفکر اور پریشان ہے۔ خط و کتابت سے بھی معذور ہوں، بلکہ ضروری مشاغل بھی بوجہ ان کی علالت، چھٹ گئے ہیں۔[5]

۴: بنام حسن نظامی، ؟/؟/۱۹۱۲ء، اول، ۳۴۸

۵: بنام اسماعیل میرٹھی، ۲/۱۱/۱۹۱۲ء، اول ۲۴۵-۲۴۶

۱۹۱۳ء

مَیں ستمبر کا قریباً کُل مہینہ لاہور سے باہر رہا۔ پہلے کانپور مسجد کے مقدمے کے لیے گیا، وہاں سے دہلی آیا اور حاذق الملک صاحب کے ہاں بغرضِ علاج مقیم رہا۔ الٰہ آباد بھی گیا، وہاں دو روز مولانا اکبر کی خدمت میں رہا۔ لاہور آ کر ابھی دم ہی لیا تھا کہ ایک مقدمے کے لیے فیروز پور جانا پڑا۔ غرض کہ یہ تمام دِن سفر میں گزرے[1]

....

مہاراجا بہادُر الور کی طرزِ گفتار سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے اپنی ملازمت میں لینے کے خواہش مند ہیں، مگر پرائیویٹ سیکرٹری کی جگہ کی تنخواہ اتنی تھی کہ مَیں اسے قبول نہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ غالباً ان پر زور ڈالا گیا ہے کہ اس جگہ کے لیے کسی ہندو کی تقرری مناسب ہے اور شاید یہ درست بھی ہو[2]

الور کی ملازمت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تنخواہ قلیل تھی۔ سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔ اگر چہ میری ذاتی ضروریات کے لیے تو اس قدر رقم کافی، بلکہ اس سے زیادہ ہے، تاہم چونکہ میرے ذِمے اَوروں کی ضروریات کا پورا کرنا بھی ہے، اس واسطے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ گھر بھر کا خرچ میرے ذمے ہے۔ بڑے بھائی جان، جنھوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا، اب پنشن پا گئے، اُن کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذِمے ہیں اور ہونے بھی چاہییں۔ خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔ تیسری بیوی کی ضرورت نہ

ا: بنام شاد، ۱/۱۰/۱۹۱۳ء، اوّل، ۲۵۳-۲۵۴ ۲: ایضاً، ۲۵۴

تھی، مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت ناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اس کے لیے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں، اسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش! دوسری بیوی کرنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا۔ یہ حالات ہیں، جو مجھے بسا اوقات مزید دوڑ دھوپ کرنے پر مائل کر دیتے ہیں۔[۳]

....

مَیں بوجہ عارضۂ دردِ گردہ ایک ہفتے تک صاحب فراش رہا۔ دو تین روز سے افاقہ ہوا ہے۔ خدا نے فضل کیا، مرض جاتا رہا، مَیں باقی رہ گیا۔[۴]

....

مَیں تو بسا اوقات قحط خریدار سے تنگ آ جاتا ہوں:

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

مَیں تو اپنا سامان، یعنی قاش ہائے دلِ صد پارہ ایسے وقت بازار میں لے کر آیا، جب سوداگروں کا قافلہ رخصت ہو چکا تھا۔ متاعِ گراں مایہ اپنے دامن میں چھپائے رکھتا ہوں۔ حالات مساعد پاؤں تو دنیا کو دِکھاؤں۔[۵]

مَیں اپنے آپ کو شاعر تصور نہیں کرتا اور نہ کبھی بحیثیت فن کے مَیں نے اس کا مطالعہ کیا ہے، پھر میرا کیا حق ہے کہ صفِ شعرا میں مَیں بیٹھوں۔[۶]

۳: بنام شاد، ۲۶/۱۰/۱۹۱۳ء، اوّل، ۲۶۰
۴: ایضاً، ۲۵۶
۵: ایضاً، ۲۶۰-۲۶۱
۶: بنام حسن نظامی، ۲۷/۱۲/۱۹۱۳ء، اوّل، ۲۷۰

۱۹۱۴ء

اگر چہ خدا کے فضل و کرم سے ایسا بے نیاز دل رکھتا ہوں کہ خود اللہ میاں بھی اس پر رشک کریں، مگر کبھی کبھی یہ دل بھی افکارِ دنیا سے عاجز آ ہی جاتا ہے اور علائق کی زنجیروں کی جھنکار بیرونی اشیا کی طرف سے اسے عارضی طور پر غافل کر دیتی ہے۔ عرفی کا ایک مصرع میرے دل اور مجھ ایسے تمام دلوں کی کیفیت کا آئینہ ہے:

در تابم از شکنجہ طبعِ سلیم خویش

آنکھ نادیدنی نظارے دیکھتی ہے، طبعِ سلیم ان کی بے ہودگی سے گھبراتی ہے، لیکن ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں کہ ان نظاروں سے اپنے آپ کو اور اہلِ دنیا کو نجات دے سکے۔ سچ فرمایا مولانا اکبر نے:

بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیے

...... مولانا اکبر کا دم بھی غنیمت ہے، خدا انھیں خوش رکھے۔ مَیں نے ان کے رنگ میں چند اشعار لکھے تھے، مگر وہ بات کہاں!

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے اُن سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
'پردہ آخر کس سے ہو، جب مرد ہی زن ہو گئے'[1]

....

ا: بنام شاد، ۷/۳/۱۹۱۴ء، اوّل، ۲۷۸، ۲۸۰

فارسی مثنوی [اَسرارِ خودی] کے اشعار ساتھ ساتھ ہو رہے ہیں۔ اس مثنوی کو مَیں اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتا ہوں۔ مَیں مر جاؤں گا، یہ زندہ رہنے والی چیز ہے۔[۲]

(مروّجہ) تصوف کو اسلام کے سادہ عقائد اور عربی رُوحِ دینی سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کا بنیادی ستم یہ ہے کہ یہ خودی کو تباہ کرتا ہے، حالانکہ خودی ایک ایسی چیز ہے، جو افراد و اقوام کی زندگی کی ضامن اور انسان کو بلند ترین مادی و روحانی مدارج پر پہنچانے کی کفیل ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی نہ صرف قائم رہے، بلکہ ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے، جو اس کے لیے مقدر ہے اور جس سے بڑا کوئی مقام انسانی تصور میں نہیں آ سکتا۔[۳]

مَیں تو اب بوجہ مشاغل منصبہ کے تارک الشعر ہوں۔ ہاں، کبھی فرصت ملتی ہے تو فارسی اساتذہ کے اشعار پڑھ کر مزہ اٹھا لیتا ہوں۔ میری شاعری گھٹ کر اب اسی قدر رہ گئی ہے کہ اَوروں کے اشعار پڑھ لوں۔ گذشتہ سال ایک مثنوی فارسی [اَسرارِ خودی] لکھنی شروع کی تھی، ہنوز ختم نہیں ہوئی اور اس کے اختتام کی امید بھی نہیں۔ خیالات کے اعتبار سے مشرقی اور مغربی لٹریچر میں یہ مثنوی بالکل نئی ہے۔[۴]

....

اگر کوئی شخص میری مذمت کرے، جس کا مقصد...... [اکبر] کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہ ہو، بلکہ خوشی ہے۔ اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا، کیونکہ شاعری سے میرا مقصد حصولِ دولت و جاہ نہیں، محض اظہارِ عقیدت ہے۔ عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں، اُن کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظِ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف

۲: بنام شاد، ۷/۳/۱۹۱۴ء، اوّل، ۲۸۰
۳: بحوالہ زندہ رُود، ۲۷۳
۴: بنام گرامی، ۱۳/۷/۱۹۱۴ء، اوّل، ۲۹۳-۲۹۴

کرے۔ مَیں نے بھی اس خیال سے چند اشعار...... [اکبر] کے رنگ میں لکھے ہیں، مگر عوام کے رجحان اور بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اَور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب وغریب نتائج پیدا کر لیے۔[۵]

....

مَیں اگست کا زیادہ حصہ شملہ میں مقیم رہا۔[۶] والدۂ مکرمہ کی ناگہانی علالت کی خبر گئی تو واپس ہوا۔ الحمد للہ کہ اب ان کو افاقہ ہے؛ مگر ان کو آرام ہوا تو بیویاں یکے بعد دیگرے بخار میں مبتلا ہو گئیں۔ پرسوں سے ان کو بھی آرام ہوا۔ اب مع الخیر سیالکوٹ سے لاہور آیا ہوں۔

کل ایک مقدمے میں پٹیالہ جاتا ہوں، وہاں سے حضرت امیر خسروؒ کے عرس پر دہلی بھی جاؤں گا اور وہاں سے...... چند دِنوں کے لیے گوالیار جاؤں گا، کیونکہ مہاراجا بہادر اقبال کی قدردانی پر مائل ہیں۔[۷]

دل تو چاہتا ہے کہ [حیدرآباد کا] سفر کروں، مگر عدالت دو ماہ کے بعد کھلی ہے۔ کام کا نقصان اور خرچِ سفر مزید۔ اس قدر بار کا متحمل نہیں ہوسکتا۔[۸]

....

امسال میرے لیے عید [الاضحیٰ] محرم کا حکم رکھتی ہے۔ والدہ مکرمہ چھ سات ماہ سے بیمار تھیں، ۹ر نومبر کو اُن کا انتقال ہو گیا۔[۹] آہ! انسان اپنی کمزوری کو چھپانے میں کس قدر طاق ہے، بے بسی کا نام صبر رکھتا ہے اور پھر اس صبر کو اپنی ہمت اور استقلال کی طرف منسوب کرتا ہے، مگر اس حادثے نے میرے دل و دِماغ میں ایک شدید تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میرے لیے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحومہ کے دم سے وابستہ تھا، اب یہ حالت ہے کہ...... 'موت کا انتظار ہے دنیا'۔ موت سب انسانوں تک پہنچتی ہے اور کبھی کبھی انسان بھی موت تک جا پہنچتا ہے۔ میرے قلب کی موجودہ کیفیت یہ ہے کہ

۵: بنام اکبر، ۱۶/۷/۱۹۱۴ء، اوّل، ۲۹۷

۶: بنام شاد، ۲۸/۸/۱۹۱۴ء، اوّل، ۲۹۸

۷: بنام شاد، ۵/۹/۱۹۱۴ء، اوّل، ۳۰۱

۸: بنام شاد، ۱۲/۱۰/۱۹۱۴ء، اوّل، ۳۰۶

۹: بنام شاد، ۱۱/۱۱/۱۹۱۴ء، اوّل، ۳۱۲

وہ تو مجھ تک پہنچتی نہیں، کسی طرح مَیں اُس تک پہنچ جاؤں[10]

کس کو اَب ہو گا وطن میں ، آہ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو مَیں یاد آؤں گا

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں وَرق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
مَیں تری خدمت کے جب قابل ہوا، تُو چل بسی

یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نُور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے[11]

[۱۶/دسمبر کو؟] والدۂ مرحومہ کا چہلم تھا، جو بخیر و خوبی ختم ہوا، ابھی لاہور پہنچا ہوں[12]

....

۱۰: بنام شاد، ۲۳/۱۱/۱۹۱۴ء، اوّل، ۳۱۳
۱۱: کلیاتِ اقبال اردو، ۲۵۷، ۲۶۵، ۲۶۶
۱۲: بنام شاد، ۲۸/۱۲/۱۹۱۴ء، اوّل، ۳۲۳

گذشتہ چھ ماہ سے دل کی حالت نہایت بے اطمینانی کی ہے، کوئی شعر نہیں لکھ سکا۔ ہاں، فارسی مثنوی ختم ہوگئی ہے۔ مطمئن ہو جاؤں تو اس کے چھپوانے کی فکر کروں۔[13]

قانونی مشاغل میں اشعار کے لیے کہاں سے وقت نکلے۔ 'دل' اور 'دماغ' دونوں کام کرنا چاہتے ہیں، مگر 'پیٹ' کا حکم ہے کہ ہماری رضا کے بغیر ایک خیال یا ایک تاثر اپنے اندر داخل نہ ہونے دو۔ عجب کش مکش کی حالت ہے، مگر شکایت نہیں۔ بہر حال، ان تعطیلوں میں چند فارسی اشعار نظم ہوگئے تھے۔[14]

اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتیِ نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے، مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔[15]

....

[اپنے قیامِ یورپ کے دَوران میں] مَیں نے اُس تہذیب کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق بعض پیش گوئیاں کی تھیں۔ میری زبان پر وہ پیش گوئیاں جاری ہو گئیں، اگرچہ مَیں خود ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ [اب] میری یہ پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔ جنگِ یورپ اہلِ یورپ کی غلطی کا نتیجہ تھی، یعنی مذہب و حکومت کی علیحدگی اور دہریانہ مادیت کا ظہور۔[16]

❁

۱۳: بنام شاد، ۲۳/۱۱/۱۹۱۴ء، اوّل، ۳۱۵
۱۴: بنام شاد، ۲۸/۱۲/۱۹۱۴ء، اوّل، ۳۲۴
۱۵: بنام شوکت علی، ؟/؟/۱۹۱۴ء، اوّل، ۳۲۹
۱۶: سفرنامۂ اقبال، ۸۲

۱۹۱۵ء

کاش! مَیں خود حیدر آباد پہنچ سکوں، مگر یہ بات اپنے بس کی نہیں۔ نہ یہاں کے حالات و مشاغل سفر کی اجازت دیتے ہیں، نہ حیدر آباد کافی زور کے ساتھ کشش کرتا ہے۔ حیدری صاحب خواہش مند ہیں کہ مَیں وہاں آؤں، مگر ان کی خواہش کو دائرۂ عمل میں لانے کے اسباب نہیں۔ مَیں خود قدرت کے ہاتھوں میں ایک بے حس ہستی کی طرح ہوں: جدھر لے جائے گی، چلا جاؤں گا؛ سعی کوشش میرے مذہب میں کفر نہیں تو گناہ ضرور ہے۔[1]

....

اردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہو جاتا ہوں، فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ کہ دل کا بخار اردو میں نکال نہیں سکتا۔[2] مثنوی، [اَسرارِ خودی] اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے کو ہے۔[3]

....

مجھے دردِ گردہ کوئی دو سال سے ہوتا ہے [اور] پانچ چھ ماہ کے بعد دَورہ ہو جاتا ہے، اب کے خلافِ توقع زیادہ عرصے کے بعد ہوا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ دَورہ رخصت ہو گیا مَیں باقی ہوں۔[4]

....

...... [بارگاہِ ایزدی] سے اقبال آج تک تو کبھی مایوس نہیں پھرا، دیکھیں، اب اس کا نخلِ دعا بار آور ہوتا ہے یا نہیں۔ عقیدہ تو یہی ہے کہ مایوس نہ پھرے گا، کیونکہ جنابِ احدیت

۱: بنام گرامی، ۱۸/۱/۱۹۱۵ء، اوّل، ۳۳۲
۲: ایضاً، ۳۳۳
۳: بنام حسن نظامی، ۶/۲/۱۹۱۵ء، اوّل، ۳۴۸
۴: بنام شاد، ۱۱/۳/۱۹۱۵ء، اوّل، ۳۴۹

کو ایک دفعہ اس کی ایک شاعرانہ بات پسند آ گئی تھی۔ استفسار فرماتے تھے کہ تُو تو گناہ اور ہر قسم کے فسق و فجور کا دل دادہ تھا، پھر تُو نے اسے ترک کیوں کر دیا، حالانکہ تو اے بھی ابھی اچھے خاصے تھے؟ بندۂ قدیم نے عرض کیا کہ شیطان کی نجات کی خاطر۔ بے چارے ابلیس کی نجات کا اَور کوئی ذریعہ نہیں، سوائے اس کے کہ کوئی انسان گناہ نہ کرے اور اس طرح وہ راندۂ درگاہ اپنے بہکانے کے کام میں ناکام ہو کر آخر کامیاب ہو جائے۔[5]

....

بخار معمولی ملیریا تھا، دو چار روز رہ کر اُتر گیا تھا۔ اب خدا کے فضل و کرم سے بالکل تندرست ہوں، البتہ لاہور کی گرمی سے سخت گھبراتا ہوں۔ جون کے مہینے میں اگر فرصت کے دو ہفتے مل گئے تو کشمیر چلا جاؤں گا۔ آج کل وہاں کا موسم نہایت دل فریب ہے۔[6]

[البتہ] پنجاب یونیورسٹی بی اے اور ایم اے کے کاغذات میرے پاس ہیں۔ آج کل امتحانوں کے دِن ہیں، اس کام کو ادھورا چھوڑ کر لاہور سے باہر نہیں نکل سکتا۔ مئی کے آخر تک اس کام سے فرصت ہو جائے گی۔[7]
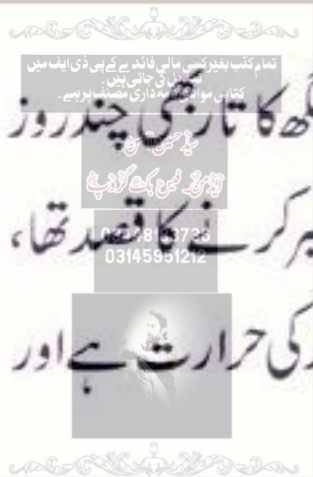
[جب ۱۹/ جون کو] یونیورسٹی کا کام تو ختم ہو گیا اور شہزادی دلیپ سنگھ کا تار بھی چند روز ہوئے، آیا کہ جلد کشمیر آؤ، مگر سردار جوگندر سنگھ، جن کی معیت میں سفرِ کشمیر کرنے کا قصد تھا، شملہ میں بیمار ہو گئے۔ اس واسطے خطہ جنت نظیر کو خیر باد کہنا پڑا۔ اب لاہور کی حرارت ہے اور مَیں۔ ستمبر میں یہاں سے نکلنا ہو تو ہو۔[8]

....

افسوس ہے کہ دیوان ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ کچھ میری عدیم الفرصتی اور کچھ یہ کہ فارسی مثنوی موسوم بہ اسرارِ خودی مکمل ہو کر پریس کے لیے لکھی جا چکی ہے، چند دِنوں میں شائع ہو جائے گی۔ اس کی اشاعت کے بعد دیوان کی طرف توجہ کروں گا۔ یہ مثنوی ایک نہایت مشکل کام تھا، الحمدللہ کہ باوجود مشاغلِ دیگر کے، مَیں اس کام کو انجام تک

۵: بنام شاد، ۱۱/۳/۱۹۱۵ء، اوّل، ۱۴۹۔ ۲۵۲

۶: بنام شاد، ۲۱/۵/۱۹۱۵ء، اوّل، ۳۷۲۔ ۳۷۵

۷: ایضاً، ۳۷۵

۸: بنام پرشاد، ۱۹/۶/۱۹۱۵ء، اوّل، ۳۸۱۔ ۳۸۲

پہنچا سکا۔[۹]

مثنوی کا دیباچہ کسی قدر پیامات کے سمجھنے میں ممد ہوگا۔ لفظ 'خودی' کی بھی تشریح ہے:[۱۰]

[یعنی] یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ، جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پُراسرار شے، جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ 'خودی' یا 'انا' یا 'مَیں'، جو اپنے عمل کی رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے، مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟...... مَیں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ اس نظم [اَسرارِ خودی] کی تفسیر مقصود نہیں، محض ان لوگوں کو نشانِ راہ بتانا مقصود ہے، جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت کی دقتوں سے آشنا نہیں۔ ......شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دِلانے کا کہ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔ ہاں، لفظ 'خودی' اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعین ذات ہے۔ مرکب لفظ بےخودی میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔[۱۱]

....

مَیں بوجہ علالت کبھی [ٹرسٹی شپ علی گڑھ مسلم کالج کے] اجلاس میں حاضر نہیں ہو سکا اور نہ دیگر فرائض کو ادا کر سکا ہوں، جو ٹرسٹی شپ سے متعلق ہیں، ان حالات میں پنجاب سے

۹: بنام شاکر صدیقی، ۲۲/۶/۱۹۱۵ء، اوّل، ۳۸۷ ۱۰: بنام شاکر صدیقی، ۶/۷/۱۹۱۵ء، اوّل، ۳۸۸

۱۱: دیباچۂ اسرارِ خودی، ۱۹۱۵ء

کسی مفید آدمی کا انتخاب کرنا اچھا ہوگا۔[12]

مَیں [۳۰ راگست کے دِن اگر چہ] خدا کے فضل وکرم سے اچھا ہوں، مگر بیوی تین ماہ سے بیمار ہیں۔[13]

میرے کان وحدت الوجود کا مراقبہ رکھتے ہیں، اس واسطے جہاں کہیں کوئی آواز ہو، میرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ غرض یہ کہ اسباب نہایت عمدگی سے جمع ہو رہے ہیں اور ان کے مجموعی اثر کے ظہور کا وقت بھی قریب ہے۔[14] بہر حال، جس حال میں ہوں، خوش ہوں۔ مقدر سے زیادہ اور وقت سے پہلے نہیں مانگتا۔ وقت خود بخود مساعدت کرے گا اور مشیّتِ تقدیر میں جو جو کچھ پوشیدہ ہے، اسے آشکارا کر دے گا۔ انتظار میں بھی ایک لطف ہے۔[15]

اگر لٹریری مشاغل اس ملک میں بطور ایک پیشے کے اختیار کیے جا سکتے تو مَیں اپنے موجودہ کاروبار کو بمع [مع] اس کی تمام دلچسپیوں اور امیدوں کے خیر باد کہہ دیتا۔ بہر حال، جو کچھ اللہ کو منظور۔[16]

....

یہ مثنوی [اَسرارِ خودی] گذشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی، مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دِنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔[17] دوسرا حصہ [رموزِ بے خودی] اِن شاء اللہ باعتبارِ معانی کے اس سے لطیف تر ہوگا،[18] کم از کم مطالب کے اعتبار سے۔ گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے مَیں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا، یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے، جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔[19] خدا فرصت دے تو اسے بھی پورا کر دوں۔ گو ہجومِ مشاغلِ سفلی میں امید کی کمر شکستہ ہے، تاہم جو کچھ بھی ہو سکے گا، کروں

۱۲: بنام محمد اسحاق خاں، ۱۹/۸/۱۹۱۵ء، اوّل، ۳۹۷
۱۳: بنام شاد، ۳۰/۸/۱۹۱۵ء، اوّل، ۴۰۰
۱۴: ایضاً
۱۵: بنام شاد، ۳۰/۹/۱۹۱۵ء، اوّل، ۴۱۲
۱۶: ایضاً، ۴۱۱
۱۷: بنام سراج الدین، ۴/۱۰/۱۹۱۵ء، اوّل، ۴۱۵
۱۸: بنام شاد، ۳۰/۹/۱۹۱۵ء، اوّل، ۴۱۱
۱۹: بنام سراج الدین، ۴/۱۰/۱۹۱۵ء، اوّل، ۴۱۵

گا۔ خیالات عجیب و غریب دل میں دَورہ کرتے رہتے ہیں۔[20]

[دراصل] ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں، ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں، جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ اِن شاء اللہ دوسرے حصے میں دِکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابہ کرامؓ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے، جس کا تصوف حامی ہے۔[21]

واعظِ قرآن بننے کی اہلیت تو مجھ میں نہیں ہے؛ ہاں، اس مطالعے سے اپنا اطمینان (خاطر) روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے؛ گو عملی حالت کے اعتبار سے بہت سست عنصر واقع ہوا ہوں[22] [اور] 'مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے'، یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے کے لیے یہی خیال محرک ہوا۔ مَیں گذشتہ دس سال سے اسی پیچ و تاب میں ہوں۔[23]

یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں ہے۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکرِ مناصب کے سوا اَور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علما کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر خدا تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیہ کی دُکانیں ہیں، مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔ کئی صدیوں سے علما اور صوفیہ میں طاقت کے لیے جنگ رہی، جس میں آخر کار صوفیہ غالب آ گئے، یہاں تک کہ اب برائے نام علما جو باقی ہیں، وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں، ہر دل عزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روِش گویا علما کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیا کی کوشش کی، مگر

۲۰: بنام شاد، ۱۹۱۵/۹/۳۰ء، اوّل، ۴۱۱
۲۱: بنام سراج الدین، ۱۹۱۵/۱۰/۴ء، اوّل ۴۱۵
۲۲: بنام اکبر، ۱۹۱۵/۱۰/۱۸ء، اوّل، ۴۱۷
۲۳: ایضاً، ۴۱۷-۴۱۸

صوفیہ کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسا ہے۔ مَیں بھلا کیا کر سکتا ہوں، صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں، قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں، یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان، جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے، جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔[۲۴]

....

میری بیوی کی طبیعت ناساز ہے اور ان کی مسلسل تیمارداری کی ضرورت ہے۔[۲۵]

میری [اپنی] صحت [بھی] عام طور پر اچھی نہیں رہتی، کوئی نہ کوئی شکایت دامن گیر رہتی ہے۔ دوا پر مجھے چنداں اعتبار نہیں، ورزش سے گریز ہے، اس واسطے یہ فیصلہ کر بیٹھا ہوں کہ چلو، اگر مقررہ وقت سے کچھ عرصہ پہلے رخصت ہو گئے تو کیا مضائقہ ہے۔ میرے دوست ڈاکٹر ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ ورزش وغیرہ سے عمر میں اضافہ ہوگا، مگر میرا جواب یہی ہوتا ہے کہ دس سال پہلے کیا اور پیچھے کیا، آخر رخصت ہونا ہے تو کیوں دوا اور ورزش کا دردِ سر خریدا جائے۔[۲۶]

...... [شاد] نے جو نسخہ میرے لیے تجویز فرمایا ہے، ضرور مفید ہوگا، کیونکہ مجرب ہے اور مجھے اس کے استعمال کی خواہش بھی بہت ہے، مگر نری خواہش سے کام نہیں چلتا، استعمال کے وسائل ضروری ہیں اور وہ مفقود، ورنہ یہ تو وہ چیز ہے کہ...... خمارِ بے حدِ من بحر ہا ہمی طلبد۔ ایک مطربہ پنجاب میں رہتی ہے، مَیں نے اسے کبھی دیکھا نہیں، مگر سنا جاتا ہے کہ حسن میں لاجواب ہے اور اپنے گذشتہ اعمال سے تائب ہو کر پردہ نشینی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ چند روز ہوئے، اس کا خط مجھے موصول ہوا کہ مجھ سے نکاح کر لو، تمھاری نظم کی وجہ سے تم سے غائبانہ پیار رکھتی ہوں اور میری توجہ کو ٹھکانے لگا دو۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس کارِ خیر میں حصہ لوں، مگر کمر میں طاقت ہی نری کافی نہیں، اس کے لیے دیگر وسائل بھی ضروری ہیں۔ مجبوراً مہذبانہ انکار کرنا پڑا۔ نسخہ مجھے دل سے پسند ہے، مگر اس کو کسی اَور وقت پر استعمال میں

۲۴: بنام اکبر، ۱۹۱۵/۱۰/۲۵ء، اوّل، ۴۲۱-۴۲۲ ۲۵: بنام شیخ عبدالعزیز، ۱۹۱۵/۱۰/۱۹ء، اوّل، ۴۲۰

۲۶: بنام شاد، ۱۹۱۵/۱۲/۳۰ء، اوّل، ۴۴۲

لاؤں گا، جب حالات زیادہ مساعد ہوں گے۔[۲۷]

لندن میں ایک انگریز نے مجھ سے پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟ مَیں نے کہا، 'ہاں، تیسرا حصہ مسلمان ہوں'۔ وہ حیران ہو کر بولے، 'کس طرح؟' مَیں نے عرض کی کہ رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں، 'مجھے تمھاری دنیا سے تین چیزیں پسند ہیں: نماز، خوشبو اور عورت'۔ مجھے ان تینوں میں سے صرف ایک پسند ہے۔ مگر اس تخیل کی داد دینی چاہیے کہ نبی کریمؐ نے عورت کا ذکر دو لطیف ترین چیزوں کے ساتھ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت نظامِ عالم کی خوشبو ہے اور قلب کی نماز۔[۲۸]

....

میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اَور بھی قوی ہو گیا تھا، کیونکہ فلسفہ یورپ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رُخ کرتا ہے، مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخِ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور مَیں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوف ناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔[۲۹]

اگر مَیں اپنے مذہب کو بیان کروں تو یہ ہو گا کہ شانِ عبدیت انتہائی کمال رُوحِ انسانی کا ہے، اس سے آگے اَور کوئی مرتبہ یا مقام نہیں یا محی الدین ابنِ عربی کے الفاظ میں 'عدم محض' ہے یا بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ 'حالت سکر' منشاے اسلام اور قوانینِ حیات کے مخالف ہے اور 'حالتِ صحو'، جس کا دوسرا نام اسلام ہے، قوانینِ حیات کے عین مطابق ہے اور رسولِ اکرمؐ کا منشا یہ تھا کہ ایسے آدمی پیدا ہوں، جن کی مستقل حالت کیفیتِ صحو ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریمؐ کے صحابہؓ میں صدیق و عمر تو بکثرت ملے، مگر حافظ شیرازی کوئی نظر نہیں آتا۔[۳۰]

مَیں شیخ [ابنِ عربی] کی عظمت و فضیلت کا قائل ہوں اور ان کو اسلام کے بہت بڑے

۲۷: بنام شاد، ۱۹۱۵/۱۲/۳۰ء، اوّل، ۴۴۲۔ ۴۴۴   ۲۸: ایضاً، ۴۴۳

۲۹: بنام حسن نظامی، ۱۹۱۵/۱۲/۳۰ء، اوّل، ۴۴۸۔۴۴۹   ۳۰: ایضاً، ۴۵۱۔ ۴۵۲

حکما میں سمجھتا ہوں۔ مجھ کو ان کے اسلام میں کوئی شک نہیں، کیونکہ جو عقائد (مسئلہ قدم ارواح و مسئلہ وحدت الوجود) ان کے ہیں، ان کو انھوں نے فلسفہ کی بنا پر نہیں مانا، بلکہ نیک نیتی سے قرآن کی آیات سے استنباط کیا ہے۔ پس ان کے عقائد صحیح ہوں یا غلط، قرآن کی تاویل پر مبنی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو تاویل ان کی ہے، وہ منطقی یا منقولی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط۔ میرے نزدیک ان کی تعبیر یا تاویل جو کچھ ہے، صحیح نہیں ہے، اس واسطے گو مَیں ان کو ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں، مگر ان کے عقائد کا پیرو نہیں ہوں۔[۳۱]

۳۱: بنام حسن نظامی، ۱۹۱۵/۱۲/۳۰ء، اوّل، ۴۵۲۔ ۴۵۳

۱۹۱۶ء

کئی دفعہ ارادہ کرتا ہوں کہ پنجاب سے چند روز کے لیے نکل کر دکن کی سیر کروں، لیکن دُکانداری کی زنجیریں پاؤں میں ہیں۔ دو چار روز کے لیے باہر نکلنے میں بھی اندیشہ ہے تو کجا پندرہ روز، بیس روز یا مہینا! لیکن افوضُ اَمرِی اِلی اللّٰہ[۴۰:۴۴]، اسے منظور ہے تو سب کچھ ہو جائے گا، انی معکم من المنتظرین[۷:۱۷] [۱]

....

اکثر احباب نے اس امر کی شکایت کی ہے کہ اقبال نے [اَسرارِ خودی میں] تصوف کی مخالفت کی ہے اور بہت سے استفسار میرے پاس پہنچے ہیں۔ مجھے اس امر کی شکایت ہے کہ اِس وقت بہت کم لوگ ہندوستان میں ہیں، جنھوں نے اسلامی لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں عجیب و غریب قسم کی عقلی اور مذہبی تحریکوں کا نشان ملتا ہے اور یہ بات کچھ اسلامی تہذیب سے خاص نہیں، بلکہ دنیا کی ہر تہذیب کی تاریخ میں ایسی تحریکیں پیدا ہوا کرتی ہیں اور مرورِ زمانہ میں ان تحریکوں میں ایسے عناصر کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے، جو اس تہذیب کی خاص روایات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔...... اگر وقت نے مساعدت کی تو مَیں تحریک تصوف کی مفصل تاریخ لکھوں گا، اِن شاء اللہ۔ ایسا کرنا تصوف پر حملہ نہیں، بلکہ تصوف کی خیر خواہی ہے، کیونکہ میرا مقصد یہ دِکھانا ہوگا کہ اس تحریک میں غیر اسلامی عناصر کون کون سے ہیں اور اسلامی عناصر کون کون سے۔ یہ تحریک غیر اسلامی عناصر سے خالی نہیں اور مَیں اگر مخالف ہوں تو صرف ایک گروہ کا، جس نے محمد عربیؐ کے نام

۱: بنام شاد، ۵/۱/۱۹۱۶ء، اوّل، ۴۵۸

پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے، جو مذہبِ اسلام سے تعلق نہیں رکھتے۔ حضراتِ صوفیہ میں جو گروہ رسول اللہؐ کی راہ پر قائم ہے اور سیرتِ صدیقی کو اپنے سامنے رکھتا ہے، مَیں اس گروہ کا خاکِ پا ہوں اور ان کی محبت کو سعادتِ دارین کا باعث تصور کرتا ہوں۔

مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ مَیں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا، جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآنِ شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے، مثلاً شیخ محی الدین ابنِ عربی کا مسئلہ قدم ارواح کملا، مسئلہ وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلاتِ ستہ یا دیگر مسائل، جن میں بعض کا ذکر عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب انسان کامل میں کیا۔ مذکورہ تینوں مسائل میرے نزدیک مذہبِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ گو مَیں ان کے ماننے والوں کو کافر نہیں کہہ سکتا، کیونکہ انھوں نے نیک نیتی سے ان مسائل کا استنباط قرآنِ شریف سے کیا ہے۔

فلسفیانہ اور مؤرخانہ اعتبار سے مجھے بعض ایسے مسائل سے اختلاف ہے، جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں، مگر جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے۔ تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے۔ کوئی مسلمان ہے، جو اُن لوگوں کو بُرا سمجھے، جن کا منصب العین محبت رسول اللہ ہے اور اس ذریعے سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر مَیں تمام صوفیہ کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا۔ دوسری بات، خواجہ شیرازی کے متعلق ہے۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ خواجہ شیراز محض ایک شاعر ہیں اور ان کے کلام سے جو صوفیانہ حقائق اخذ کیے گئے ہیں، وہ بعد کے لوگوں کا کام ہے، مگر چونکہ عام طور پر ان کو صوفی اور مجذوبِ کامل سمجھا گیا ہے، اس واسطے مَیں نے ان کی تنقید ہر دو اعتبار سے کی ہے، یعنی بحیثیت صوفی اور بحیثیت شاعر۔ بحیثیت صوفی ہونے کے ان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں (بذریعہ اپنے اشعار کے) وہ حالت و کشف پیدا کریں،

جس کو تصوف کی اصطلاح میں حالتِ سکر کہتے ہیں۔ ان کے صوفی شارحین نے صہبا و شراب وغیرہ سے یہی مراد لی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا سکر کی حالت اسلامی تعلیم کا منشا ہے۔ رسول اللہؐ اور صحابہؓ کی زندگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک مسلمان قلب کی مستقل کیفیت بیدار ہے نہ خواب یا سکر۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں تو کوئی مجذوب نظر نہیں آتا، بلکہ ابتدائی اسلامی لٹریچر میں مجذوب کی اصطلاح بھی مثل دیگر اصطلاحاتِ صوفیہ کے نہیں ملتی۔ دوسرا سوال، جو حالت سکر کے متعلق پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ آیا یہ حالت زندگی کے اغراض سے منافی ہے یا ممد۔ علمِ الٰہیات کے اعتبار سے یہ حالت زندگی کے لیے نہایت ہی مضر ہے اور جو لوگ اس حالت کو مستقل بنا لیتے ہیں، وہ کشمکش حیات کے بالکل قابل نہیں رہتے اور ملّی اور قومی اعتبار سے بھی اس کے مضر ہونے کی مثالیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مَیں نے حافظ کو رنڈی باز، شراب خور لکھا ہے، وہ سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ مجھ کو ان کی پرائیویٹ زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھ کو صرف اس نصب العین کی تنقید کرنا مقصود ہے، جو بحیثیت ایک صوفی شاعر ہونے کے ان کے پیش نظر ہے اور میری تنقید میں بیشتر الفاظ و اصطلاحات انھی کے دیوان سے لیے گئے ہیں۔[2]

خواجہ حسن نظامی نے عام طور پر اخباروں میں میری نسبت یہ مشہور کر دیا ہے کہ مَیں صوفیہ کرام سے بدظن ہوں۔ چونکہ مَیں نے خواجہ حافظ پر اعتراض کیا ہے، اس واسطے ان کا خیال ہے، مَیں تحریکِ تصوف کو دنیا سے مٹانا چاہتا ہوں۔ 'سرِ اَسرارِ خودی' کے عنوان سے انھوں نے ایک مضمون خطیب میں لکھا ہے۔ تاریخِ تصوف سے فارغ ہولوں تو تقویۃ الایمان کی طرف توجہ کروں گا۔ فی الحال جو فرصت ملتی ہے، وہ اسی مضمون کی نذر ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ ضروری کتب لاہور کے کتب خانوں میں نہیں ملتیں۔ جہاں تک ہو سکا، مَیں نے تلاش کی ہے۔ فی الحال مثنوی کا دوسرا حصہ [رموزِ بے خودی] بھی ملتوی ہے۔[3]

مَیں تصوفِ اسلامیہ کی تاریخ پر ایک مفصل مضمون لکھ رہا ہوں، جو عنقریب علامہ

۲: مقالاتِ اقبال، ۲۰۰-۲۰۲، ۲۰۴-۲۰۵، ۲۰۷ ۳: بنام اکبر، ۲/۴/۱۹۱۶ء، اول، ۲۶۶-۲۶۸

ابنِ جوزی کی کتاب تلبیس ابلیس کے اس حصے کے ساتھ شائع ہوگا، جو انھوں نے وحدت الوجود کے رَد میں لکھا ہے۔ اُس مضمون سے معلوم ہو جائے گا کہ وحدت الوجود کیا چیز ہے، اسلام میں یہ تحریک کس طرح پیدا ہوئی اور جن لوگوں کو صوفیہ کا امام سمجھا جاتا ہے، انھوں نے اسلامی تاریخ اور تفسیر قرآن میں کس قدر بے پروائی سے کام لیا ہے۔

رہبانیت دنیا کی ہر مستعد قوم میں اس کے عملی زوال کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مٹانا ناممکن ہے کہ بعض رہبانیت پسند طبائع ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں، وہ صرف اس قدر ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کریں اور اس کو رہبانیت کے زہریلے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ ہم وحدت الوجودیوں کو مسلمان بنانا نہیں چاہتے، بلکہ مسلمانوں کو ان کے تخیلات کے دام سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم حق پر ہیں تو خدا ہماری حمایت کرے گا اور اگر ہم ناحق پر ہیں تو ہم فنا ہو جائیں گے۔ ابنِ تیمیہ، ابنِ جوزی، زمخشری اور ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت عالمگیر غازی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی نے یہی کام کیا ہے اور ہمارا مقصد صرف اس سلسلے کو جاری رکھنے کا ہے، اَور کچھ نہیں۔

مولانا اکبر (الٰہ آبادی) کے مصرعے...... 'خودی خدا سے جھکے، بس یہی تصوف ہے'، میرا عین مذہب ہے اور میرے نزدیک میری مثنوی اسی مصرعے کی ایک تفسیر ہے۔ مولانا اکبر، جن کا یہ مصرع ہے، کون ہیں؟ یہ وہی مولانا اکبر ہیں، جن کا یہ شعر ہے:

ان میں باقی ہے کہاں خالدِ جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یہ وہی مولانا اکبر ہیں، جو اس مثنوی کے اشعار اور اس کے دینی مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ایک پرائیویٹ خط میں ارشاد فرماتے ہیں کہ 'آپ کا مطمحِ نظر جو امر ہے، اگر مَیں اس کی قدر نہ کروں تو مسلمان نہیں'۔ میرے اور آپ کے لیے اس خضرِ ظلمات کا ارشاد کافی ہے۔[۴]

۴: مقالاتِ اقبال، ۲۱۱-۲۱۲، ۲۱۹، ۲۲۱-۲۲۲

مَیں والدِ مکرم کی علالت کی وجہ سے پریشان رہا۔[۵]

....

کیا کروں، پا بہ زنجیر ہوں؛ چند روز کے لیے بھی لاہور چھوڑنا محال ہے۔ کسی وقت اسی قسم کے موانع کی وجہ سے اتنا گھبراتا ہوں کہ بے اختیار موجودہ پیشے کی قیود کو توڑ تاڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں، مگر وہی مثال ہے...... چہ خورد بامداد فرزندم...... مگر جس حال میں ہوں، شکرگزار ہوں۔ شکایت میرے مذہب میں کفر، بلکہ شرک ہے۔[۶]

....

اَسرارِ خودی ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے، مگر قسم ہے خداے واحد کی، جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، مَیں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی، بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور مَیں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا، میری رُوح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد ہی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی، کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو، خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے، مگر......

من صداے شاعرِ فرداستم

نا امیدستم زیارانِ قدیم　　　　طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نہ حسن نظامی رہے گا، نہ اقبال؛ یہ بیج، جو مُردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بارآور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے، الحمدللہ۔[۷]

۵: بنام شاد، ۳/۴/۱۹۱۶ء، اوّل، ۴۸۵

۶: بنام شاد، ۱۴/۴/۱۹۱۶ء، اوّل، ۴۸۷

۷: ایضاً، ۴۸۷-۴۹۱

لاہور میں گرمی کا زور ہے اور اس پر [کلکتہ کی مغنیہ] مس گوہر جان کا نغمہ جگر سوز فضائے لاہور کی حدت پر مستزاد ہے۔[8]

....

[مَیں 'علمِ ظاہر و علمِ باطن' کے بعد] ایک اَور مضمون لکھ رہا ہوں، جو بالکل نرالا ہے۔ غالباً آج تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا۔ جن علما نے تصوفِ وجودیہ کی مخالفت کی ہے، ان کی توجہ کبھی اس طرف نہیں ہوئی۔ کتابیں نہیں ملتیں، بڑی دِقت ہے۔ شیخ روزبہان بقلی کی شرحِ شطحیات ایک عجیب و غریب کتاب ہے۔ اس میں، صوفیۂ وجودیہ نے جو خلافِ شرع باتیں کہی ہیں، ان کی شرح ہے۔ اگر یہ رسالہ ہاتھ آجائے تو تصوف کے بہت سے مسائل پر اس سے روشنی پڑے گی، مگر باوجود تلاش کے، نہیں دستیاب ہو سکا۔ سنا ہے کہ لاہرہ (اودھ) میں ایک سجادہ ہے، یہاں کوئی بزرگ قلندر صاحب گزرے ہیں، جنھوں نے محی الدین ابنِ عربی کی فتوحات کی تردید میں ایک مبسوط کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے، جو اَب تک ان کے جانشینوں کے پاس محفوظ ہے۔ مَیں نے موجودہ سجادہ نشین کی خدمت میں خط لکھوایا ہے۔[9]

....

لاہور میں بارش مطلق نہیں ہوئی، لوگ تڑپ رہے ہیں۔ تین روزے رکھے تھے کہ دردِ گردہ کے دَورے کی ابتدا محسوس ہوئی۔ دو روز سے روزے سے بھی محروم ہوں۔[10]

....

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے، مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاطِ ملّی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادُو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے، جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اِس وقت

۸: بنام شاد، ۲۸/۵/۱۹۱۶ء، اوّل، ۵۰۰ ۹: بنام خان نیاز، ۸/۷/۱۹۱۶ء، اوّل، ۵۱۱

۱۰: ایضاً، ۵۱۱-۵۱۲

مسلمانوں کا ہے، مگر ہمیں اپنے ادائے فرض سے کام ہے۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ مَیں مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس حصے میں بعض باتوں پر مزید روشنی پڑے گی۔[۱۱]

ایک اَور مضمون بھی لکھ رہا ہوں، جو وکیل میں شائع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسی جماعت پیدا کر دے، جو اسلام کے نادان دوستوں کی پیدا کی ہوئی آمیزشوں کے خلاف جہاد کرے۔[۱۲]

میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے، اسی واسطے مَیں نے ان کے خلاف لکھا ہے۔ مجھے امید تھی [خدشہ تھا؟] کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے، لیکن میرا ایمان گوارا نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں۔ شاعری میرے لیے ذریعہ معاش نہیں کہ مَیں لوگوں کے اعتراضات سے ڈروں۔[۱۳]

....

میرا ارادہ تو شملہ جانے کا تھا، نواب ذوالفقار علی خاں صاحب سے وعدہ تھا اور اُن کے خطوط بھی آرہے تھے، مگر بھائی صاحب نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ اگست کا سارا مہینا سیالکوٹ میں قیام کرو، سومَیں بمع [مع؟] اہل [و] عیال کے ۲۹/اگست تک وہاں رہا۔ وہاں سے ستمبر شروع ہونے سے پہلے اس واسطے آگیا کہ اگر مولوی احمد دین وکیل ہمراہ ہو گئے تو ستمبر کا مہینا کشمیر میں بسر کروں گا، مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے کشمیر چلے گئے ہیں۔ کل منشی سراج الدین، میر منشی ریزیڈنسی کا خط آیا ہے کہ چند روز کے لیے چلے آؤ اور نیز یہ کہ چودھری شہاب الدین کو تار دیا ہے کہ وہ تم کو ہمراہ لے کر جلد آئیں۔ چودھری صاحب غالباً ڈلہوزی میں ہیں، مَیں اُن کے انتظار میں ہوں کہ وہ آئیں تو مَیں اُن کے ہمراہ چند روز وہیں بسر کر آؤں۔[۱۴]

....

۱۱: بنام سراج الدین، ۱۰/۷/۱۹۱۶ء، اوّل، ۵۱۲
۱۲: ایضاً، ۵۱۴
۱۳: بنام فصیح اللہ، ۱۴/۷/۱۹۱۶ء، اوّل، ۵۱۸
۱۴: بنام خان نیاز، ۱۱/۹/۱۹۱۶ء، اوّل، ۵۲۹

افسوس ہے کہ اگست کے مہینے میں تصوف کی تاریخ پر کچھ نہیں لکھ سکا، البتہ مثنوی کے دوسرے حصے کے بہت سے اشعار لکھے گئے، یعنی آدھی مثنوی لکھی گئی۔ کیا عجب کہ باقی بھی جلد تمام ہو جائے اور دوسرے حصے کی اشاعت بھی جلد ہو جائے۔ پہلے حصے کی دوسری ایڈیشن کا کاغذ کل خرید کیا ہے۔[15]

....

لاہور کورٹ میں تعطیل تھی، کچہری بند تھی اور مَیں چاہتا تھا کہ کسی جگہ، جہاں لوگ میرے جاننے والے نہ ہوں، چلا جاؤں اور تھوڑے دِنوں کے لیے آرام کروں۔ پہاڑ جانے کے لیے سامان موجود تھا، مگر صرف اس قدر کہ تنہا جا سکوں۔ تنہا جا کر ایک پُر فضا مقام میں آرام کرنا اور اہل و عیال کو گرمی میں چھوڑ جانا بعید از مروّت معلوم ہوا، اس واسطے ایک گاؤں چلا گیا، جہاں ویسی ہی گرمی تھی، جیسی لاہور میں، مگر آدمیوں کی آمد و رفت نہ تھی۔ اس تنہائی میں مثنوی اسرارِ خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے، جس کا نام ہوگا 'اقلیم خاموشاں'۔ یہ نظم اردو میں ہوگی اور اس کا مقصود یہ دِکھانا ہوگا کہ مردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں، ان کے عام حالات و جذبات و خیالات کیا ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ دو باتیں میری تنہائی کی کائنات ہیں۔[16]

....

سردی آ رہی ہے۔ صبح چار بجے، کبھی تین بجے اُٹھتا ہوں، پھر اس کے بعد نہیں سوتا، سوائے اس کے کہ مصلّٰی پر کبھی اونگھ جاؤں۔ یہ موسم نہایت خوش گوار ہے۔[17]

۱۵: بنام خان نیاز، ۱۱/۹/۱۹۱۶ء، اوّل، ۵۲۹-۵۳۲ ۱۶: بنام شاد، ۱/۱۰/۱۹۱۶ء، اوّل، ۵۳۳
۱۷: بنام شاد، ۳۱/۱۰/۱۹۱۶ء، اوّل ۵۳۴

۱۹۱۷ء

آئینہ دل گردِ غرض سے پاک ہے، اقبال کا شعار ہمیشہ سے محبت و خلوص کا رہا ہے اور اِن شاءاللہ رہے گا[۱] تین چار ماہ ہوئے کہ ارادہ مصمم سفر حیدرآباد کا کر لیا تھا، مگر استخارہ کیا تو اجازت نہ ملی، خاموش رہا[۲]

....

مثنوی اسرارِ خودی کے دوسرے حصے کا قریب پانچ سو شعر لکھا گیا ہے، مگر باتف کبھی کبھی دو چار ہوتے ہیں اور مجھے فرصت کم ہے، امید کہ رفتہ رفتہ ہو جائیں گے[۳] کل [۷ فروری کو] کچھ فرصت مل گئی تھی، فقہ کا وہ مسئلہ نظم کیا، جس کے رُو سے مسلمانوں پر اُس دشمن پر حملہ کرنا حرام ہے، جو صلح کی امید میں اپنے حصار وغیرہ گرا دے۔ اس مسئلے کا ذکر کر کے اس کی حقیقت اور فلسفہ لکھا ہے کہ شرع نے کیوں ایسا حکم دیا ہے؟ عجیب عجیب باتیں ذہن میں آتی ہیں، مگر قلب کو یکسوئی میسر نہیں[۴] اس مسئلے اور اس کے مفہوم کو مَیں نے مندرجہ ذیل اشعار میں نظم کیا ہے:

روز ہیجا لشکرِ اعدا اگر از خیالِ صلح گردد بے خطر
گیرد آسان روزگار خویش را بشکند حصن و حصار خویش را
تا نہ گیرد باز کار او نظام ہست یورش بر دیار او حرام
سرِ این فرمان حق دانی کہ چیست؟ زیستن اندر خطر ہا زندگی ست!

۱: بنام شاد، ۵/۱/۱۹۱۷ء، اول، ۵۴۸
۲: ایضاً
۳: بنام الف دین، ۹/۱/۱۹۱۷ء، اول، ۵۵۲
۴: بنام خان نیاز، ۷/۲/۱۹۱۷ء، اول، ۵۵۶-۵۵۷

شرع می خواہد کہ اندر صلح و جنگ — شعلہ باشی واشگافی کام سنگ
آزماید قوتِ بازوے تو — می نہد الوند پیش روے تو
باز گوید سرمہ ساز الوند را — از تف خنجر گداز الوند را
از تن آسائی بہ میرد زندگی — قوت از پیکار گیرد زندگی[5]

آج کل حضرت حسینؓ کے واقعہ شہادت کا تاریخی مفہوم نظم کر رہا ہوں، اس میں ضمناً چند شعر عقل اور عشق پر ہیں:

عقل سفاک است و اُو سفاک تر — پاک تر، چالاک تر، بے باک تر
عقل در پیچاکِ اسباب و علل — عشق چوگان باز میدانِ عمل
عقل را سرمایہ از بیم و شک است — عشق از عزم و یقین لاینفک است
آن کند تعمیر تا ویران کند — این کند ویران کہ آبادان کند[6]

....

حیدر آباد ہائی کورٹ میں ایک ججی خالی ہوئی ہے، یعنی سید ہاشم بلگرامی انتقال کر گئے۔ پنجاب کے ایک اخبار [میونسپل گزٹ کے مدیر منشی دین محمد] نے میرا نام اس جگہ کے لیے تجویز کیا ہے۔ کئی لوگوں نے مجھ سے پوچھا ہے، لیکن مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔ عرصہ ہوا، حیدری صاحب سے خط و کتابت بھی نہیں ہوئی۔[7]

اخباروں میں جو کچھ لکھا گیا، اس کا مجھے کوئی علم نہیں اور نہ حیدر آباد کے حالات سے واقفیت ہے۔ آخر وہاں بھی تو اس عہدے کے امیدوار ہوں گے اور وہاں کی گورنمنٹ حیدر آبادیوں کو چھوڑ کر ایک غیر ملکی کو کیوں ترجیح دینے لگی۔ جس اخبار میں میرے متعلق مضمون لکھا گیا تھا، اس کی کاپیاں حیدر آباد کے بعض امرا کے نام بھیجی گئی ہیں، اَور اخبار بھی لکھ رہے ہیں۔ حیدری صاحب کمزور آدمی ہیں، اگر وہ کوشش کریں تو ممکن ہے، مگر اس معاملے میں میرا لکھنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔[8]

۵: بنام گرامی، ۲/۸/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۵۸-۵۵۹
۶: بنام گرامی، ۲/۱۹/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۶۵-۵۶۶
۷: بنام گرامی، ۲/۱۲/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۶۴
۸: بنام گرامی، ۲/۱۹/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۶۸

چند روز ہوئے، حیدر آباد کے محکمہ تعلیم کی طرف سے ایک خط آیا تھا، بیت العلوم دکن کے امتحان تاریخِ اسلامی کے لیے پرچۂ سوالات تیار کروں۔ پچھلے سال پرچہ بنا دیا تھا، مگر امسال الٰہ آباد و پنجاب کی دونوں یونیورسٹیوں کے امتحاناتِ ایم اے کا کام میرے سپرد تھا، مجبوراً انکار کرنا پڑا۔[9]

....

افسوس ہے کہ میرے پاس بہت سی نظمیں نہیں ہیں۔ اب مجموعہ مرتب کرنے کی کوشش میں ہوں کہ اشاعت کروں۔[10] [البتہ] مثنوی کا دوسرا حصہ، رموزِ بے خودی، اِن شاء اللہ اس سال کے ختم ہونے سے پیشتر ختم ہو جائے گا۔[11]

....

منشی قمر دین [ناشر] اس قابل نہیں کہ ان کو اجازت دی جائے۔ مجھے یہ بات گذشتہ تجربے سے معلوم ہے، ورنہ میری عادت میں کسی کو محروم کرنا داخل نہیں۔ علاوہ اس کے، یہ لوگ تجارتی اغراض ملحوظ رکھتے ہیں اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ شعر غلط چھپا ہے یا صحیح۔ اس کے بعد اعتراض مجھ پر ہوتے ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان نظموں کو میں نے شائع کیا ہے۔ اس سے پیشتر اس شخص پر سوٹ دائر کرنے کو تھا، مگر مولوی ظفر علی خاں کے کہنے سے باز رہا۔ اس نے اس سے پیشتر میری نظموں کو بغیر میری اجازت کے شائع کر لیا تھا، اب یہ سب معاملہ مولوی احمد دین وکیل کے سپرد کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر اجازت چھاپے تو اس پر دعویٰ کیا جائے۔[12]

....

لکھنؤ والے یا اَور معترض یہ خیال کرتے ہیں کہ اقبال شاعر ہے، مگر میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں، نہ مَیں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا ہے۔ حقیقت میں فنِ شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی

9: بنام شاد، ۲۳/۲/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۷۵-۵۷۶
10: بنام سید فصیح اللہ، ۲۳/۲/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۷۱
11: بنام خان نیاز، ۲/۳/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۷۵ 12:
12: بنام فوق، ۶/۳/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۷۶

انسان اس پر حاوی نہیں ہوسکتا، پھر مَیں کیونکر کامیاب ہوسکتا ہوں، جسے روزی کے دھندے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اسی قدر ہے کہ چند مطالب، جو میرے ذہن میں ہیں، اُن کو مسلمانوں تک پہنچادوں اور بس![13]

....

آج کل لاہور میں سلطان کی سرائے میں ایک مجذوبہ نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے، کسی روز اُن کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔[14]

....

[میرا بڑا] لڑکا [آفتاب اقبال] دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین وطباع ہے، مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آج کل اِس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرادوں یا اس کی شادی کردوں، تاکہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہوجائے۔[15]

....

گرامی صاحب جالندھر آنے والے ہیں، مجھ کو بھی طلب کیا ہے، مگر مَیں کئی دِنوں سے بوجہ دَورۂ دردِ گردہ کے مضمحل ہوں۔[16] [اگرچہ] طبیعت ابھی تک رُوبراہ نہیں ہوئی، لیکن پہلے کی نسبت بہت آرام ہے۔[17]

....

مَیں نے اب تک اپنے معاملات میں ذاتی کوشش کو بہت کم دخل دیا ہے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو حالات کے اوپر چھوڑ دیا ہے اور نتیجے سے، خواہ وہ کسی قسم کا ہو، خدا کے فضل وکرم سے نہیں گھبرایا۔ اس وقت بھی قلب کی کیفیت یہی ہے کہ جہاں اُن کی رضا لے جائے گی جاؤں گا۔ دل میں یہ ضرور ہے کہ اگر خدا کی نگاہِ انتخاب نے مجھے حیدرآباد کے لیے چنا ہے تو اتفاق سے یہ انتخاب میری مرضی کے عین مطابق ہے۔[18]

....

۱۳: بنام فوق، ۶/۳/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۷۷

۱۴: بنام شاد، ۷/۳/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۸۲

۱۵: ایضاً

۱۶: بنام خان نیاز، ۲۱/۳/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۸۵

۱۷: بنام گرامی، ۲۲/۳/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۸۵

۱۸: بنام شاد، ۱۸/۳/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۸۴

والد مکرم اب لاہور نہ آئیں گے، کیونکہ اب ان کا ضعفِ پیری سفر کی اجازت نہیں دیتا، البتہ مَیں ان کی خبر گیری کے لیے آج سیالکوٹ جاؤں گا، پرسوں واپس آ جاؤں گا۔[19]

....

مہاراجا بہادر نے منشی دین محمد کو لکھا کہ اقبال سے ان کو بڑی عقیدت ہے اور وہ ہر ممکن کوشش اس معاملے میں کریں گے اور چند روز تک ان کی کوشش کا عملی ظہور ہو گا۔[20] یہاں پنجاب اور یوپی کے اخباروں میں چرچا ہوا تو دُور دُور سے مبارک باد کے تار بھی اُڑ گئے اور اضلاعِ پنجاب، جن کے مقدمات میرے سپرد ہیں، اُن کو گونہ پریشانی ہوئی۔[21] مخبر دکن سے معلوم ہوا ہے کہ حیدر آباد ہائی کورٹ کی ججی کے لیے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔[22]

....

[انگلستان سے] واپسی پر پنجاب اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں میں عربی اور فلسفے میں بی اے اور ایم اے کا ممتحن مقرر کیا گیا اور اب بھی ہوں۔ امسال الہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب [یونیورسٹی] میں بی اے فارسی کا ایک پرچہ اور ایم اے فلسفے کے دو پرچے میرے پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے، مَیں نے پنجاب گورنمنٹ کالج میں علمِ اقتصاد، تاریخ اور انگریزی بی اے اور ایم اے کی جماعتوں کو پڑھائی ہے اور حکامِ بالا سے تحسین حاصل کی ہے۔[23]

....

فقہ اسلام میں اِس وقت ایک مفصل کتاب بزبانِ انگریزی زیرِ تصنیف ہے، جس کے لیے مَیں نے مصر و شام و عرب سے مسالہ جمع کیا ہے، جو اِن شاءاللہ بشرطِ زندگی شائع ہو گی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہو گی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو

19: بنام گرامی، ۲۲/۳/۱۹۱۷ء، اول، ۵۸۵ — 20: ایضاً، ۵۸۶
21: بنام شاد، ۱۰/۴/۱۹۱۷ء، اول، ۵۸۸ — 22: بنام شاد، ۱۵/۴/۱۹۱۷ء، اول، ۵۸۹
23: ایضاً، ۵۹۰

تفصیل مسائل کے اعتبار سے ایسا ہی بناؤں، جیسی کہ امام نسفی کی مبسوط ہے، جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی تھی۔[۲۴]

....

والدِ مکرم، امید ہے کہ ابھی چند روز اور قیام کریں گے۔ وہاں پر بال بچے اُن کے بغیر اداس ہو جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے، وہ ہر روز میری والدہ اور اپنے والدین کی قبر پر جانے کے عادی ہیں، اس روز کے فرض کا ترک زیادہ ایام تک گوارا نہیں کر سکتے۔[۲۵]

....

[حیدر آباد سے] مجھے بڑی پختہ امید نہیں، کیونکہ جو لوگ وہاں کے ہیں، ان کو دوڑ دھوپ کا موقع بہت حاصل ہے اور مقامی اثرات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایک دُور افتادہ آدمی اس اعتبار سے کوئی بڑی امید حصولِ مقصد کی نہیں کر سکتا۔ بہرحال جو خدا کو منظور ہوگا، ہو رہے گا۔[۲۶]

....

فارسی مثنوی کے دوسرے حصے کی تکمیل میں مصروف ہوں، اس کا نام رموزِ بے خودی ہوگا۔ یونیورسٹی امتحانوں کے کاغذات سے فرصت ہوگئی ہے، امید کہ اب جلد ختم ہو جائے گا۔[۲۷]

اسرار خودی کی کوئی کاپی اب موجود نہیں۔ مدت ہوئی، پہلی ایڈیشن، جس کی تعداد بہت نہ تھی، ختم ہوگئی۔ مَیں نے ارادتاً کم تعداد میں چھپوائی تھی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ عربی اسلام ہندوستان میں ایک فراموش شدہ چیز ہے، اس واسطے اس کے مضمون سے بہت کم لوگوں کو دلچسپی ہوگی۔ ممکن ہے، دوسری ایڈیشن شائع ہو۔[۲۸]

....

افسوس ہے کہ مَیں نے آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی، لیکن امسال ممکن ہے۔[۲۹]

۲۴: بنام شاد، ۱۵/۴/۱۹۱۷ء، اوّل
۲۵: بنام گرامی، ۱۷/۴/۱۹۱۷ء، اوّل، ۵۹۱
۲۶: ایضاً
۲۷: بنام شاد، ۱۹/۵/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۰۴
۲۸: بنام فوق، ۸/۶/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۰۷
۲۹: ایضاً

واقعی آم دردِ گردہ کے مریض کے لیے اچھا ہے اور مجھ کو بھی اس سے بہت محبت ہے۔ کھانے کی چیزوں میں صرف یہی ایک چیز ہے، جس کے لیے میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ باقی چیزوں کے لیے خواہش نہیں ہوتی، یہاں تک کہ روزمرہ کا کھانا بھی عادت کے طور پر کھاتا ہوں۔[30]

....

رموزِ بے خودی کو میں اپنے خیال میں ختم کر چکا تھا، مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی، ترتیب مضامین کرتے وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ ابھی دو تین ضروری مضامین باقی ہیں، یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود حیات ملیہ اسلامیہ میں کیا ہے؟ ان مضامین کے لکھ چکنے کے بعد اس حصۂ مثنوی کو ختم سمجھنا چاہیے، مگر ایسے ایسے مطالب ذہن میں آئے ہیں کہ خود مسلمانوں کے لیے موجب حیرت و مسرت ہوں گے، کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملت اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے، وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصولِ حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں، جن کی پختگی اور پائداری مرورِ ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔[31]

....

حیدرآباد والا معاملہ ابھی تک بدستور ہے، یعنی اس میں خاموشی ہے۔ مہاراجا کے خطوط آتے ہیں، مگر ان میں کوئی اشارہ کنایہ اس بارے میں نہیں ہوتا۔[32]

....

[مثنوی کا] دوسرا حصہ قریب الاختتام ہے، مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آ رہا ہے اور مضامین دریا کی طرح اُمڈے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔

۳۰: بنام خان نیاز، ۲۷/۶/۱۹۱۷ء، اول، ۶۱۲ ۳۱: ایضاً، ۶۱۲-۶۱۳

۳۲: بنام گرامی، ۱/۷/۱۹۱۷ء، اول، ۶۱۷-۶۱۸

اس حصہ کا مضمون ہوگا، 'حیاتِ مستقبلہ اسلامیہ'، یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعت اسلامیہ، جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات وحوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخران سب واقعات کا مقصود وغایت کیا ہے؟ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف وواضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ اُس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ مَیں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا اور بعض آیات وسورتوں پر مہینوں، بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں، مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں۔ بہر حال، مَیں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی یا جب اس کا وقت آئے گا، اشاعت ہو جائے گی۔[۳۳]

سیدہ خاتون [حضرت فاطمۃ الزہرہؓ] زمانۂ حال کی مسلمان عورتوں کے لیے ایک اسوۂ کاملہ ہے۔ مثنوی کے دوسرے حصے میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں، مگر افسوس ہے کہ کوئی چبھتا ہوا شعر اب تک نہیں نکل سکا۔[۳۴] اس فکر میں ہوں کہ حضرتِ سیدہ کے متعلق ایک ایسا شعر لکھا جائے، جو معانی کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو، آج صبح آنکھ کھلتے ہی وہ شعر ذہن میں آیا، ابھی اسے خراد کی ضرورت ہے:

گریۂ شب ہاے آن بالا نشین
ہم چو شبنم ریخت بر عرشِ برین

'بالانشین'، 'ریختن' کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے، مگر کسی قدر کھٹکتا ہے۔[۳۵]

[اب] اس کو اس طرح عرض کیا ہے [یعنی بدل دیا ہے]:

۳۳: بنام گرامی، ۱ر۷ر۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۱۸ ۳۴: ایضاً، ۶۱۹

۳۵: بنام گرامی، ۳ر۷ر۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۲۴

اشک او بر چید جبریل از زمین
ہم چو شبنم ریخت بر عرشِ برین

'بالانشین' کا لفظ کھٹکتا تھا اور اس کے علاوہ بہت کم لوگ اس کو سمجھ سکتے۔[۳۶]

....

مَیں نے حیدری صاحب کو لکھا ہے کہ حیدرآباد حاضر ہوں گا اور سب باتیں زبانی عرض کروں گا۔ مہاراجا بہادر کو فقط یہ اطلاع دی ہے کہ حیدرآباد آتا ہوں۔ فی الحال مَیں نے کسی عہدے کے متعلق کچھ نہیں لکھا اور یہ ضروری بھی نہیں، کیونکہ جب خود جانے کا ارادہ مصمم ہوگیا ہے تو خطوط میں لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، سب باتیں زبانی ہوجائیں گی۔[۳۷]

چیف کورٹ لاہور بھی بند ہونے والا ہے اور میرا دل بھی چند روز کی آوارگی چاہتا ہے، اس واسطے مَیں نے...... [حیدری صاحب] کی دعوت قبول کرلی۔ اِن شاءاللہ اگست یا ستمبر میں حاضر ہوں گا۔[۳۸] جس روز وہاں پہنچوں گا، اُسی روز آستانۂ شاد کا طواف ہوگا[۳۹] [اور] اِن شاءاللہ...... [شاد] کے مشورے پر عمل درآمد ہوگا، کیونکہ...... [شاد] کی معاملہ شناسی کبھی غلطی نہیں کرسکتی، خصوصاً جب کہ اس کے ساتھ تلطف بھی ہو۔[۴۰]

حیدری صاحب نے مجھے قانون کی پروفیسری پیش کی ہے اور یہ پوچھا ہے کہ اگر پرائیویٹ پریکٹس کی بھی ساتھ اجازت ہو تو کیا تنخواہ لوگے؟ مجھے یہ معلوم نہیں کہ میر مجلسی عدالت العالیہ کی خالی ہے، نہ اس کے متعلق انھوں نے اپنے خط میں کوئی اشارہ کیا ہے، لیکن اگر ایسا ہوجائے تو مَیں اس قانون کی پروفیسری کو پرائیویٹ پریکٹس پر ترجیح دوں گا۔[۴۱]

اقبال خواہ لاہور میں، خواہ حیدرآباد میں، خواہ مریخ ستارے [سیارے؟] میں؛ وہ غیر محسوس روحانی پیوند، جو اس کو...... [شاد] سے ہے، اِن شاءاللہ العزیز قائم رہے گا۔ نہ وقت اسے دیرینہ کرسکتا ہے، نہ تعلقات اسے کمزور کرسکتے ہیں۔ مجھے تو حیدرآباد آنے کی سب

۳۶: بنام گرامی، ۶/۷/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۲۷
۳۷: بنام گرامی، ۱۶/۷/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۳۵
۳۸: بنام شاد، ۱۶/۷/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۳۷
۳۹: بنام شاد، ۲۷/۷/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۴۲
۴۰: بنام شاد، ۱۴/۸/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۴۵
۴۱: ایضاً، ۶۴۸

سے بڑی خوشی اس امر کی ہے کہ...... [شاد] سے اکثر ملاقات ہوا کرے گی اور...... [شاد] کے علمی وادبی مشاغل سے گونہ رابطہ رہے گا۔[۴۲]

...... [گرامی] نے ہوشیار پور میں یہ خبر مشہور کی ہے کہ اقبال حیدرآباد میں ملازم ہو گیا ہے۔ یہ خبر بالکل غلط ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی اس قسم کی خبر مشہور ہوئی تھی اور اس کے بذریعہ مشہور کرنے والے مولوی ظفر علی خاں تھے۔ مجھے اس خبر کی تشہیر سے بہت نقصان ہوا، [یعنی پنجاب کے اہلِ مقدمات کو گونہ پریشانی ہوئی اور نیا کام ملنا بند ہو گیا] اور تعجب ہے کہ وہ میرے دوست تھے اور اپنے خیال میں انھوں نے میرے فائدے کے لیے اس امر کی تشہیر کی تھی۔ اگر کوئی بات واقع میں ہو جائے تو اس کی تشہیر میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن جب اصلیت نہ ہو تو اس کی تشہیر سے نہ مجھے کوئی فائدہ ہے، نہ حیدرآباد کو۔[۴۳]

....

میرا مقصد کچھ شاعری نہیں، بلکہ غایت یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ احساسِ ملیہ پیدا ہو، جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا خاصہ تھا۔ اس قسم کے اشعار لکھنے سے غرض عبادت ہے، نہ [کہ] شہرت ہے۔ کیا عجب کہ نبی کریمؐ کو میری یہ کوشش پسند آ جائے اور ان کا استحسان میرے لیے ذریعہ نجات ہو جائے۔[۴۴]

....

[حیدرآباد میں] یونیورسٹی کی تکمیل کے لیے ابھی عرصے کی ضرورت ہے اور کچھ عجب نہیں کہ شاید یونیورسٹی کبھی بروے کار بھی نہ آئے۔ ایک گروہ حیدرآباد میں مخالف ہے اور جس طریق پر انھوں نے یہ کام شروع کیا ہے، اس سے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ یونیورسٹی کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے آدمیوں کی ضرورت ہے اور آدمی وہاں پر موجود نہیں۔ جو آدمی وہاں پر موجود ہیں، وہ اپنے ذاتی مفاد کی غرض سے اپنے سے قابل تر اور زیادہ کارکن آدمیوں کو حیدرآباد میں نہ گھسنے دیں گے۔ یونیورسٹی کا معاملہ ان وجوہات سے

۴۲: بنام شاد، ۱۹۱۷/۸/۱۴ء، اوّل، ۶۴۸ ۔ ۴۳: بنام گرامی، ۱۹۱۷/۸/۱۸ء، اوّل، ۶۴۹

۴۴: بنام گرامی، ۱۹۱۷/۹/۳ء، اوّل، ۶۵۷

مشتبہ نظر آتا ہے؛ باقی رہی چیف ججی، سو اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہاں پر یہ جگہ خالی نہیں ہے اور اگر خالی بھی ہو تو وہاں کے حق دار لوگ موجود ہیں۔[45]

ایک گمنام خط حیدر آباد سے مجھے آیا تھا، جس میں حیدری صاحب کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ لبِ لباب یہ ہے کہ 'ہم لوگ شب و روز دعا کر رہے ہیں کہ آپ یہاں پر تشریف لائیے، مگر بعض آدمی، جو بظاہر آپ کے دوست ہیں، حقیقت میں آپ کے یہاں پر آنے سے خوش نہیں' وغیرہ وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا حیدری صاحب کا مخالف ہے۔ بہر حال، ایک مدت سے اقبال اپنے سارے معاملات خدا کو سونپ چکا ہے اور اپنے آپ کو محض ایک لاش جانتا ہے، جس کی حس و حرکت خدا کے ہاتھ میں ہے۔[46]

۳۰/ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ حیدر آباد ہونے والا تھا کہ ۲۹/ کی شام کو بخار نے آ دبایا اور اس کے ایک دو روز بعد پیچش کا اضافہ ہوا۔ ہفتہ بھر سخت تکلیف کا سامنا رہا۔ آج اس قابل ہوں کہ...... [شاد] اور حیدری صاحب کی خدمت میں عریضہ لکھ سکوں۔ ڈاکٹر صاحب ایک ہفتے تک اجازت نہیں دیتے اور مَیں نے بھی صحت کے خیال سے یہ بہتر سمجھا ہے کہ سفر حیدر آباد ملتوی کر دوں، یہاں تک کہ معاملہ معلومہ خط و کتابت سے طے ہو جائے۔ سو آج حیدری صاحب کی خدمت میں عریضہ لکھا ہے اور جو مشورہ...... [شاد] نے بکمالِ عنایت دیا تھا، اُسی کے مطابق میرے عریضے کا مضمون ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا اور معاملہ طے ہو گیا تو اقبال ہو گا اور آستانۂ شاد۔[47]

مَیں نے...... [حیدری صاحب] کو تار دیا تھا کہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں آ سکوں گا، اس کے بعد انھوں نے صحیح تاریخِ روانگی بذریعہ تار مانگی اور مَیں نے جواب دیا کہ گیارہ اکتوبر کو یہاں سے سفر کروں گا، لیکن بعد میں ان کی خدمت میں عریضہ لکھا ہے کہ ایک مقدمے کے لیے، جس کو مَیں نے قبول کر لیا ہے، ۱۵/ اکتوبر کے روز مجھے لاہور میں ہونا

۴۵: بنام گرامی، ۳/۹/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۵۷-۶۵۸ ۴۶: ایضاً، ۶۵۸

۴۷: بنام شاد، ۷/۹/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۵۸-۶۶۱

چاہیے، اس واسطے گیارہ کو یہاں سے روانہ نہ ہوسکوں گا۔ اس کے بعد حیدری صاحب کا خط ملا، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اکتوبر کے بجائے نومبر میں آیئے۔[48] نومبر میں مجھے فرصت نہیں، اس واسطے اب بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہاں جا سکوں۔ حیدرآباد سے اَور خطوط بھی مجھے آئے ہیں، جن سے وہاں کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔[49]

گرما کی تعطیلات میں حیدرآباد کا سفر آسان تھا اور اب یہ سفر تقریباً دو ہزار روپیہ کے نقصان کا مترادف ہے۔ اگر حیدری صاحب کے خطوط سے کوئی امید خاص میرے دل میں پیدا ہوتی تو مَیں اس نقصان کا متحمل ہو جاتا، لیکن اس وقت تک جو خطوط ان کی طرف سے آئے ہیں، ان میں کوئی خاص بات نہیں، سوائے اس کے کہ انھوں نے مجھ سے تنخواہ کے بارے میں استفسار کیا تھا، جس کا جواب مَیں نے ان کو دے دیا تھا۔ علاوہ اس کے، مجھے اَور ذرائع سے معلوم ہوا کہ ابھی میری وہاں ضرورت بھی نہیں، حیدری صاحب اس وقت مجھے صرف اس واسطے بلاتے ہیں کہ یونیورسٹی سے متعلق مجھ سے گفتگو کریں اور نیز ملاقات کے لیے اَور کوئی غرض اُن کے خطوط سے معلوم نہیں ہوتی۔ گرمی کی تعطیلوں میں آتا تو صرف آمد و رفت کے اخراجات تھے، انکم کے فقدان کا اندیشہ نہ تھا؛ اب جب کہ عدالتیں کھل گئی ہیں تو صورتِ حال مختلف ہوگئی ہے۔ اُس وقت میرا یہ خیال تھا کہ اگر وہاں کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی تو کم از کم ...... [شاد] کے آستانے کی حاضری ہی سہی، لیکن اب ان حالات میں، جب کہ حیدری صاحب کے خطوط کسی قسم کی امید پیدا نہیں کرتے، بلکہ محض تفننِ طبع کے لیے حیدرآباد کی دعوت دیتے ہیں، اس قدر نقصان برداشت کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔[50]

....

[مثنوی کا] دوسرا حصہ اِن شاء اللہ اس سال سے پہلے ختم ہو جائے گا، صرف چند اشعار کی کسر باقی ہے۔ اگر آج وہ اشعار لکھے جائیں تو ایک ہفتے کے اندر نقل کر کے کتاب

۴۸: بنام شاد، ۷/۱۰/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۶۶ — ۴۹: بنام گرامی، ۶/۱۰/۱۹۱۷ء، اوّل ۶۶۲

۵۰: بنام شاد، ۷/۱۰/۱۹۱۷ء، اوّل، ۶۶۵-۶۶۶

مطبع میں دی جاسکتی ہے، مگر مَیں انتظار میں ہوں کہ وہ اشعار آئیں تو ان کو مثنوی میں داخل کروں۔ دوسرے حصے کے مضامین سے، پہلے حصے پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی تشریحات، جو پہلے حصے کے اشعار کی کی جارہی ہیں، خود بخود غلط ہو جائیں گی۔ اسلامی نیشنلزم کی حقیقت اس سے واضح ہوگی اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔[51] مولوی گرامی نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کی تقریظ کے بغیر مثنوی شائع نہ ہو۔[52] مثنوی کل سنسر کے محکمے سے واپس آ گئی ہے، اِن شاءاللہ آج کاتب کے حوالے کی جائے گی۔[53]

۵۱: بنام خان نیاز، ۱۹۱۷/۱۱/۴ء، اوّل، ۶۷۲۔۶۷۳ ۵۲: بنام خان نیاز، ۱۹۱۷/۱۱/۲۷ء، اوّل، ۶۷۶

۵۳: بنام خان نیاز، ۱۹۱۷/۱۲/۲۷ء، اوّل، ۶۸۷

۱۹۱۸ء

ایک شخص نے بیان کیا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ 'اقبال نے اپنی ٹوپی ہمارے قدموں میں رکھ کر ہم سے معافی مانگی ہے اور آئندہ کے لیے توبہ کی ہے'۔ مَیں نے انھیں یہ جواب دیا کہ جن لوگوں کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنت ہے، اقبال اُن کے قدموں پر ٹوپی کیا، سر رکھنے کو تیار ہے اور اُن کی صحبت کے ایک لحظہ کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے، لیکن جو بات خواجہ حسن نظامی کی طرف سے منسوب کرتے ہو تو اس کے لغو ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔[۱]

....

حیدری صاحب تو اقبال کو بلاتے بلاتے رہ گئے۔ یونیورسٹی کے کاغذات اُن کی طرف سے کبھی کبھی آ جاتے ہیں کہ یہیں سے مشورہ لکھوں۔ اُدھر سے مولوی عبدالحق صاحب اصطلاحاتِ علمیہ کی ایک طویل فہرست ارسال کرتے ہیں کہ ان کے تراجِم اردو پر تنقید کرو؛ گویا ان بزرگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اقبال کو کوئی اَور کام نہیں۔[۲]

....

پرسوں رات خواب میں دیکھا کہ...... [شاد] کی طرف سے ایک والا نامہ ملا ہے، جس کی ہیئت و صورت ایسی ہے، جیسے کوئی خریطہ شاہی ہو۔ تعبیر اس خواب کی تو معلوم نہیں، مگر خواب کو امرِ واقعہ سمجھ کر اس خریطہ کا جواب لکھتا ہوں، گو مضمون خریطہ کا اب ذہن سے اُتر گیا ہے۔ شاد کی طرف سے اقبال کو شاہی خریطہ آئے، یہ بات خالی از معنی نہیں،

۱: بنام حسن نظامی، ۱۱/۱/۱۹۱۸ء، اوّل، ۶۹۳   ۲: بنام شاد، ۲۰/۱/۱۹۱۸ء، اوّل، ۶۹۷

انتظار شرط ہے اور اللہ کی رحمت ہمارے خیالوں سے وسیع تر ہے۔ حضور نظام علی گڑھ تشریف لے گئے تھے، وہاں سے نواب اسحاق خاں صاحب، سیکرٹری [اینگلو محمڈن] کالج [علی گڑھ] کا تار بھی آیا تھا کہ حضور کے خیر مقدم میں چند اشعار یہاں آ کر پڑھو۔ یہ ایک بہت بڑی عزت تھی، مگر افسوس کہ علالت نے مجھے اس سے محروم رکھا۔ امید تھی کہ...... [شاد] بھی ان کے ہمراہ تشریف لائیں گے، مگر یہ امید بھی پوری نہ ہوئی۔ کیا عجب کہ ایک ہی وقت میں بہت سی امیدیں پوری ہو جائیں۔[۳]

....

سنا ہے کہ داتا گنج بخش کی درگاہ میں آج کل کوئی بہت روشن ضمیر بزرگ قیام رکھتے ہیں، ان سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ 'جب مسلمانوں سے یہ وعدۂ ایزدی ہے کہ وہ اقوامِ عالم میں سرفراز اور سر بلند ہوں گے تو آج کل یہ قوم اتنی ذلیل و خوار کیوں ہے۔'[۴] [پھر یوں ہوا کہ] آج صبح مَیں یہیں بیٹھا تھا کہ علی بخش نے آ کے اطلاع دی کہ کوئی درویش صورت آدمی ملنا چاہتا ہے۔ مَیں نے کہا، 'بلا لو'۔ ایک درویش صورت اجنبی میرے سامنے خاموش آ کھڑا ہوا۔ کچھ وقفے کے بعد مَیں نے کہا، 'فرمایئے، آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے'۔ اجنبی بولا، 'ہاں، تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ مَیں تمھارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں'۔ اور اس کے بعد مثنوی [مولانا روم] کا مشہور شعر پڑھا:

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
تو ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

چند لمحوں کے لیے مجھے قطعی اپنے گرد و پیش کا احساس جاتا رہا۔ ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو بزرگ سے مخاطب ہونے کے لیے دوبارہ نظر اُٹھائی، لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ علی بخش کو ہر طرف دَوڑایا، لیکن کہیں سراغ نہیں ملا۔[۵]

....

۳: بنام شاد، ۲/۱/۱۹۱۸ء، اوّل، ۶۹۸ ۴: روزگارِ فقیر، ۲۹

۵: ایضاً، ۳۰

انگلستان کے پروفیسر نکلسن، جنھوں نے دیوانِ شمس تبریزؒ کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، (کشف المحجوب حضرت علی ہجویریؒ کا بھی انھیں بزرگ نے انگریزی ترجمہ کیا ہے) مجھ سے اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں، مگر کوئی نسخہ اس مثنوی کا اُن کے پاس نہیں۔ جو ہے، انھوں نے کہیں سے عاریتاً لیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی نسخہ نہیں، سوائے ایک نسخے کے، جس پر مَیں نے بہت سی ترمیم کر رکھی ہے، جو دوسرے ایڈیشن کے لیے ہے۔[6]

مجھے رونا آ گیا کہ جس قوم کے دل میں احساسِ خودی پیدا کرنے کے لیے مَیں نے یہ کتاب لکھی تھی، وہ نہ تو پوری طرح اس کا مطلب سمجھ سکتی ہے اور نہ اس کی قدر کر سکتی ہے۔ دوسری طرف ولایت والوں کا یہ حال ہے کہ وہ میرے پیغام کو اپنے ملک کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ کتاب مَیں نے اُن کے لیے نہیں لکھی۔[7]

اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموزِ بے خودی زیرِ طبع ہے، فروری یا مارچ میں شائع ہو جائے گا۔ تیسرے حصے کا بھی آغاز ہو گیا ہے، یہ ایک قسم کی نئی منطق الطیر ہوگی۔[8]

....

ایم اے کا زبانی امتحان لینے کے لیے الٰہ آباد جانے والا ہوں اور یہ ممتحنی مَیں نے اس واسطے قبول کر لی کہ مولانا اکبر کی زیارت کا بہانہ ہو جائے گا۔[9] مگر مولانا اکبر کے خط سے معلوم ہوا کہ وہاں پلیگ زوروں پر ہے۔ والد مکرم نے، جو چند روز ہوئے، یہاں تھے، یہ خط دیکھ کر مجھے الٰہ آباد جانے سے روک دیا۔ دہلی جانے کا قصد تھا، مگر وہاں بھی نہ گیا۔[10]

مثنوی رموزِ بے خودی ...... چھپ کر تیار ہے۔[11] مولانا ابوالکلام نے میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔[12] [دوسری طرف] اَسرارِ خودی کا دوسرا ایڈیشن تیار کر

۶: بنام شاد، ۱/۲/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۰۱

۷: روزگارِ فقیر، ۳۲

۸: بنام شاد، ۱/۲/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۰۱

۹: بنام خان نیاز، ۹/۳/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۰۲

۱۰: بنام خان نیاز، ۲۰/۳/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۰۲

۱۱: بنام شاد، ۱۰/۴/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۰۴

۱۲: بنام سلیمان ندوی، ۲۸/۴/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۰۵

رہا ہوں[13]، [تاہم] میرا مقصود شاعری سے شاعری نہیں، بلکہ یہ کہ اَوروں کے دلوں میں بھی وہی خیالات موج زن ہو جائیں، جو میرے دل میں ہیں اور بس[14]!

....

یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ مَیں ...... [سردار بیگم] کا زیور لے کر ...... [آفتاب اقبال] کی تعلیم پر صرف کر دوں، جس سے نہ اسے کچھ توقع ہو سکتی ہے، نہ مجھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا زیور اس خیال سے نہیں دیتی کہ کل کو اسے اس کا معاوضہ ملے گا، بلکہ وہ محض اس غرض سے دیتی ہے کہ مجھ پر کوئی شخص حرف گیری نہ کرے؛ لیکن اگر کوئی شخص مجھ پر حرف گیری کرے تو اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص مجھ سے ناخوش ہے۔ برخلاف اس کے ناانصافی میں خدا اور رسولؐ کی ناخوشی ہے، جس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ باقی رہے وہ لوگ، جو مجھ سے مدد چاہتے ہیں؛ افسوس ہے کہ وہ اسے احسان نہیں جانتے، بلکہ قرض تصور کرتے ہیں۔ مَیں نے پینتیس روپے ماہوار اس کم بخت ...... [آفتاب اقبال] کو دیے تھے اور کالج کے اَور لڑکوں سے اخراجات کے متعلق دریافت کر کے یہ رقم مقرر کی تھی، مگر آج تک ہر شخص کے پاس یہی رونا رویا جاتا ہے کہ خرچ ناکافی ملتا ہے۔ ان کو مدد دینا، نہ دینا برابر ہے۔ شیخ گلاب دین صاحب کو بھی اس نے خط لکھا تھا، مگر انھوں نے اسے یہ جواب دیا ہے کہ حالات مجھے معلوم ہیں، اس واسطے مَیں ڈاکٹر صاحب سے اس بارے میں گفتگو نہیں چاہتا۔ گذشتہ سالوں میں بھی وہ لوگ [کریم بی بی اور آفتاب اقبال] اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئے، مگر باوجود ان تمام باتوں کے مَیں اسے مدد دیتا، مگر اِس وقت مشکلات کا سامنا ہے۔ جنگ کی وجہ سے آمدنیاں قلیل ہو گئی ہیں اور یہ شکایت کچھ مجھی کو نہیں، اَوروں کو بھی ہے اور وہ پچاس روپے ماہوار اس طرح مانگتے ہیں، جیسے مَیں مقروض ہوں اور وہ قرض خواہ۔ مَیں نے ...... [آفتاب کو] مشورہ دیا تھا کہ وہ کہیں ملازمت کر لے اور کچھ کمانے کے قابل ہو جائے کہ بی اے کے امتحان کی اب وہ وقعت

13: بنام سلیمان ندوی، ۲۸/۴/۱۹۱۸ء، اوّل

14: بنام منظور حسین، ۶/۸/۱۹۱۸ء، اوّل ۱۲، ۷ے

نہیں رہی، جو پہلے تھی۔ مَیں نے تجربے سے دیکھا ہے کہ جولڑکے انٹرنس یا ایف اے پاس کر کے ملازمت کرتے ہیں، وہ بی اے، ایم اے پاس کرنے والوں سے بہتر رہتے ہیں، مگر اس نے مشورے پر عمل نہیں کیا اور کالج میں داخل ہونے کے لیے دہلی چلا گیا، پھر بھی مجھے کچھ اعتراض نہیں۔ بہتر ہے کہ اس کی والدہ اپنا نقرئی و طلائی سرمایہ اس کی تعلیم پر خرچ کرے۔ کم از کم اس کا وہ حصہ خرچ کر دے، جو اس نے میرے ماں باپ سے لیا ہے، اپنے ماں باپ کا خرچ نہ کرے اور اگر کچھ عرصے بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آ گیا تو مَیں اسے ایک مشت بارہ سو روپیہ دے دوں گا۔[15]

گذشتہ دس سال کے عرصے میں بیس پچیس ہزار میرے ہاتھوں میں آیا ہے، مگر یہ سب اپنے اپنے موقع پر مناسب طور پر خرچ ہوا، جس کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، تاہم اس وقت تک مَیں ایک عمدہ مکان کرایے پر نہیں لے سکا، نہ مکان کے لیے فرنیچر اور ساز و سامان خرید سکا ہوں، نہ عمدہ گاڑی گھوڑا خرید سکا ہوں۔ یہ سب لوازمات اس پیشے [وکالت] کے ہیں۔ اب مَیں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جس طرح ہو سکے، یہ لوازمات بہم پہنچائے جائیں۔ اب حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا بہم پہنچانا لازم اور ضرور ہے۔ مَیں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد قوت ہے، جس میں میری محنت کو دخل نہیں، خلق اللہ کی خدمت میں اسے صرف ہونا چاہیے؛ مگر ضروریات سے مجبور ہو کر مجھے اس عہد کے خلاف کرنا پڑا۔[16]

....

پنجاب یونیورسٹی میں اب فارسی میں ایم اے کا امتحان بھی ہوا کرے گا۔ مَیں اس کے لیے کورس تجویز کر رہا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ اس امتحان میں ایک پرچہ ہندوستان کے فارسی شعرا کا ہو۔[17]

....

۱۵: بنام شیخ نور محمد، ۹/۶/۱۹۱۸ء، اوّل ۷۱۲-۷۱۴ ۱۶: ایضاً ۷۱۳

۱۷: بنام گرامی، ۱۰/۶/۱۹۱۸ء، اوّل ۷۱۸

کل رمضان کا چاند یہاں دِکھائی دیا، آج رمضان المبارک کی پہلی ہے۔ بندۂ رُوسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔ اُس وقت عبادتِ الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔[۱۸]

....

اس وقت اسلام کا دشمن سائنس نہیں (جیسا کہ بعض لوگ نادانی سے سمجھے بیٹھے ہیں، اسلام کی پوزیشن سائنس کے خلاف نہایت مضبوط ہے)، مگر اس کا دشمن یورپ کا Territorial Nationalism ہے، جس نے ترکوں کو خلافت کے خلاف اکسایا، مصر میں 'مصر مصریوں کے لیے' کی آواز بلند کی اور ہندوستان کو Pan-Indian Democracy کا بے معنی خواب دِکھایا۔[۱۹]

....

جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا تھا اور اس کی تکلیف سے اُس نے آہ و فریاد کی، اسی طرح مجھ کو...... [اَسرارِ خودی پر اکبر] کا اعتراض تکلیف دیتا ہے۔[۲۰]

....

میرا قصد فاتحہ جنابِ امیرؒ میں شریک ہونے کا تھا، مگر افسوس ہے کہ میری بیوی کچھ عرصے سے بیمار ہے اور ابھی تک رُوبصحت کامل طور پر نہیں ہوئیں۔ وہ اچھی ہوگئیں تو حاضر ہوں گا، اگر اب نہ جاسکا تو تعطیلوں میں اِن شاء اللہ دہلی جانے کا قصد ہے کہ ایک مدت سے آستانۂ حضرت محبوبِ الٰہیؒ پر حاضر ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں، کیا عجب ہے کہ ان گرما کی تعطیلات میں اللہ اس ارادے کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔[۲۱]

خواجہ حسن نظامی سے مجھے دِلی محبت ہے، جس پر اختلافِ خیال قطعاً کوئی اثر نہیں کر سکتا اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اختلاف بھی کم از کم میرے علم اور سمجھ کے مطابق کوئی ایسا اختلاف نہیں۔ وہ، کچھ عرصہ ہوا، یہاں تشریف لائے تھے۔ مَیں نے اصرار کیا کہ وہ ایک

۱۸: بنام شاد، ۱۱/۶/۱۹۱۸ء، اول، ۷۲۲-۷۲۳ ۱۹: بنام اکبر، ۱۱/۶/۱۹۱۸ء، اول، ۷۲۵-۷۲۶

۲۰: بنام اکبر، ۲۰/۷/۱۹۱۸ء، اول، ۷۳۲ ۲۱: بنام اکبر، ۲۵/۷/۱۹۱۸ء، اول، ۷۳۳

روز قیام فرمائیں، لیکن وہ ٹھہر نہ سکتے تھے۔ زبانی باتیں ہوتیں تو بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو جاتیں؛ لیکن جو کچھ بھی ہو، اس سے اس محبت میں کمی واقع نہیں ہو سکتی، جو مجھ کو اُن سے ہے۔ وہ ایک نہایت محبوب آدمی ہیں، اُن کو جان کر اُن سے محبت نہ رکھنا ممکن نہیں۔[۲۲]

....

کچھ مضائقہ نہیں، اگر شیخ عمر بخش صاحب کبوتر نہیں لائے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ کبوتر یہاں اکتوبر میں آئیں، اس سے پہلے نہ آئیں۔ مَیں چند روز تک سیالکوٹ جانے والا ہوں، وہاں کچھ عرصہ قیام کروں گا۔[۲۳]

....

واقعی...... [اکبر] نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہِ شفقت ایک طرف؛ اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے، اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کی بجائے اُن کی گرمیِ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔ پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے، جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ دَورانِ گفتگو میں کہنے لگے، 'معلوم نہیں، بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے'۔ اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ قریباً بے ہوش ہو گئے اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی۔ یہ خاموش لیکچر ہیں، جو پیرانِ مشرق سے ہی مل سکتے ہیں، یورپ کی درس گاہوں میں ان کا نشان نہیں۔ اگست کے آخر تک اِن شاء اللہ یہیں [سیالکوٹ میں] قیام رہے گا۔[۲۴]

....

گورنمنٹ میں نام ضرور پیش ہے اور بعض حکام مائل بھی ہیں، مگر مجھے باوجود ان سب باتوں کے، امید نہیں؛ اسی واسطے اس موقع پر مَیں کسی سے نہیں ملا اور میرے بعض احباب مجھ سے ناراض ہیں کہ شملہ جانے کی جگہ سیالکوٹ آ گیا ہوں، مگر مَیں اُن احباب کو معذور جانتا ہوں کہ وہ میری قلبی کیفیات سے آگاہ نہیں ہیں۔ بہرحال، جو کچھ علمِ الٰہی میں ہے، ہو

۲۲: بنام اکبر، ۲۵/۷/۱۹۱۸ء، اوّل ۲۳: بنام خان نیاز، ۲۶/۷/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۳۵

۲۴: بنام اکبر، ۱۳/۸/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۳۶-۷۳۷

جائے گا اور وہی اَنسب واَولی ہے۔[25]

....

ترشی کے زیادہ استعمال سے دانت میں سخت درد ہوگیا، جس نے کئی روز تک بے قرار رکھا۔ اب خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہوں۔[26]

....

رسالہ East & West کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن [بجنوری] صاحب نے ایک ریویو دونوں مثنویوں پر لکھا ہے، نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ آج زمانہ میں ایک ریویو نظر سے گزرا۔[27]

....

کلکتہ کے فساد کے حالات اخبار میں پڑھے تھے، آج مزید حالات پڑھے۔ خدا تعالی مسلمانوں پر فضل کرے اور ان کے لیڈروں کو آنکھیں عطا فرمائے کہ وہ اس زمانے کے میلانِ طبیعت کو دیکھیں۔ مجھے بھی کلکتہ سے بلاوا آیا تھا اور مَیں جانے کو قریباً تیار بھی تھا، مگر جب مطبوعہ خط کا مضمون والد مکرم کو سنایا تو انھوں نے فرمایا کہ 'حکام یہ جلسہ بند کر دیں گے'، بعد میں ایسا ہی ہوا۔[28]

لاہور میں وبائے انفلوئنزا کی بہت شدت ہے، یہاں تک کہ گورکن میسر نہیں آتے۔ دوا سے بھی اس مرض کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ اوّل تو معلوم ہی نہیں کہ اس کا علاج کیا ہے، دوسرا دوا موجود نہیں اور ڈاکٹر خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں اس وقت اس کا حملہ نہایت شدید ہے۔ لاہور میں قریباً ڈھائی سو اموات روزانہ ہیں اور ابھی کمی کے کوئی آثار نہیں۔ امرتسر میں بھی یہی کیفیت ہے۔[29] دارچینی کا استعمال، کہتے ہیں، مفید ہے۔ قہوہ دو چار دفعہ دِن میں پینا چاہیے۔[30]

۲۵: بنام اکبر، ۱۳/۸/۱۹۱۸ء، اوّل، ۳۷
۲۶: بنام اکبر، ۱۴/۹/۱۹۱۸ء، اوّل، ۴۰
۲۷: ایضاً
۲۸: ایضاً، ۴۱
۲۹: بنام اکبر، ۲۸/۱۰/۱۹۱۸ء، اوّل، ۶۰
۳۰: بنام خان نیاز، ۲۹/۱۰/۱۹۱۸ء، اوّل، ۶۲

آج کل معمول سے زیادہ مصروفیت ہے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر ہیگ چیچک کی بیماری سے دفعتہً انتقال کر گئے اور انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لیے کالج کے ایم اے کی جماعت مجھ کو لینی پڑی۔ یہ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آ جاتے ہیں۔ دن میں جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے، اس میں ان کے لیکچر کے لیے کتب دیکھتا ہوں۔ لیکچر کیا ہیں، انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے، جسے عرفِ عام میں تاریخِ فلسفہ کہتے ہیں۔...... ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔[۳۱]

....

مجھے دہلی سے کبھی کوئی خط نہیں آیا اور نہ کسی پروفیسر نے مجھے اس کی بابت لکھا ہے، نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ کم بخت [آفتاب] دہلی سے مالیر کوٹلہ گیا یا نہ گیا۔ مَیں نے سنا تھا کہ [ڈاکٹر] حافظ [عطا محمد] صاحب ملازمت چھوڑ گجرات چلے گئے ہیں اور اب گجرات میں ہیں، مگر یقیناً یہ خبر بھی معلوم نہیں۔ شاید یہ اس کے لیے بہتر ہو کہ اپنے علاج کے لیے چند روز کے لیے گجرات چلا جائے۔ اچھا ہو جائے تو پھر کالج میں چلا جائے۔ باقی رہا، قصور اس کا یا اس کی والدہ کا، سو میرے نزدیک کسی کا نہیں، امرِ الٰہی ہر طرح ہو جاتا ہے۔ قطع تعلق، جو مَیں نے اُن لوگوں سے کیا ہے، اس کا مقصد سزا نہیں ہے اور نہ ہی مَیں ان سے کوئی انتقام لینا چاہتا ہوں۔ جتنا میرا حصہ موجودہ صورت کے پیدا کرنے میں ہے، اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ عقل مند آدمی ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنک نہیں کھاتا۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو بچانے اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے مناسب تدبیر اختیار کرے، خواہ اس تدبیر کے اختیار کرنے میں کسی اَور کو تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کم بخت [آفتاب] کو دوسرا موقع اپنی اصلاح کا مل گیا تھا، بھائی صاحب [شیخ عطا محمد] نے اس کا قصور معاف کر دیا اور اسی پہلے برتاؤ کا اس سے آغاز بھی کر دیا تھا، مگر کم بخت نے پھر وہی شیوہ اختیار کر لیا اور مَیں

۳۱: بنام اکبر، ۲۸/۱۱/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۸۳

نے سنا ہے کہ ہمشیرہ کریم بی بی کو اس نے بہت دل آزار باتیں کہیں۔ کیا عجب کہ اس کی موجودہ مصیبت اسی کی بددُعا کا نتیجہ ہو۔ میری رائے میں کریم بی بی سے اُسے معافی مانگنی چاہیے اور خدا کے حضور میں توبہ کرنی چاہیے۔[۳۲]

۳۲: بنام شیخ نور محمد، ۱۲/۱۲/۱۹۱۸ء، اوّل، ۷۹۲۔ ۷۹۳

۱۹۱۹ء

شاعری محض محاورات اور اظہارِ بیان کی صحت سے بڑھ کر کچھ اَور بھی ہے۔ میرے معیار، تنقید نگاروں کے ادبی معیاروں سے مختلف ہیں۔ میرے کلام میں شاعری محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے قطعاً یہ خواہش نہیں کہ دَورِ حاضر کے شعرا میں میرا بھی شمار ہو[۱]

....

آخر فروری یا ابتداے مارچ میں دہلی جانے کا قصد ہے، ذوالفقار علی خاں صاحب سے اس کا وعدہ ہو چکا ہے۔ لاہور سے دہلی جاتے ہوئے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے اِن شاء اللہ جالندھر ٹھہروں گا[۲] وہاں سے ممکن ہوا تو سرکار خواجہ [نظام الدین] میں بھی حاضر ہوں گا۔[۳]

مَیں ابھی [۲/مارچ] تک علیل ہوں، کسی قدر افاقہ ضرور ہے۔ دو چار روز میں دہلی جانے کا قصد ہے کہ حکیم [نابینا] صاحب اور ڈاکٹر [مختار احمد] انصاری سے مشورہ کروں گا۔[۴]

....

دہلی گیا تھا، مگر جو دِن جالندھر کے لیے رکھا تھا، وہ وہیں دہلی نے لے لیا، حکیم صاحب نے باصرار ٹھہرا لیا۔[۵] نواب صاحب لوہارو سے ملاقات ہوئی تھی، مجھ سے شعر کی فرمائش کرتے تھے، مَیں نے عرض کیا کہ 'آپ کے سامنے شعر پڑھنا سوءِ ادب ہے'؛ بہر حال، کچھ نہ کچھ اشعار انھیں سنانے پڑے۔ تعجب ہے کہ لوگ مجھے شاعر سمجھ کر مجھ سے شعر کی فرمائش

۱: بنام شوکت علی شاہ، ۳/۱/۱۹۱۹ء، دوم، ۴۳
۲: بنام خان نیاز، ۵/۲/۱۹۱۹ء، دوم، ۵۰
۳: بنام شاد، ۲۶/۲/۱۹۱۹ء، دوم، ۶۱
۴: بنام گرامی، ؟/۲، ۳/۱۹۱۹ء، دوم، ۶۴
۵: بنام خان نیاز، ۱۳/۳/۱۹۱۹ء، دوم، ۶۶

کرتے ہیں، حالانکہ مجھے شاعری سے کچھ سروکار نہیں۔[۶]

دو دفعہ حضرت خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر بھی حاضر ہوا تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے بہت اچھی قوالی سنوائی۔[۷]

ہند کا داتا ہے تُو، تیرا بڑا دربار ہے　　　کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے[۸]

....

شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجے کے شعرا کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔[۹]

مجموعہ [کلام] اب تک مرتب نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ان تمام نظموں پر نظرِ ثانی کرنا چاہتا ہوں، جس کے لیے فرصت نہیں ملتی۔ اِن شاءاللہ بعد از نظرِ ثانی شائع کروں گا، اگرچہ مقصود اس شعر گوئی کا نہ شاعری ہے، نہ زبان۔[۱۰]

....

لاہور میں آج دو روز [۱۲/اپریل] سے ہڑتال ہے، دُکانیں بند ہیں اور شہر میں قبرستان کی خموشی ہے۔ الحمدللہ کہ امرتسر وغیرہ کی طرح یہاں کوئی ایسا فساد نہیں ہوا۔ [البتہ] ڈاک اور ریل کا نظام درست نہیں، اس واسطے خطوط نہیں پہنچتے۔ گوجرانوالہ میں، سنا ہے کہ فساد ہو گیا ہے اور کوئی پل توڑ دیا گیا ہے۔ مجھے آج [۱۵/اپریل کو] ایک مقدمے کے لیے پٹیالہ جانا تھا، ریل کا انتظام مخدوش ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ کل وہاں تار دے دیا تھا کہ ٹکٹ نہ ملتے تھے، غرضیکہ بڑی گڑبڑ ہے۔ ہر طرف سے وحشت ناک خبریں آ رہی ہیں۔ پہلے تو کچھ فساد ہوا اور چند لوگ مارے گئے، مگر اب شہر میں بالکل خموشی ہے اور لوگ دُکانیں نہیں کھولتے، اپنی ضد پر قائم۔ [اپنے بھتیجے] اعجاز کو مَیں نے پہلے سے منع کر دیا تھا اور کل پیغام بھی بھیجا تھا کہ وہ یہاں آ جائے اور مطالعہ کرے کہ بورڈنگ میں اسے تکلیف ہوتی ہو

۶: بنام گرامی، ۱۶/۳/۱۹۱۹ء، دوم، ۶۷
۷: بنام شاد، ۲۹/۳/۱۹۱۹ء، دوم، ۷۳
۸: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ۱۲۵
۹: بنام محمد احمد خاں، ۲۹/۳/۱۹۱۹ء، دوم، ۷۶
۱۰: بنام سلیمان ندوی، ۳/۴/۱۹۱۹ء، دوم، ۷۷-۷۸
۱۱: بنام شیخ نور محمد، ۱۴/۴/۱۹۱۹ء، دوم، ۸۱

گی۔ پرسوں رات امرتسر میں پھر شدید فساد ہوا ہے، بہت سے ریلوے اسٹیشنوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ اس وقت نظامِ عالم کا مطلع نہایت غبار آلود ہے اور معلوم نہیں، کیا واقعات ظہور پذیر ہوں گے۔[12] [بہرحال] گاندھی صاحب کا خاموش مقابلہ یہاں تک رنگ لایا ہے کہ حکام لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات میں مارشل لا (آئینِ عسکری) کے اجرا پر مجبور ہو گئے۔[13]

آج [۲۵/اپریل] آٹھ دِن سے مارشل لا، یعنی قانونِ عسکری یہاں جاری ہے۔ پنجاب کے دیگر اضلاع میں بھی گورنمنٹ یہی قانون جاری کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے قصور و امرتسر وغیرہ میں قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا، ان کو گرفتار کیا گیا ہے اور ان پر مقدمات چلائے گئے ہیں۔ کل سے ان کا ٹرائل بھی شروع ہے۔[14]

....

میرا ارادہ راماین کو اردو میں لکھنے کا ہے۔ مسیح جہانگیری نے راماین کے قصے کو فارسی میں نظم کیا ہے: افسوس ہے، وہ مثنوی کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔ میرے خیال میں اس کا تتبع کرنا بہتر ہوگا۔[15]

[اَسرارِ خودی کا] دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا، جیسا کہ مجھے بعض احباب کے خطوط سے اور دیگر تحریروں سے معلوم ہوا، جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ کیمبرج کے پروفیسر نکلسن [کا بھی خیال ہے کہ] دیباچہ دوسری ایڈیشن سے حذف نہ کرنا چاہیے تھا۔ انھوں نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرایا ہے، شاید انگریزی ایڈیشن کے ساتھ شائع کریں۔[16]

مَیں نے ایک تاریخ تصوف کی لکھنی شروع کی تھی، مگر افسوس کہ مسالہ نہ مل سکا اور ایک دو باب لکھ کر رہ گیا۔ پروفیسر نکلسن اسلامی شاعری اور تصوف کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں، جو عنقریب شائع ہوگی۔ ممکن ہے کہ یہ کتاب ایک حد تک وہی کام کر

۱۲: بنام شیخ عطا محمد، ۱۹۱۹/۴/۱۵ء، دوم، ۸۲-۸۳
۱۳: بنام اکبر، ۱۹۱۹/۴/۲۰ء، دوم، ۸۳-۸۴
۱۴: بنام شاد، ۱۹۱۹/۴/۲۵ء، دوم، ۸۵-۸۶
۱۵: ایضاً، ۸۶
۱۶: بنام اسلم جیراجپوری، ۱۹۱۹/۵/۱۷ء، دوم، ۹۳

دے، جو مَیں کرنا چاہتا تھا۔[17]

مثنوی [اَسرارِ خودی] کی دوسری ایڈیشن میں بعض بعض لفظی ترمیم ہے، بعض جگہ اشعار کی ترتیب میں فرق ہے اور ایک آدھ جگہ تشریحِ مطالب کے لیے اشعار کا اضافہ ہے، لیکن سب سے بڑی ترمیم یہ ہے کہ اس ایڈیشن سے وہ اشعار خارج کر دیے گئے ہیں، جو خواجہ حافظ پر لکھے گئے تھے۔ اگرچہ ان سے محض ایک ادبی نصب العین کی تنقید مقصود تھی اور خواجہ حافظ کی شخصیت سے کوئی سروکار نہ تھا، تاہم اس خیال سے کہ یہ طرزِ بیان اکثر احباب کو ناگوار ہے، مَیں نے ان اشعار کو نکال کر ان کی جگہ نئے اشعار لکھ دیے ہیں، جن میں اس اصول پر بحث کی ہے، جس کی رُو سے میرے نزدیک کسی قوم کے لٹریچر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا چاہیے۔[18]

۱۹۰۵ء میں مَیں جب انگلستان آیا تھا تو مَیں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دل فریبیوں اور دل کشیوں کے باوجود اُس رُوح سے خالی ہیں، جو انسانوں کے لیے امید، ہمت اور جراُتِ عمل کا پیغام ہوتی ہے، جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں، لیکن ان کے مقابلے کے لیے سائنس کھڑی تھی، جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی اور ۱۹۰۸ء میں [جب مَیں] انگلستان سے واپس گیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی، جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات سے میرے دل میں کشمکش شروع ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں رُوح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہیے۔ یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور مَیں اس میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ مَیں کیا کر رہا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور مَیں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہییں، لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہرحال، مَیں نے ۱۹۱۰ء میں

۱۷: بنام اسلم جیراجپوری، ۱۹۱۹/۵/۱۷ء، دوم، ۹۴

۱۸: دیباچۂ اسرارِ خودی اشاعتِ دوم

اپنے خیالات کو مدِ نظر رکھ کر اپنی مثنوی اسرارِ خودی لکھنی شروع کی۔ اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ بعض اصحاب خیال کرتے رہے ہیں کہ فارسی زبان مَیں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں، حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ مَیں نے اپنی مثنوی اسرارِ خودی ابتداً صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض [یہ] تھی کہ جو خیالات مَیں باہر پہنچانا چاہتا ہوں، وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر [کا سینہ] چیر کر یورپ پہنچ جائے گی۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دل کشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور مَیں اسی زبان میں شعر کہتا رہا۔[19]

....

مَیں امتحان کے پرچوں میں مصروف رہا، اِن شاءاللہ جون کے آخر سب کاموں سے فراغت ہو جائے گی۔ امید ہے، جون کے آخر پرچے بھی ختم ہو جائیں گے۔[20]

....

مختار [بیگم] لدھیانہ گئی ہے اور آٹھ دس روز میں آئے گی، اس کا انتظار کرنا ہوگا۔ دونوں ملازم بھی اپنے اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں، پیچھے مکان کی حفاظت کے لیے ایک آدمی کا رہنا ضروری ہے، اس کے لیے علی بخش نے ہشیار پور خط لکھا ہے، اس کا بھی انتظار ہے۔ نوکر تو لاہور سے بھی شاید مل جاتا، مگر ایسا آدمی پیچھے چھوڑنے کی ضرورت ہے، جو قابلِ اعتبار ہو۔ جہاں ایک دفعہ گھر بن جائے، وہاں سے اٹھنے کے لیے سو انتظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ماہِ جولائی کے مقدمات کا بھی انتظام کرنا ہے، وہ بھی کسی کے سپرد ہو جائیں تو یہاں سے ہل سکوں۔ یہ بھی خیال ہے کہ جولائی کے مہینے میں تو مَیں نے چھٹی کر لی، آگے دو ماہ کے لیے کچہری چھٹی کر دے گی، گویا تین ماہ بے کاری کے ہوں گے۔[21]

19: گفتارِ اقبال، ۲۴۹-۲۵۲

20: بنام شیخ نور محمد، ۹/۶/۱۹۱۹ء، دوم، ۹۹

21: بنام شیخ نور محمد، ۲۰/۶/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۰۲

پٹیالہ کے مقدمے سے فارغ ہو کر مَیں آج [۲۶/جولائی] صبح واپس آ گیا ہوں۔ مقدمے میں بھی کامیابی ہوئی۔ یہ وہاں کے ایک پیرزادہ خاندان کا مقدمہ تھا، جو تمام ریاست میں مشہور تھا۔ اب ۲۸/جولائی کو لاہور میں ایک مقدمہ ہے، اس سے فارغ ہو کر اِن شاء اللہ ۳۰/جولائی کو [والد صاحب کے ہاں] حاضر خدمت ہونے کا قصد ہے۔[22]

....

بڑی سعی سفارش سے گاڑی سیالکوٹ تک ریزرو [reserve] کرائی تھی، مگر عین وقت پر، جب کہ ہم لوگ اسٹیشن پر جا چکے تھے، ریل والوں نے جواب دے دیا کہ گاڑی بوجہ ملٹری افسروں کے آ جانے کے نہیں دی جا سکتی، چنانچہ رات کے ایک بجے مَیں مع عیال اسٹیشن سے واپس آیا اور اس قدر روحانی اور جسمانی تکلیف ہوئی کہ بیان میں نہیں آ سکتی۔ یہ تکلیف اس قدر ہمت شکن ہے کہ اب ریلوے سفر کی دوبارہ ہمت مجھ میں باقی نہیں ہے۔[23]

[سیالکوٹ نہ جا سکنے کی وجہ سے] فریقین [یعنی گھر والوں اور والد مکرم] کو سخت تکلیف ہوئی، مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ دوسرے روز ایک مقدمہ مل گیا، جس میں معقول فیس مل گئی۔ اگر مَیں گاڑی میں سوار ہو جاتا تو اس سے محروم رہتا۔[24]

....

پیچش کی وجہ سے صاحب فراش ہوں۔ چونکہ اس موسم کی پیچش کے بڑھ جانے کا امکان ہے، اس واسطے آج صبح اس کا ٹیکہ لگوالیا ہے۔[25]...... [سردار بیگم] بھی تندرست ہے۔ اس کی گردن و بازو پر گرمی دانے نکلے تھے، جو بڑھ کر پھوڑے بن گئے کہ ان میں پانی پڑ گیا تھا، اب اسے بھی بالکل آرام ہے۔[26]

....

کوٹھی کی تلاش میں ہوں، تعویق اس وجہ سے ہوئی کہ کوٹھی موقع پر نہیں ملتی اور جو

۲۲: بنام شیخ نور محمد، ۲۶/۷/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۰۷
۲۳: بنام شیخ اعجاز احمد، ۳/۸/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۰۸
۲۴: بنام شیخ اعجاز احمد، ۷/۸/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۰۹
۲۵: بنام شیخ اعجاز احمد، ۱۱/۸/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۱۲
۲۶: بنام شیخ اعجاز احمد، ۱۶/۸/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۱۴

کوٹھیاں موقع پر ہیں، ان کے مالک ہندو ہیں، جو قدرتی طور پر ہندو کرایہ داروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ کوٹھی نہ ملنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ کم بخت ...... نے وعدہ کیا اور بعد میں بدعہدی کرکے، جو آج کل کے مسلمانوں کا عام شیوہ ہے، کوٹھی کسی اَور کو دے دی۔[۲۷]

....

کئی ماہ کے بعد صرف تین اشعار لکھے تھے، نقیب کا عرصے سے تقاضا تھا، اس کو بھیج دیے۔ مَیں تو اپنے اشعار کو چنداں وقعت نہیں دیتا، لیکن جب ایڈیٹر معارف [سید سلیمان ندوی] ان کے لیے تقاضا کرتے ہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان میں کچھ ہو۔[۲۸]

....

حیدرآباد کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں، افواہاً مَیں نے بھی کئی دفعہ سنا ہے کہ وہاں اقبال کا تذکرہ ہے، مگر مجھ تک کبھی کوئی باقاعدہ اطلاع نہیں آئی، نہ مَیں نے خود کوئی درخواست آج تک کی۔[۲۹]

....

مدت سے یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی؛ معلوم نہیں، ...... [سید سلیمان ندوی] کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ واقعات صاف اور نمایاں ہیں، مگر ہندوستان کے سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے کہ لندن کے ...... [پرنس آغا خاں] کے اشارے پر ناچتے چلے جاتے ہیں۔ افسوس!

بہت آزمایا ہے غیروں کو تُو نے
مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

۲۷: بنام شیخ اعجاز احمد، ۱۹۱۹/۸/۲۹ء، دوم، ۱۱۹
۲۸: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۱۹/۹/۱۷ء، دوم، ۱۲۸-۱۳۰
۲۹: ایضاً، ۱۳۰

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے

مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

مرا از شکستن چنیں عار ناید

کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اصل فارسی شعر میں 'دیگراں' کی جگہ 'ناکساں' ہے، مَیں نے یہ لفظی تغیر ارادۃً کیا ہے۔[30]

....

اب کے موسمِ گرما یہیں لاہور میں گزرا۔ کشمیر جانے کا قصد تھا، مگر یارانِ طریقت ہم سفر نہ ہو سکے، اکیلے سفر کرنا اقبال سے ممکن نہیں، ع...... اکیلے لطفِ سیرِ وادیِ سینا نہیں آتا۔ آج تعطیلاتِ گرما ختم ہو گئیں، موسمِ سرما کا آغاز ہے، لاہور میں چہل پہل ہے اور رونق شروع ہو رہی ہے۔ کالج طلبہ سے معمور ہو گئے، بازاروں میں طلبہ کے جھنڈ پھر نظر آنے لگے؛ غرض خدا خدا کر کے گرمی کا خاتمہ ہوا۔[31]

....

مَیں ایک مغربی شاعر [گوئٹے] کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں، جس کا قریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی، کچھ اردو میں۔ [مجوزہ اردو مجموعہ] کلام کا بہت سا حصہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے، لیکن اَور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ اِدھر توجہ کر سکوں، تاہم جو کچھ ممکن ہے، کرتا ہوں۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس! اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں، اُن کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں، اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجے کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں۔ موجودہ حالات میں میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے

۳۰: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۱۹/۹/۲۷ء، دوم، ۱۳۰-۱۳۱   ۳۱: بنام شاد، ۱۹۱۹/۱۰/۷ء، دوم، ۱۳۴

لیے سید سلیمان ندوی کا دل و دِماغ صرف ہو، لیکن اگر احباب تبصرہ پر مُصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعے کا انتظار کیا جائے۔ اس کے علاوہ، مَیں اپنے دل و دِماغ کی سرگذشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دِلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔[۳۲]

....

مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ...... [نیاز] میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، جب انھوں نے میرے بعض خطوط ایک کتاب میں شائع کر دیے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی، کیونکہ خطوط ہمیشہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور اُن کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے، جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں، مگر اشاعت ان کی نظر ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ، مَیں پرائیویٹ خطوط کے طرزِ بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپروا ہوں۔[۳۳]

....

مسئلہ خلافت ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے، اس خیال سے کہ اس مسئلے کے متعلق مسلمانوں کو امر بالمعروف کرنا میرا فرض ہے، جلسے میں چلا گیا۔ سیکرٹری شپ انجمن حمایت اسلام کے لیے مَیں کوئی کوشش نہیں کر رہا، مسلمان پبلک میرے سپرد یہ کام کرنا چاہتی ہے اور مَیں نے بعض معززین سے وعدہ کیا ہے کہ اگر عبدالعزیز صاحب مستعفی ہو جائیں تو مَیں یہ کام اپنے ذِمے لے لوں گا۔ اس سے زیادہ میری اَور کوئی کوشش نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ مقصود جاہ طلبی اور نام و نمود نہیں۔ اگر عبدالعزیز صاحب نے یہ کام چھوڑ دیا تو مَیں، جہاں تک میرے بس میں ہوگا، کام کروں گا۔[۳۴]

....

۳۲: بنام سلیمان ندوی، ۱۰/۱۰/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۳۷-۱۴۰ ۳۳: بنام خان نیاز ۱۹/۱۰/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۴۵
۳۴: بنام خان نیاز، ۹/۱۱/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۴۶-۱۴۷

۲۳/دسمبر کو دہلی جاؤں گا، وہاں سے ۲۵ یا ۲۶/ کو واپس ہوتا ہوا ایک آدھ روز کے لیے...... [خان نیاز الدین] کی خدمت میں بھی ٹھہر جاؤں گا، بشرطیکہ صحت اچھی رہی۔ سردی کا سفر بہ سبب ضعفِ گردہ میرے لیے مضر ہوتا ہے۔ مولانا اکبر الہ آبادی دہلی میں ہیں اور آخر دسمبر تک قیام کریں گے، اُن کی زیارت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ فقیر سید نجم الدین صاحب کے لڑکے کی شادی ہے، وہ اصرار کر رہے ہیں؛ اگر مولانا اکبر کی کوشش نہ ہوتی تو فقیر صاحب سے معافی مانگ لیتا۔[۳۵]

....

مولانا ابوالکلام کا تذکرہ بہت دلچسپ کتاب ہے، مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ 'اقبال کی مثنویاں تحریکِ الہلال ہی کی آوازِ بازگشت ہیں'۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات مَیں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر انگریزی و اردو موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہ تھیں۔ بہر حال، اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے، نہ [کہ] نام آوری؛ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ اُن کے خیال میں اقبال تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، تحریکِ الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے؛ ممکن ہے، ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی، مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضرور نہیں کہ اَوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے، اُن میں اور مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے'۔ معلوم نہیں، انھوں نے کیا سنا تھا اور سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھنا، جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں، جو اصلاح کے علم بردار ہوں۔[۳۶]

۳۵: بنام خان نیاز، ۹/۱۱/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۴۷ ۳۶: بنام سلیمان ندوی، ۱۰/۱۱/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۴۸-۱۵۱

میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، جو اَوروں کے لیے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں، خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت ہوگئی تو لکھوں گا، فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔[۳۷]

مَیں جو اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ مَیں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوای دِماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے، اگر یہ قوی دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسولؐ کی مَیں کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ والد مکرم مجھے دینی علوم پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اَور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہر حال، جو کچھ خدا کے علم میں تھا، ہُوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا، مَیں نے کیا؛ لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہُوا، اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا اور زندگی تمام و کمال نبی کریمؐ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی۔[۳۸]

....

لاہور کے مسلمانوں نے ایک عام جلسہ میں یہ قرار دیا کہ جشن صلح میں شرکت نہ کی جائے۔ مَیں بھی اس جلسے میں شریک تھا۔ پولیٹکل جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوا کرتا، اس جلسے میں اس واسطے شریک ہوا کہ ایک بہت بڑا مذہبی مسئلہ زیرِ بحث تھا۔[۳۹] تقریر، جو اُس جلسے میں مَیں نے کی تھی، وہ ایک ریزولیشن کی تائید یا شاید تحریک میں تھی، مسئلہ خلافت پر نہ تھی؛ مذہبی پہلو اس [کا] حرمین کی حفاظت سے تعلق رکھتا ہے۔[۴۰]

....

مولانا اکبر غالباً ۲۳ [دسمبر] سے پہلے ہی الٰہ آباد چلے جائیں گے، کیونکہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ مَیں نے بھی اُن کی زحمت کے خیال سے زور نہیں دیا کہ وہ دہلی میں میری

۳۷: بنام وحید احمد مسعود، ۲۷/۱۱/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۵۴
۳۸: بنام کریم بی بی، ۸/۱۲/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۵۷-۱۵۸
۳۹: بنام شاد، ۱۵/۱۲/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۵۸-۱۵۹
۴۰: بنام خان نیاز، ۱۹/۱۲/۱۹۱۹ء، دوم، ۱۶۰

آمد تک قیام فرمائیں[۴۱]۔ فقیر صاحب کے لڑکے کی برات کے ہمراہ مَیں نہیں جا سکا۔ اُس روز بارش اور سردی اس شدت سے تھی کہ سفر کی جرأت نہ ہوئی[۴۲]۔ اندیشہ تھا کہ اس سے کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ ٹرینوں کا رَش، سفر ممکن نہ تھا۔[۴۳]

۴۱: بنام خان نیاز، ۱۹۱۹/۱۲/۱۹ء، دوم، ۱۶۱
۴۲: بنام خان نیاز، ۱۹۱۹/۱۲/۲۵ء، دوم، ۱۶۱
۴۳: بنام شیخ عطا محمد، ۱۹۱۹/۱۲/۲۵ء، دوم، ۱۶۲

۱۹۲۰ء

چوبیس گھنٹے میں صرف ایک دفعہ کھاتا ہوں اور تمام ثقیل اور دیر ہضم چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں[1]

....

[گرامی] مجھ پر ناراض ہیں کہ مَیں نے خلافت کمیٹی سے کیوں استعفا دے دیا۔ جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبروں کا مقصد تھا، اس کے اعتبار سے تو اس کمیٹی کا وجود میری راے میں مسلمانوں کے لیے خطرناک تھا[2]

....

اگر...... [حافظ عطا محمد] چاہیں تو مَیں اُن کی لڑکی [اپنی اہلیہ کریم بی بی] کا حق مہر ادا کرنے کو تیار ہوں۔ اپنے ذِمے ماہواری رقم رکھنی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ بہر حال، اگر یہی خیال ہے کہ اس کو ماہواری تنخواہ دے دی جائے تو مَیں حاضر ہوں کہ اس کو تیس روپے مہینے دے دیا کروں، بشرطیکہ میرے ساتھ اَور کوئی تعلق ان کا نہ رہے اور نہ وہ مجھے کبھی خط وغیرہ لکھیں۔ جس قدر وہ اپنے والدین کے ہاں رہی، اس کی تنخواہ کی وہ کسی طرح مستحق نہیں، کیونکہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی اور باوجود ہمارے روکنے کے، سیالکوٹ میں نہ رہی؛ لیکن مَیں وہ رقم بھی دے دوں گا، اگر مذکورہ بالا شرط پر وہ قائم رہیں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اگر وہ حق مہر لینا چاہے تو پھر شرعی طور پر قطع تعلق ہو جائے۔ اگر وہ ایسا کرنا پسند نہ کرے تو مَیں اسے تیس روپے ماہوار، جب تک زندہ ہوں، دے دیا کروں گا۔ جتنا عرصہ وہ اپنے والدین

۱: بنام گرامی، ۴/۱/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۶۳ ۲: بنام خان نیاز، ۱۱/۲/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۶۴

کے ہاں رہی ہے، اس کے الاؤنس کی وہ مستحق نہ ہوگی، کیونکہ وہ خود چلی گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ معاملہ کسی تیسرے آدمی کی وساطت سے طے ہونا چاہیے۔[3]

....

مَیں ایک طویل سفر کے بعد پرسوں لاہور آیا ہوں۔ ایک مقدمے کے ضمن میں آرہ (صوبہ بہار) گیا ہوا تھا۔ اب تو کچھ عرصے تک مزید سفر کی ہمت نہ ہوگی۔[4]

ایک نوکر کی ضرورت ہے۔ میرا پرانا نوکر مہر الٰہی ہشیار پور سے آ گیا تھا، مگر پھر چلا گیا اور اس کے بھائی اسے آنے نہیں دیتے۔ اگر سیالکوٹ سے کوئی آدمی ایسا مل جائے، جس پر اعتبار ہو سکے تو بہت عمدہ ہے۔ احموں کہیں نہ کہیں سے پیدا کر دے گا۔ کام کچھ نہیں، صرف مکان کو صاف رکھنا اور حاضر باشی۔ مہر الٰہی آٹھ روپیہ ماہوار لیتا تھا اور کھانا۔[5]

....

انجمن [حمایت اسلام] کے حالات ......، مَیں خود اس قسم کے جھگڑوں سے علیحدہ رہا اور ہمیشہ سے میرا یہی شیوہ ہے، مگر جب عامۃ مسلمین مجھ سے کسی خدمت پر اصرار کریں تو انکار نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک میری بساط ہوگی، اِن شاءاللہ کام کیا جائے گا۔ چندے کے اعتبار سے اس جلسے کو بڑی کامیابی ہوئی، حالانکہ کام کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں ملا۔[6]

....

قریباً چار ماہ کا عرصہ ہوا کہ مجھے ایک گمنام خط آیا، جس کا مضمون یہ تھا کہ 'نبی کریم کے دربار میں تمھاری ایک خاص جگہ ہے، جس کا تم کو کچھ علم نہیں۔ اگر تم فلاں وظیفہ پڑھا کرو تو تم کو بھی اس کا علم ہو جائے گا'۔ وہ وظیفہ خط میں درج تھا، مَیں نے اس خیال سے کہ وہ گمنام تھا، اس کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ اب وہ خط میرے پاس نہیں ہے؛ معلوم نہیں، رڈی میں مل ملا کر کہاں چلا گیا۔ پرسوں کا ذکر ہے کہ کشمیر سے ایک پیرزادہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ اس کی عمر قریب تیس پینتیس سال کی ہوگی۔ شکل سے شرافت کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو

3: بنام شیخ عطا محمد، ۶/۳/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۶۶-۱۶۹
4: بنام خان نیاز، ۹/۳/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۶۹
5: بنام شیخ عطا محمد، ۷/۴/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۷۱
6: بنام خان نیاز، ۱۰/۴/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۷۳

سے ہشیار، سمجھ دار اور پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا؛ مگر پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی گفتگو کرے، مجھ کو دیکھ کر بے اختیار زار و قطار رونے لگا۔ مَیں نے سمجھا کہ شاید مصیبت زدہ ہے اور مجھ سے کوئی مدد مانگتا ہے۔ استفسارِ حال کیا تو کہنے لگا کہ 'کسی مدد کی ضرورت نہیں، مجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔ میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی، اب مَیں اُن کی پنشن کھا رہا ہوں۔ رونے کی وجہ خوشی ہے، نہ غم'۔ مفصل کیفیت پوچھنے پر اُس نے کہا کہ نوگام میں، جو میرا گاؤں سری نگر کے قریب ہے، مَیں نے عالمِ کشف میں نبی کریمؐ کا دربار دیکھا۔ صف نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو حضور سرورِ کائناتؐ نے پوچھا کہ محمد اقبال آیا ہے یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ محفل میں نہیں تھا۔ اس پر ایک بزرگ کو اقبال کے بلانے کے واسطے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مَیں نے دیکھا کہ ایک جوان آدمی، جس کی داڑھی منڈی ہوئی تھی اور رنگ گورا تھا، مع اُن بزرگ کے صفِ نماز میں داخل ہو کر سرورِ کائناتؐ کے دائیں جانب کھڑا ہوا۔

پیرزادہ صاحب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے مَیں آپ کی شکل سے واقف نہ تھا، نہ نام معلوم تھا۔ کشمیر میں ایک بزرگ مولوی نجم الدین صاحب ہیں، جن کے پاس جا کر مَیں نے یہ سارا قصہ بیان کیا تو انھوں نے آپ کی بہت تعریف کی۔ وہ آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعے جانتے ہیں، گو انھوں نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں۔ اُس دِن سے مَیں نے ارادہ کیا کہ لاہور جا کر آپ سے ملوں گا۔ سو محض آپ کی ملاقات کی خاطر مَیں نے کشمیر سے سفر کیا ہے اور آپ کو دیکھ کر مجھے بے اختیار رونا اس واسطے آیا کہ مجھ پر میرے کشف کی تصدیق ہو گئی، کیونکہ جو شکل آپ کی مَیں نے حالتِ کشف میں دیکھی، اس سے سرِ مُو فرق نہ تھا۔ اس ماجرا کو سن کر مجھ کو معاً وہ گمنام خط یاد آیا۔ مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اور روح نہایت کرب و اضطراب کی حالت میں ہے کہ مَیں نے کیوں وہ خط ضائع کر دیا۔ اب مجھ کو وہ وظیفہ یاد نہیں، جو اُس خط میں لکھا تھا۔ پیرزادہ صاحب کہتے ہیں کہ آپ کے متعلق مَیں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ آپ کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے، بالکل صحیح ہے، کیونکہ میرے اعمال تو اس قابل نہیں ہیں۔ ایسا فضل ضرور ہے کہ دُعا کا ہی نتیجہ

ہو؛ لیکن اگر حقیقت میں پیرزادہ صاحب کا کشف صحیح ہے تو میرے لیے لاعلمی کی حالت سخت تکلیف دہ ہے۔[7]

مَیں نے نبی کریمؐ کو مخاطب کر کے ایک قصیدہ لکھنا شروع کیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ ختم ہو جائے۔ عرشی امرتسری نے چند شعر لکھ کر میرے زخم کو چھیڑ دیا ہے۔ اُن کا معمولی جواب تو مَیں نے زمیندار میں شائع کر دیا تھا، اصل جواب ابھی باقی ہے۔ ابھی چند اشعار ہی لکھے ہیں، مگر اُن کے لکھتے وقت قلب کی جو حالت ہوئی، اس سے پہلے عمر بھر کبھی نہ ہوئی تھی۔ دو شعر:

بہرِ نذرِ آستانت از عجم آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

تیغِ لا در پنجۂ این کافرِ دیرینہ دہ
باز بنگر در جہان ہنگامۂ الّائے من[8]

روحانی کیفیات کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ نبی کریمؐ کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ مَیں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔ دنیا کے حالات اور عام لوگوں کے حالات ایسے ہی ہیں۔ عام لوگوں کی نگاہ بہت تنگ ہے۔ اُن میں سے بیشتر محض حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں، اسی واسطے مولانا روم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ چراغ لے کے تمام شہر میں پھرا کہ کوئی انسان نظر آئے، مگر نظر نہ آیا۔ اور موجودہ زمانہ تو روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے، اسی واسطے اخلاص، محبت و مروّت و یکجہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم قوم کی دشمن ہے۔ یہ زمانہ انتہائی تاریکی کا ہے، لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ نورِ محمدی عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔[9]

....

۷: بنام شیخ نور محمد، ۱۹۲۰/۴/۲۳ء، دوم، ۱۷۷-۱۷۵

۸: بنام خان نیاز، ۱۹۲۰/۵/۱۸ء، دوم، ۱۷۹

۹: بنام شیخ نور محمد، ۱۹۲۰/۶/۳ء، دوم، ۱۸۲-۱۸۱

افسوس ہے کہ کوئی اچھا مکان رہنے کو نہیں ملتا۔ موجودہ مکان میں جوان لوگ تو باآسائش رہ سکتے ہیں، بوڑھوں کو تکلیف ہے، ورنہ میری خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصہ...... [والد مکرم] میرے پاس بسر کرتے۔[۱۰]

....

آموں کی کشش علم سے کچھ کم نہیں، یہ بات بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ کھانے پینے کی چیزوں [میں] صرف آم ہی ایک ایسی شے ہے، جس سے مجھے محبت ہے۔ کل سردار جوگندر سنگھ، ایڈیٹر East & West ملنے آئے تھے، کہتے تھے کہ لکھنؤ سے بھجواؤں گا اور ساری فصل بھجواتا رہوں گا۔[۱۱]

....

ایران کے فلسفے پر مَیں نے ایک کتاب لکھی تھی محض ایک خاکہ تھا، جسے بعد میں پُر کرنے کا مقصد تھا، مگر وقت نے مساعدت نہ کی۔[۱۲]

افسوس کہ قصیدہ ابھی تک ختم نہ ہوا، البتہ کچھ شعر اَور ہو گئے ہیں۔ کیا کِیا جائے، یک سرو ہزار سودا؛ لیکن جو کچھ میرے دل میں ہے، وہ کاغذ میں آ گیا تو واقعی وہ قصیدہ ایسا ہی ہوگا کہ اسے وظیفہ میں داخل کیا جائے۔[۱۳]

جولائی میں عدالت بند ہونے پر مجھے شاید کلکتہ یا الٰہ آباد جانا ہوگا، کیونکہ وہاں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی کانفرنس ہے اور پنجاب یونیورسٹی نے مجھے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔[۱۴]

اَسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ، جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے، تیار ہو کر پبلشر کے پاس چلا گیا ہے۔ امید ہے، دو چار ماہ میں شائع ہو جائے گا۔ پروفیسر نکلسن نے یہاں ایک پروفیسر کو خط لکھا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کے خیالات most original and remarkable ہیں۔ اُن کو یقین ہے کہ ترجمہ مقبول ہوگا۔[۱۵]

۱۰: بنام شیخ نور محمد، ۳/۶/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۸۱
۱۱: بنام خان نیاز، ۱۰/۶/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۸۳
۱۲: بنام خان نیاز، ۱۱/۵/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۷۸
۱۳: بنام خان نیاز، ۱۰/۶/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۸۴
۱۴: ایضاً، ۱۸۳-۱۸۴
۱۵: ایضاً، ۱۸۴

گرمی کی شدت ہے، اب تک صرف گیارہ روزے رکھ سکا ہوں۔[16]

وسط ایشیا کی ہانڈی اُبل رہی ہے، خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ کونٹ ٹالسٹائی (روسی امیر، جس نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی اور جو اس ملک کے بہترین مصنفین میں تھا) کا خیال تھا کہ 'لالۂ آتش نژاد' منگولین قوم سے پیدا ہوگا اور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس کا خروج یا ظہور کب ہوگا اور وہ اس وقت روس میں ہے یا وسط ایشیا میں یا شام میں۔[17]

....

اسرارِ خودی کا انگلستان میں خوب چرچا ہو رہا ہے۔ انگریزی ترجمہ موسمِ سرما میں شائع ہوگا، اِس وقت پریس میں ہے۔ مسٹر محمد علی نے ایک پبلک ڈنر میں، جس میں ایرانی و ترک و عرب تھے، تقریر کرتے ہوئے اس کے اشعار سنائے تو وہ لوگ محوِ حیرت و استعجاب ہو گئے۔ اس امر کی تفصیلی کیفیت اخبار بمبئی کرانیکل میں چھپی ہے۔[18]

...... [نکلسن] نے وہاں کی لٹریری سوسائٹیوں میں اس کتاب کے مضمون پر متعدد لیکچر دیے ہیں، جس کی وجہ سے اس نئے فلسفے کا وہاں بڑا چرچا ہے۔ اب مَیں گوئٹے کے دیوان کے جواب میں ایک فارسی دیوان لکھ رہا ہوں، جس کا ایک تہائی حصہ لکھ چکا ہوں۔ اسرارِ خودی کا ترجمہ یورپ کی اَور زبانوں میں بھی ہو جائے تو تعجب نہیں۔ مَیں نے سنا ہے کہ فرانس میں بھی اس کا چرچا ہے۔ یہ غالباً پروفیسر نکلسن کے لیکچروں کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیوان کا ترجمہ بھی ضرور ہوگا، کیونکہ یورپ کی دِماغی زندگی کے ہر پہلو پر اس میں نظر ڈالی گئی ہے اور مغرب کے سرد خیالات و افکار میں کسی قدر حرارت ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔[19]

....

مَیں ایک روز دانت کے درد سے لاچار رہا، مسوڑا پھول گیا تھا، آخر ڈاکٹر کے نشتر نے

16: بنام خان نیاز، ۱۰/۶/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۸۴
17: ایضاً
18: بنام گرامی، ۱۹/۷/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۹۴-۱۹۵
19: بنام محمد اکبر منیر، ۴/۸/۱۹۲۰ء، دوم، ۲۰۱

آرام دیا۔[20]

....

سندھی مہاجرین کا بل کا نظارہ بڑا رقت انگیز تھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں اسٹیشن پر اُن کے استقبال کو حاضر تھے۔ اہل لاہور نے بڑے جوش سے اُن کا خیر مقدم کیا۔[21] ہندوستان اور بالخصوص پنجاب سے بے شمار (مسلمان) لوگ افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اس وقت تک پندرہ بیس ہزار آدمی (اور ممکن ہے کہ زیادہ) جا چکا ہوگا۔[22]

....

[گاندھی کہتے ہیں کہ] 'جامعہ ملیہ اسلامیہ [دہلی] آپ کو آواز دے رہی ہے کہ اگر آپ اسے اپنے ہاتھ میں لے لیں تو آپ کی فاضلانہ قیادت میں یہ ترقی کر سکے گی۔ حکیم اجمل خاں کے علاوہ علی برادران کی بھی یہی خواہش ہے۔'[23] مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر، جن کا ذکر ضروری نہیں اور شاید اس وقت ممکن بھی نہیں ہے، ان حضرات کی آواز پر، جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے، لبیک کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ اگرچہ مَیں قومی تعلیم کے شدید حامیوں میں سے ہوں، لیکن ایک تو یونیورسٹی کی رہنمائی کے لیے مجھ میں وہ صلاحیتیں نہیں ہیں، جو مختلف کشمکشوں اور رقابتوں کی صورت میں ابتدائی مراحل میں پیدا ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ فطری طور پر مَیں پُرسکون حالات میں کام کر سکتا ہوں۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ہم جن حالات سے دوچار ہیں، ان میں سیاسی آزادی سے قبل معاشی آزادی ضروری ہے اور معاشی اعتبار سے ہندوستانی مسلمان دوسرے فرقوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ بنیادی طور پر انھیں ادب اور فلسفہ کی نہیں، بلکہ تکنیکی تعلیم کی ضرورت ہے اور اس قسم کی تعلیم پر ان حضرات کو اپنی تمام تر کوششیں مرکوز کرنی چاہییں۔ جن حضرات نے جامعہ ملیہ قائم کی ہے، انھیں چاہیے کہ اس نئے ادارے میں خصوصی طور پر طبیعی علم کے ساتھ ساتھ تکنیکی پہلوؤں پر بھی زور دیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی مذہبی تعلیم کا بھی انتظام

۲۰: بنام گرامی، ۱۹/۷/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۸۸
۲۱: بنام گرامی، ۱۲/۷/۱۹۲۰ء، دوم، ۱۸۹
۲۲: بنام محمد اکبر منیر، ۴/۸/۱۹۲۰ء، دوم، ۲۰۱
۲۳: کلیاتِ مکاتیبِ اقبال دوم، ۲۱۷

کریں، جن کو وہ مناسب سمجھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عالمِ اسلام، بالخصوص عرب ملکوں اور مقدس مقامات میں جو واقعات پیش آئے ہیں، ان کے پیشِ نظر ہندوستانی مسلمان کسی نہ کسی قسم کا عدم تعاون اختیار کرنے میں حق بجانب ہوں گے، لیکن تعلیم کا مذہبی پہلو میرے ذہن میں ہنوز غیر واضح ہے اور مَیں نے پورے مسئلہ پر بحث و مباحثہ کے لیے اپنی تجاویز شائع کر دی ہیں۔ مَیں شریعت کا ماہر نہیں ہوں، لیکن جہاں تک تعلیم کا سوال ہے، موجودہ مجبوریوں کے تحت فقہ اسلام ہماری مناسب رہنمائی کرنے سے معذور نہیں ہے۔[۲۴]

....

انجمن [حمایت اسلام] سیکرٹری شپ سے مَیں نے استعفا ضرور دیا تھا، مگر کام اب تک کر رہا ہوں اور جب تک استعفا منظور نہ ہو، کرتا رہوں گا۔ امید ہے کہ عوام کی حالتِ جنوں اب زیادہ دیر تک نہیں رہے گی۔[۲۵]

....

مَیں مجموعہ [کلام] مرتب کر رہا ہوں، کچھ نظموں کی نظرثانی باقی ہے۔ بعض دولت مند دوستوں نے اسے نہایت عمدہ کاغذ پر چھاپنے کا تہیہ کیا ہے۔ ان کی خواہش ہے، روپیہ وہ خرچ کریں اور فائدے تمام و کُل مَیں اُٹھاؤں، دل اس کے قبول کرنے میں متامل ہے۔[۲۶]

۲۴: بنام گاندھی، ۲۹/۱۱/۱۹۳۰ء، دوم، ۲۱۶-۲۱۸   ۲۵: بنام خان نیاز، ۳/۱۲/۱۹۳۰ء، دوم، ۲۱۹

۲۶: بنام ضیاء الدین، ۲۳/۱۲/۱۹۳۰ء، دوم، ۲۲۰

۱۹۲۱ء

کئی سال ہوئے، مَیں نے ایک کتاب یورپ میں خریدی تھی، مگر آج تک اس کے پڑھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اِن تعطیلوں میں اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا آغاز اور اختتام یہ فقرہ ہے، 'میری کوئی چیز نہیں اور میرے لیے تمام اشیا کا وجود عدم برابر ہے'۔ یہ ساری کتاب اسی جملے کی تشریح ہے اور حقیقت میں بہت خوب ہے۔ حقیقی شخصیت یہی ہے کہ انسان اپنی اصلی حقیقت کا خیال کر کے تمام تعلقات سے آزاد ہو جائے، یعنی بالاتر ہو جائے۔[1]

....

[اَسرارِ خودی] شائع ہوئی تو یہاں کے صوفیہ نے اس پر اعتراض کیا کہ کتاب کا مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات سکھاتا ہے اور ان کو فرنگیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ مغرب والے مترجم نے دیباچے میں یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک زبردست آواز ہے، جو مسلمانوں کو محمدؐ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں صداقت کی آگ ایسی ہے کہ ہم اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔[2]

انگلستان اور امریکا کے اخباروں میں عجیب و غریب ریویو اس پر شائع ہو رہے ہیں۔ اس وقت تک تین ریویو میری نظر سے گزرے ہیں۔ مَیں نے سنا ہے کہ پچاس ریویو شائع ہو چکے ہیں۔ نکلسن (مترجم کتاب) نے جو دیباچہ لکھا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ یورپ کے پڑھے لکھے آدمیوں میں، امید نہیں کہ یہ کتاب مقبول ہو، کیونکہ زندگی کے اعتبار سے وہ ممالک خود پیری کی منزل تک پہنچنے کو ہیں۔ نوجوان ملکوں پر اس کا اثر یقینی ہے یا ایسی

۱: بنام شیخ نور محمد، ۳/۱/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۲۳   ۲: ایضاً، ۲۲۴

اقوام پر، جن کو خدا تعالیٰ نئی زندگی عطا کرے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اس کی اشاعت ایک اَور کتاب کے لیے، جو مَیں لکھ رہا ہوں، زمین تیار کر دے گی۔ اس کا یورپ میں مقبول ہونا بہت ممکن ہے، گو ہندوستان میں شاید وہ بھی قبول نہ ہو۔ بہر حال، یہ محض قیاسات ہیں، قلوب کے حال کا سوائے خدا کے، اَور کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔[3]

بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے، جو میرے اور نطشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے، دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ *The Athenaeum* والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کیے گئے، وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں، لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ اس نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے، اگر اسے ان کی صحیح تاریخِ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشو و نما کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا نہ وہ انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خلطِ مبحث کر کے میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ مَیں نے آج سے قریباً بیس سال قبل انسانِ کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے، جب نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا، نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گزری تھیں۔ یہ مضمون *Indian Antiquary* میں شائع ہوا۔ جب ۱۹۰۸ء میں مَیں نے ایرانی الہیات پر ایک کتاب لکھی تو اس کتاب میں اس کو شامل کر لیا گیا۔[4]

میرا عقیدہ ہے کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری و ساری ہے، لیکن مَیں یہ نہیں مانتا کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہوگی، جو وقت کا تابع ہوگا۔ اس بات میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل و اعلیٰ انسان کے پیکرِ خاکی میں ظاہر ہوگی۔[5]

مَیں روحانی قوت کا تو قائل ہوں، لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم

۳: بنام خان نیاز، ۲۱/۱/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۲۶ ۴: بنام نکلسن، ۲۴/۱/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۲۷-۲۲۸

۵: ایضاً، ۲۲۸-۲۲۹

کو حق وصداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رُو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے، لیکن مَیں اُن تمام جنگوں کو مردُود سمجھتا ہوں، جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو؛ لیکن معاہدے، لیگیں، پنچایتیں اور کانفرنسیں استیصالِ حرب نہیں کر سکتیں ...... ہمارے عہد نامے اور پنچایتیں جنگ و پیکار کو صفحہ حیات سے محو نہیں کر سکتیں۔ کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کر سکتی ہے اور اس شعر میں مَیں نے اسی کو مخاطب کیا ہے:

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح

میرے عقیدے میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے، جو تصادم کے واسطہ سے ربط و امتزاج پیدا کر کے ’کُل‘ کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں اور یہ تصادم لامحالہ ان کی شیرازہ بندی اور ارتباط پر منتج ہوگا۔ دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے علو وارتقا کے لیے تصادم نہایت ضروری ہے۔ میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاعِ گراں مایہ ہے، جس کے حصول پر انسان کو اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دینا چاہییں۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں عمل کی تمام صور و اشکال مختلفہ کو، جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے، ضروری سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے؛ چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر مَیں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو، جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو، مردُود قرار دیا ہے۔ مَیں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں، بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں، حالانکہ اس باب میں نطشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے۔ میرے نزدیک اس نوع کے انقلاب کا زمانہ ابھی بہت دُور ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ یورپ کی جنگِ عظیم میں انسان کی بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ پنہاں ہے، وہ اس سے عرصۂ دراز تک متمتع نہ ہو سکے گا۔[6]

۶: بنام نکلسن، ۲۴/۱/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۲۔ ۲۳۳

انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطبِ اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے، جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔ اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اُسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن مَیں اس چیز کا سخت مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہر اتم قرار دیا جائے، کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لیے موزوں واقع ہوئی ہے۔ میری قوتِ طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے، جس کا مبین مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اَور تو اَور، وقت کے متعلق برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لیے نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں، بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اَور بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات کے ہی مسائل سے ہے۔ عہد جدید کا ایک مسلمان اہلِ علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے، جن کا مبدأ اور سرچشمہ قرآنِ مجید ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی

سے اہلِ مغرب اسلامی فلسفے سے ناآشنائے محض ہیں۔ اے کاش! مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ مَیں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔[7]

اَسرارِ خودی کے ریویو انگریزی زبان میں ہیں۔ جو کچھ ہندوستان میں ہوا، وہاں بھی ہو رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ؛ مگر بحیثیت مجموعی وہاں کے لوگ اس کے خیالات کو بہت اچھا جانتے ہیں۔ مترجم کا خط آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ کتاب کا استقبال اس ملک میں بہت اچھی طرح ہوا، گو بعض خیالات کے متعلق بعض ریویو لکھنے والوں کو غلط فہمی ہوئی۔ ایسا ہونا یقینی ہوتا ہے، کیونکہ طبائع میں اختلاف ہے، خصوصاً جب کہ زندگی پر ایک نئے نقطہ خیال سے نگاہ ڈالی جائے۔ غرضیکہ جتنے منہ، اتنی باتیں۔ امریکا کے اخبارات یہاں نہیں آتے، ان میں بھی اس قسم کے خیالات ہوں گے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہو جانے میں خدا کی حکمت معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے اس کتاب کے مقاصد کے پورا ہونے میں بڑی مدد ملے گی۔[8]

اَسرارِ خودی پر انگلستان اور امریکا کے اخباروں میں ریویو عجیب و غریب شائع ہو رہے ہیں۔ دیکھیں، جرمنی اور دیگر ممالک اس کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں۔[9]

حقیقت میں مَیں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی نسبت دنیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں اور نہ کبھی مَیں نے seriously اس طرف توجہ کی ہے۔ مقصود تو بیداری سے تھا، اگر بیداریِ ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں۔[10]

....

اس مردود [آفتاب اقبال] نے مجھے تو خط لکھنے کی جرأت نہیں کی؛ نہ معلوم، والد مکرم کو کیوں خط لکھا۔ ہم کو تو اس کے ولایت جانے کی بھی اطلاع نہیں۔ حافظ صاحب [عطا محمد]

۷: بنام نکلسن، ۲۴/۱/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۳۳-۲۳۷
۸: بنام شیخ عطا محمد، ۲۸/۱/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۳۷-۲۳۸
۹: بنام شیخ عطا محمد، ۲۱/۷/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۶۷
۱۰: بنام وحید احمد مسعود، ۳۰/۸/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۶۹

کو اطلاع ہو گی یا انھوں نے اسے خرچ اخراجات کا یقین دِلایا ہو گا۔ آج کل تو ولایت اسی کو جانا چاہیے، جس کے پاس بالکل فضول روپیہ ہو۔ مس بک کا خط مجھے آیا تھا، مَیں نے اسے جواب دے دیا۔ جو طریق اس نے اختیار کیا ہے، یہ نیا نہیں، بلکہ اس کی پرانی چال ہے اور جو بیماری اسے ہے، وہ بھی اس کی بداعمالی اور بے باکی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔[11]

....

جموں کے مقدمے میں تاریخ ۱۸/مارچ ملی تھی، مگر مَیں اس تاریخ پر نہ جا سکتا تھا۔ وسط اپریل کی تاریخ طلب کی، جو نہ ملی۔ اس اثنا میں ایک مقدمہ شملہ کا مل گیا۔ ایک ہفتہ وہاں رہنا ہو گا۔ یہ مقدمہ وسط اپریل میں ہو گا۔ اس کے بعد ریاست کی طرف سے مجھے تار ملا کہ آپ کی خواہش کے مطابق وسط اپریل ہی کی تاریخ مقرر ہو گی۔ اب مشکل ہے کہ شملہ کا مقدمہ قبول کر چکا ہوں، آج کشمیر سے ملزموں کی طرف سے خط ملا ہے کہ ریاست سے استدعا کیجیے کہ مقدمہ سری نگر میں ہو، آنے جانے کا خرچ مؤکل ادا کر دیں گے۔ بہر حال، دیکھیں، کس طرح ہو سکتا ہے۔ معاملہ معلومہ کے متعلق سلسلہ چل رہا ہے، مگر چیف منسٹر صاحب جموں سے جا رہے ہیں۔ مہاراجا اپنی ریاست میں بھی اصلاحات جاری کرنے والے ہیں، جن کا اعلان عنقریب ہو گا۔ اگر چیف منسٹر کی جگہ سردار جوگندر سنگھ چلے گئے تو خوب ہو گا۔ معاملات پر بہت غور و فکر کرنے کے بعد بھی آخر انھیں تقدیر کے سپرد ہی کرنا پڑتا ہے۔ انسانی علم و عقل ذرا ذرا سی بات میں اپنی کمزوری اور عجز کا معترف ہے۔[12]

جموں کے مقدمے کی تاریخ کشمیر میں مانگی تھی، مگر ریاست نے نہیں دی۔ ۱۸/اپریل مقرر کی ہے، مگر اس تاریخ کو مجھے شملہ جانا ہو گا، اسی واسطے یہ مقدمہ واپس ہی کرنا پڑے گا۔[13]

مَیں نواب ارشاد علی خاں صاحب کے مقدمے کے لیے شملہ گیا ہوا تھا، وہاں سے دس روز کے بعد[14] بخیریت واپس آ گیا، وہاں کام خدا کے فضل سے اچھا ہو گیا، اب چار پانچ اور

۱۱: بنام شیخ عطا محمد، ۱۰/۳/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۳۹-۲۴۰
۱۲: ایضاً، ۲۴۰
۱۳: بنام شیخ عطا محمد، ۳۰/۳/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۴۸
۱۴: بنام خان نیاز، ۲۳/۴/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۵۳

سات تاریخ کو ان مقدمات پر بحث ہو گی؛ اِن شاء اللہ امید کامیابی کی ہے۔[15] کل [۲۸/اپریل کو] پٹیالہ جاؤں گا، تیس [اپریل] کو واپس پہنچوں گا۔[16]

آج کل امتحان کے پرچوں کا بھی زور ہے اور کچہری کا کام بھی۔[17]

تبدیلِ ہوا کے لیے [جولائی میں] شملہ چلا گیا تھا، مگر وہاں جاتے ہی طبیعت اَور بگڑ گئی۔ چار پانچ روز کے بعد واپس آ گیا۔ اب خدا کے فضل سے کسی قدر اچھا ہوں۔[18]

....

......[اکبر] کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں، وہ نہایت پُرمعنی اور مفید ہوتے ہیں۔ ان کو جمع کر لینا چاہیے، تاکہ آئندہ نسلیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بڑی ضرورت ہے کہ ایک منشی کاغذ اور قلم دوات لے کر......[اکبر] کے پاس ہر وقت بیٹھے اور جو بات فرمائیں، اسے نوٹ کر لے۔ اگر مَیں الٰہ آباد میں قیام کر سکتا تو وہ کام کرتا، جیسا باسویل Boswel نے ڈاکٹر جانسن کے لیے کیا تھا۔[19]

....

اِس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے، جب مَیں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا، اُس وقت یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے، کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگذشت قلم بند کروں گا، جس سے مجھے یقین [ہے] بہت لوگوں کو فائدہ ہو گا۔ اُس دِن سے، جب یہ احساس مجھے ہوا، آج تک برابر اپنی تحریروں میں یہ ہی خیال میرا مطمحِ نظر رہا ہے۔ معلوم نہیں، میری تحریروں نے اَور لوگوں پر اثر کیا یا نہیں کیا، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس خیال نے میری زندگی پر حیرت انگیز اثر کیا ہے۔[20]

....

۱۵: بنام شیخ عطا محمد، ۲۴/۴/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۵۴

۱۶: بنام شیخ عطا محمد، ۲۷/۴/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۵۵

۱۷: بنام شیخ نور محمد، ۵/۵/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۵۶

۱۸: بنام وحید احمد مسعود، ۳۰/۸/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۶۹

۱۹: بنام اکبر، ؟/؟/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۷۱-۲۷۲

۲۰: بنام وحید احمد مسعود، ۷/۹/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۷۱

ابھی زمیندار سے میرے مرشد (معنوی) [اکبر الہ آبادی] کے انتقالِ پُر ملال کی خبر معلوم ہوئی، انَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن۔ اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ ان سے آخری ملاقات نہ ہو سکی۔ مَیں اور میرے ایک دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے تو ان کی زیارت کے لیے الہ آباد کا سفر کریں۔ انھوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا بھی تھا کہ امسال ضرور ملنا، بعض باتیں ایسی ہیں کہ خطوط میں نہیں سما سکتیں۔ میری بدنصیبی ہے کہ مَیں ان کے آخری دیدار سے محروم رہا۔ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت قریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔ اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قسم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ زمانہ سیکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے، جب جا کے ایک اکبر اسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش! اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لیے کچھ عرصے اَور جاری رہتا۔[21]

آخرِ ماجیب تمنا تھی...... [گرامی کے] اس مصرع نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ اکبر مرحوم کے انتقال سے پہلے ہی میری طبیعت افسردہ ہو رہی تھی، اس مصرع نے نشتر کا کام کیا۔ اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے۔ وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے، مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیت میں بلند تھا۔ اس بات کی خبر شاید ان کے عزیزوں کو بھی نہ تھی۔ یوں تو کئی سالوں سے ان کے وقت کا بیشتر حصہ قرآن پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کی زندگی رفیقِ اعلیٰ سے ملنے کے لیے ایک تڑپ تھی، مگر گذشتہ دو سال سے تو وہ موت کے بہت متمنی تھے۔ کوئی خط ایسا مشکل سے ہوگا، جس میں انھوں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا ہو۔ ایک انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے، زندگی سے محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ طویل العمری سے عروسِ حیات سے ہمارا اختلاط بڑھتا رہتا ہے اور اختلاط کا نتیجہ اُنس ہے۔ بہر حال، وجہ کچھ بھی ہو، مَیں نے تو یہ کلیہ مولانا اکبر مرحوم کی صورت میں صحیح نہ پایا۔[22]

۲۱: بنام عشرت حسین، ۱۹۲۱/۹/۱۳، دوم ۲، ۲۷۲۔ ۲۷۳   ۲۲: بنام گرامی، ۱۹۲۱/۹/۱۶، دوم ۲، ۲۷۳۔ ۲۷۴

سالِ گذشتہ نقرس نے بہت پریشان و مضمحل رکھا، اِمسال اگست میں ایک مقدمے کے لیے کشمیر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں سے اسی مرض میں مبتلا ہو کر واپس آیا۔ اب خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں، گو طبیعت میں وہ چستی و چالاکی باقی نہیں رہی، جو پہلے تھی۔[23]

....

زمانے نے مساعدت کی تو گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا قصد ہے۔ فیضی کا فارسی ترجمہ، فیضی کے کمال میں کس کو شک ہو سکتا ہے، مگر اس ترجمے میں اس نے گیتا کے مضامین اور اس کے اندازِ بیان کے ساتھ بالکل انصاف نہیں کیا، بلکہ میرا تو یقین ہے کہ فیضی گیتا کی روح سے نا آشنا رہا۔[24]

....

ناگپور میں ایک بزرگ مولانا تاج الدین نام ہیں، حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی سے ان کی بڑی تعریف سنی ہے اور لاہور کے ایک اَور دوست بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد ہے۔ چشتی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے میں بیشتر حصہ مجذوبانہ حالت میں رہتے ہیں، مگر سنا ہے کہ رات کے دو بجے کے بعد سے صبح تک ان کے فیضان کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ حیدرآباد میں کوئی مولوی یا منشی محمد اسماعیل صاحب ان کے پیر بھائی ہیں۔ غرض کہ جن جن ذرائع سے معلوم ہوا، آدمی قابلِ زیارت ہیں[25]۔ میرا قصد بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے۔ بعض وجوہ سے تجدیدِ بیعت کی ضرورت پیش آئی ہے۔ بہر حال، اگر مقدر میں ہے تو اِن شاء اللہ ان سے مشکل کا حل ہوگا۔ آج کل خواجہ حسن نظامی صاحب کو بھی خط لکھا ہے، اگر وہ بھی ہم سفر ہو گئے تو مزید لطف رہے گا۔[26]

....

خلافت کمیٹیوں کے بعض ممبر ہر جگہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ وہ بظاہر جوشیلے مسلمان

۲۳: بنام شاد، ۱۱/۱۰/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۸۱
۲۴: ایضاً، ۲۸۲
۲۵: ایضاً
۲۶: بنام شاد، ۲۷/۱۰/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۸۶

معلوم ہوتے ہیں، لیکن در باطن اخوان الشیاطین ہیں؛ اسی وجہ سے میں نے خلافت کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے استعفا دے دیا تھا۔ اس استعفے کے وجوہ اس قابل نہ تھے کہ پبلک کے سامنے پیش کیے جاتے، لیکن اگر پیش کیے جاسکتے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوتی [27]

۲۷: بنام شیخ عطا محمد، ۱۴/۱۲/۱۹۲۱ء، دوم، ۲۹۰-۲۹۱

۱۹۲۲ء

میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں اور اِس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اُسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں، جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے، لیکن اِس زمانے میں تو اِس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دِماغوں کو ناگوار ہوگا، اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔[1]

مَیں حال میں...... [ملا صدرالدین شیرازی] کی کتاب مُلّا صدرا کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اگر وقت نے مساعدت کی تو ان کے خیالات پر کچھ لکھوں گا بھی۔[2]

عرصے سے میرا ارادہ ایک انٹرنس کورس فارسی ترتیب دینے کا ہے۔ جدید فارسی نظم ونثر کے کچھ عمدہ اور آسان نمونے مل جائیں تو یہاں کے طلبہ کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ میرا مقصود یہ ہے کہ فارسی کے ذریعے سے بھی جدید خیالات اور احساسات طلبۂ ہند تک پہنچیں۔[3]

چند روز ہوئے، مولانا گرامی لاہور آئے ہوئے تھے۔ ان سے چند روز صحبت رہی اور شعر واشعار کا خوب چرچا رہا۔[4]

....

مسلمانوں کو آج کل کسی قدر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ وقت دُور نہیں، جب اس شک میں ہمارے ہم وطن بھی انگریزوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ اس وقت تو بالعموم انھی مسلمانوں کو ملازمت کے لیے پسند کیا جاتا ہے (خاص کر اعلیٰ ملازمتوں کے لیے)، جن کی اسلامیت حکومت کے خیال میں کمزور ہو اور اس کمزوری کا نام وسعت

۱: بنام خان نیاز، ۱۴/۱/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۱۴
۲: بنام محمد اکبر منیر، ۳۰/۱/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۲۲
۳: ایضاً
۴: بنام شاد، ۳/۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۲۳

خیال یا لبرلزم رکھا جاتا ہے۔[5]

عدم تعاون روز افزوں ہے اور گورنمنٹ تشدد پر آمادہ ہے۔ زمانۂ حال کی طبیعت میں ہیجان و اضطراب ہے؛ معلوم نہیں، باطنِ فطرت میں کیا کیا اسرار ہیں، جو ظہور پذیر ہوں گے۔[6]

....

ترکوں کے ساتھ اتحادیوں کا جو عہد نامہ [سیورے] ہوا تھا، اس کی رُو سے مقاماتِ مقدسہ فلسطین و شام کے لیے ایک کمیشن مقرر ہونے والی ہے، جس کے ممبر مسلمان، عیسائی و یہودی ہوں گے۔ گورنمنٹ نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آیا مَیں اس کمیشن کا ممبر بننا قبول کر سکتا ہوں۔ اس کمیشن کے اجلاس مقامِ یروشلم میں ہوں گے اور دو تین سال میں متعدد بار یہاں سے یروشلم جانا پڑے گا۔ بعد کامل غور آج مَیں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مَیں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔[7] خان نیاز الدین صاحب ...... لکھتے ہیں کہ فلسطین کے سفر کے لیے ضرور جانا چاہیے، مگر ان کو سب حالات معلوم نہیں۔[8] [سچی بات تو یہ ہے کہ] مالی مشکلات سے مجبور ہو کر مجھے یہ آفر نامنظور کرنی پڑی۔ یہ رائل کمیشن ہوگی اور رائل کمیشن کے ممبروں کو قاعدے کی رُو سے سوائے اخراجاتِ سفر کے اَور کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ چونکہ میں دولت مند آدمی نہیں اور یہ کام قریباً دو سال جاری رہے گا اور اجلاس کے لیے ہر سال فلسطین جانا پڑے گا، اس واسطے مجبوراً با دلِ نخواستہ مجھے انکار کرنا پڑا۔ سید حسن امام بھی ایک ایسی ہی کمیشن پر گئے تھے، مگر وہ وسائلِ مالی کے اعتبار سے اس کام کو نبھا سکتے تھے، میرے حالات مختلف ہیں۔ مجھ سے ایک بہت بڑی مالی قربانی کے بغیر، جس کا میں حالاتِ موجودہ میں متحمل نہیں ہو سکتا، یہ کام نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے پھر اصرار ہو، لیکن مَیں نے تمام مشکلات کا حل صحیح صحیح لکھ دیا ہے۔[9]

....

۵: بنام اعجاز احمد، ۱۹/۱/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۱۶

۶: بنام محمد اکبر منیر، ۳۰/۱/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۲۲۔۳۲۳

۷: بنام گرامی، ۹/۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۲۸

۸: بنام گرامی، ۱۷/۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۳۲

۹: بنام شاد، ۲۲/۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۳۴۔۳۳۵

مولانا شاہ تاج الدین کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، البتہ پیغام مراقبے کے ذریعے سے بھیجا ہے، مگر اقبال کے طلیفون [ٹیلی فون] کی مشین ناقص ہے؛ دیکھیں، پیغام وہاں پہنچتا بھی ہے یا نہیں[10]۔ [اِدھر] میرا طلیفون خراب ہے اور اُدھر شانِ بے نیازی ہے، تاہم جواب کی توقع ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جواب پہنچے گا اور کیا عجب کہ...... [شاد] تک پہلے پہنچے۔ اگر شاہ تاج الدین کا پیغام مجھ تک پہلے پہنچ گیا تو اِن شاء اللہ عرض کر دوں گا۔ ایک اَور جگہ سے بھی ایسے ہی پیغام کی توقع ہے۔[11]

....

مجھے یہ معلوم کر کے کمال مسرت ہوئی کہ...... [مجھور کاشمیری] تذکرۂ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں۔ مَیں کئی سالوں سے اسے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں، مگر افسوس، کسی نے اِدھر توجہ نہ کی۔ افسوس ہے، کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی اور نیز مسلمانانِ کشمیر کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیِ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی تلاش وحفاظت کے لیے ایک سوسائٹی بنا لیں؟ ہاں، شعرائے کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی شعر العجم پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ محض حروفِ تہجی کی ترتیب سے شعرا کا حال لکھ دینا کافی نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بارآور ہوگی اور کبھی خود کشمیر میں یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اس کا کورس میں ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عن قریب پلٹا کھانے والی ہے۔[12]

....

پہلے کی نسبت اب کچھ افاقہ ہے۔ اب کے اچھا ہو لوں تو اِن شاء اللہ سیر سحر گاہی کا التزام کروں گا۔[13] [فی الحال تو] چلنے پھرنے سے قاصر ہوں۔ انگریزی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، آج [۲۳/مارچ] سے حکیم اجمل خاں صاحب کی دوا شروع کی ہے، جو کل دہلی سے آئی ہے۔ آج پندرہ روز ہو گئے کہ مکان سے نیچے نہیں اُتر سکا اور ابھی خدا جانے، یہ قید کتنے

۱۰: بنام شاد، ۳/۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۲۳
۱۱: بنام شاد، ۲۲/۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۳۳-۳۳۴، ۳۳۵
۱۲: بنام مجھور کاشمیری، ۱۲/۳/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۳۷-۳۳۸
۱۳: بنام خان نیاز، ۱۸/۳/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۴۰

روز باقی ہے۔[14]

مَیں ابھی [۲/اپریل] تک علیل ہوں، گو پہلے کی نسبت بہت افاقہ ہے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے دہلی سے دوا بھیجی تھی، مگر اس سے بھی بہت کم فائدہ ہوا۔ کل گورداسپور سے ایک حکیم صاحب خود بخود تشریف لے آئے تھے۔ انھیں کسی سے میری علالت کا حال معلوم ہوا تھا۔ دوا دے گئے ہیں، جس سے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوا سے فائدہ ہو جائے گا، کیونکہ جن اجزا سے یہ مرکب ہے، ان میں سے ایک اخلاص بھی ہے، جو اِن حکیم صاحب کو خود بخود میرے مکان تک لے آیا۔[15]

مَیں تو اپنے آپ کو اس درد کی وجہ سے رفتنی سمجھتا تھا، مگر محض اس خیال سے تسکین تھی کہ پاؤں کا درد ہے، حرکت محال ہے: رفتنی نہیں، آمدنی ہوں۔[16]

اس دفعہ مجھے دردِ نقرس (گوٹ) کی وجہ سے سخت تکلیف رہی، کامل دو ماہ چارپائی سے اُتر نہیں سکا۔[17] اب [۲۰/اپریل کو] کچھ افاقہ ہوا ہے۔[18]

....

کل بمبئی سے ایک عرب کا خط آیا ہے، جو اَسرارِ خودی کو عربی میں ترجمہ کرنا چاہتا ہے اور اس کی اجازت مانگتا ہے۔ مَیں نے اسے اجازت دے دی ہے۔[19]

....

مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے۔ میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلالِ اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔ ہندوستان میں بظاہر مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد امن و سکون ہے، مگر قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے۔ اتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخِ اُمم میں بے نظیر ہے۔ ہم لوگ، جو انقلاب سے خود متاثر ہونے والے ہیں، اس کی

۱۴: بنام گرامی، ۲۳/۳/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۴۱

۱۵: بنام گرامی، ۲/۴/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۴۱۔ ۳۴۳

۱۶: ایضاً، ۳۴۳

۱۷: بنام محمد اکبر منیر، ؟/؟/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۵۴

۱۸: بنام سلیمان ندوی، ۲۰/۴/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۴۹

۱۹: بنام گرامی، ۲/۴/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۴۳

عظمت اور اہمیت کو اس قدر محسوس نہیں کرتے، آئندہ نسلیں اس کی تاریخ پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گی۔ ایشیا کی مسلمان اقوام کی حرکت بھی کم حیرت انگیز نہیں۔ کیا عجب کہ اس نئی بیداری کو ایک نظر دیکھنے کے لیے مَیں بھی جولائی یا اگست کے مہینے میں ایران جا نکلوں۔ میرے ایک دوست سردار جوگندر سنگھ، ایڈیٹر East & West اصرار کر رہے ہیں کہ اُن کے ساتھ کوئٹہ کے رستے ایران چلوں۔ اگر ممکن ہو سکا تو ضرور اُن کا ساتھ دوں گا۔ چونکہ میری فطرت کو ایران سے ایک مناسبت خاص ہے، ممکن ہے، وہاں کی آب و ہوا کا اچھا اثر مجھ پر ہو۔[۲۰]

....

اردو نظم 'خضرِ راہ' مَیں نے حال میں لکھی[۲۱]، انجمن [حمایت اسلام] کے جلسے میں پڑھی، ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہو گئی تھی[۲۲]۔ اس نظم کا بیشتر حصہ خضر کی زبان سے ادا ہوا ہے اور خضر کی شخصیت ایک خاص قسم کی شخصیت ہے۔ وہ عمر دوام کی وجہ سے سب سے زیادہ تجربہ کار آدمی ہے اور تجربہ کار آدمی کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی قوتِ متخیلہ کم ہوتی ہے اور اس کی نظر حقائقِ واقعی پر جمی رہتی ہے۔ اس کے کلام میں اگر تخیل کی رنگینی ہو تو وہ فرض رہنمائی کے ادا کرنے سے قاصر رہے گا۔ پس اس کے کلام میں پختگی اور حکمت تلاش کرنی چاہیے، نہ [کہ] تخیل۔ اور خاص کر اس حالت میں، جب کہ اس سے ایسے معاملات میں رہنمائی طلب کی جائے، جن کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو۔ قرآن شریف کی سورہ کہف [میں] خدا تعالیٰ نے خضر کی اس خصوصیت کو کس خوبی سے ملحوظ رکھا ہے۔ ایک سطحی نظر سے دیکھنے والا آدمی تو کشتی توڑنے اور ایک بچے کو قتل کر ڈالنے یا ایک یتیم کی دیوار کو گرا دینے☆ میں کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھے گا اور شریعت تو اس تمام قصے میں مطلق نہیں؛ لیکن غور کرنے پر خضر کے افعال کی حکمت معلوم ہوتی ہے۔[۲۳]

۲۰: بنام محمد اکبر منیر، ؟/؟/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۵۳-۳۵۴ ۲۱: ایضاً، ۳۵۴

۲۲: بنام سلیمان ندوی، ۱۴/۵/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۵۶ ۲۳: بنام گرامی، ۱۶/۵/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۶۱

☆ اصل واقعہ یوں ہے کہ انھوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی، جو گرا چاہتی تھی تو (خضر نے) اس کو سیدھا کر دیا۔ (۱۸: ۷۱-۸۲)

جنابِ خضر کی پختہ کاری، ان کا تجربہ اور واقعات و حوادثِ عالم پر ان کی نظر، ان سب باتوں کے علاوہ ان کا اندازِ طبیعت اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند مَیں نے خود نکال دیے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جنابِ خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اَور نظم کا حصہ بن جائیں گے۔[۲۴]

گوئٹے کے دیوان کے جواب میں پیامِ مشرق مَیں نے لکھی ہے، جو قریب الاختتام ہے۔ امید ہے، اس سال کے اختتام سے پہلے شائع ہو جائے گا۔[۲۵] اس کے دیباچے میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ فارسی لٹریچر نے جرمنی لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے۔[۲۶]

....

مَیں نے بوجہ خرابیِ صحت استعفادے دیا ہے، اب میرا کوئی تعلق انجمن [حمایتِ اسلام] سے نہیں ہے۔ دردِ نقرس کی وجہ سے دو ماہ صاحبِ فراش رہا اور اب بھی اس درد کے کچھ اثرات باقی ہیں۔ صحت پر اعتماد نہیں رہا، مشاغل کم کر رہا ہوں۔[۲۷]

تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیے اور ہر قسم کا فکر دل سے نکال دینا چاہیے۔ خدا تعالیٰ کارساز ہے اور انسان کا فکر ہی اس کے لیے باعث آزار ہے۔ انسان کو اپنی صحت کی حالت کے مطابق اپنے فرائض کی ادا میں کوتاہی نہ کرنا چاہیے اور نتائج خدا کے سپرد کر دینے چاہییں۔[۲۸]

مَیں امتحانوں کے پرچوں میں سخت مصروف رہا، یہ کام ابھی تک جاری ہے اور غالباً پندرہ بیس روز اَور جاری رہے گا۔ اَوروں کی نسبت میرے پاس کام بھی زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ دیگر یونیورسٹیوں کے پرچے بھی ہوتے ہیں۔ بہرحال، خدا کے فضل و کرم سے اب کام کچھ ہلکا ہو چلا ہے۔[۲۹]

۲۴: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۲۲/۵/۲۹ء، دوم، ۳۷۰

۲۵: بنام محمد اکبر منیر، ؟/؟/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۵۴

۲۶: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۲۲/۵/۱۴ء، دوم، ۳۵۶

۲۷: بنام اکبر شاہ، ۱۹۲۲/۵/۱۷ء، دوم، ۳۶۴

۲۸: بنام شیخ اعجاز احمد، ۱۹۲۲/۵/۲۱ء، دوم، ۳۶۶

۲۹: بنام گرامی، ۱۹۲۲/۵/۲۴ء، دوم، ۳۶۷

جولائی کے مہینے میں شملہ جانے کا ارادہ ہے۔ اب کے سال صحت خراب رہی، امید کہ وہاں کی آب و ہوا سے فائدہ ہوگا۔[30]

....

کچھ عرصہ ہوا، آفتاب کی ماں [کریم بی بی] نے مجھ کو خط لکھا تھا کہ پانچ سال کی تنخواہ [دو ہزار روپے[31]] مجھ کو پیشگی دے دی جائے، مگر مَیں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ آج اس کا خط کئی دِنوں کے بعد آیا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ اگر آپ مجھے پیشگی روپیہ نہیں دے سکتے تو میرا حق مہر دے دیا جائے۔ چونکہ یہ اس کا شرعی حق ہے، اس واسطے اس کی ادائیگی میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔[32]

....

مَیں شملہ سے بخیریت واپس آ کر ایک دو روز کے لیے لدھیانہ ٹھہرا تھا، مگر افسوس کہ وہاں مجھے نقرس کی پھر شکایت ہوگئی، اس واسطے اُسی شام لاہور چلا گیا۔ وہاں سے چند گھنٹے کا قیام کر کے سیالکوٹ چلا آیا، کیونکہ میرے بھائی صاحب کی علالت کی خبر آئی تھی۔ دوا کے متواتر استعمال سے نقرس کی شکایت رفع ہوگئی۔ جالندھر میں مولوی گرامی صاحب کی خدمت میں ٹھہرنے کا قصد تھا، مگر نقرس کی شکایت نے مجھے رستے میں ٹھہرنے نہ دیا، اندیشہ تھا کہ اگر شکایت زیادہ ہوگئی تو مولوی صاحب کے لیے باعثِ زحمت بن جاؤں گا۔ سیالکوٹ میں قریباً ایک ہفتے قیام رہے گا۔ ستمبر میں، ممکن ہے، پھر شملہ جاؤں۔[33]

....

تلخ تجربات سے گھبرانا نہ چاہیے، زندگی پر ان کا بھی restraining influence ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے ان کی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور رُوح کو ایذا پہنچتی ہے، تاہم بعد میں ان کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے اور انسان اس بات کے لیے شکر گزار ہوتا ہے کہ اس کو اس قسم کے تجربات ہوئے۔ جرمنی کے مشہور پیغمبری شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے

---

[30]: بنام گرامی، ۱۹۲۲/۵/۲۴ء، دوم، ۳۶۸

[31]: بنام شیخ اعجاز احمد، ۱۹۲۲/۶/۱۵ء، دوم، ۳۷۳

[32]: بنام شیخ عطا محمد، ۱۹۲۲/۶/۱۳ء، دوم، ۳۷۱-۳۷۲

[33]: بنام خان نیاز، ۱۹۲۲/۸/۱۷ء، دوم، ۳۸۷-۳۸۸

رُوحانی اضطراب و بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا:

Art still has truth
Take refuge there

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے، جو نپولین کے وقت جرمنی کی تھی۔ مَیں نے Art کی جگہ لفظ Religion رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے، آرٹ میں اطمینان ضرور ہے، مگر قوت نہیں ہے۔ مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں۔[۳۴]

مصطفیٰ [کمال] کی فتوحات کا چرچا ہر جگہ ہو رہا ہے، مگر قسم ہے خدا کی، یہ کچھ بھی نہیں اُس کے مقابلے میں، جو ہونے والا ہے۔ ممکن ہے، قسطنطنیہ کے لیے جنگ نہ ہو، کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز طرح دے جائیں گے۔ بعد میں اس کے عراق کی باری ہے، مگر میرا خیال ہے کہ یہاں بھی جنگ نہ ہوگی۔ انگریز اس ملک کو خالی کر دیں گے، البتہ فلسطین و مقاماتِ مقدسہ کا معاملہ بعد میں ذرا دیر بعد طے ہوگا اور وہی موقع اسلام کی حقیقی عظمت کا ہے۔ اسلامی دنیا کے حالات عجیب و غریب ہو رہے ہیں۔ اس وقت یخرج الحی من المیّت [۶:۹۵] کا نظارہ پیشِ نظر ہے۔[۳۵]

اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ آج چودہ یا شاید سولہ سال ہو گئے، جب مجھ کو اس زمانے کا احساس انگلستان کی سرزمین پر ہوا تھا۔ اُس وقت سے آج تک یہی دعا رہی ہے کہ بارِ الہا! اُس وقت تک مجھے زندہ رکھ۔ یہاں تک کہ اپنی بعض پرائیویٹ مشکلات کے متعلق بھی مَیں نے شاذ ہی دعا مانگی ہوگی۔[۳۶]

....

مَیں نے مکان بھی تبدیل کر لیا ہے، مرزا جلال الدین صاحب کے قریب ہے۔ ایک کوٹھی ایک سو ستر روپیہ ماہوار کرایے پر لے لی ہے۔[۳۷]

....

۳۴: بنام شیخ اعجاز احمد، ۱۹۲۲/۶/۱۵ء، دوم، ۳۷۲۔۳۷۳ ۳۵: بنام محمد حسین، ۱۹۲۲/۹/۲۳ء

۳۶: بنام شیخ عطا محمد، ۱۹۲۲/۹/۲۸ء، دوم، ۳۹۱ ۳۷: بنام گرامی، ۱۹۲۲/۱۰/۴ء، دوم، ۳۹۳

رات پھر ایک اور پیغام حضرت شاہ تاج کی خدمتِ بابرکت میں بھیجا گیا ہے۔ گذشتہ ہفتے دو نیاز نامے سرکار روالا [شاد] کی خدمت میں ارسال کر چکا ہوں، آج یہ تیسرا نیاز نامہ ہے۔ اقبال ممکن نہیں کہ شاد کو فراموش کر سکے اور حضرتِ شاد کو یوں بھی کوئی شخص آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔ پادشاہ ہیں، رموزِ مملکت کو خوب سمجھتے ہیں۔ ہم فقیروں کے نزدیک تو مصلحت یہی ہے اور یہی تقاضا حالاتِ حاضرہ کا بھی ہے کہ شاد دکن کے مدارالمہام ہوں۔ کیا عجب کہ یہی تقاضاے وقت و حالات، تقدیرِ الٰہی کے بھی مطابق ہو۔[۳۸]

....

کئی روز سے نزلہ کھانسی نے تنگ کر رکھا ہے۔ کل شام ہلکا سا بخار بھی ہو گیا تھا، مگر خیر گزری۔ اس وقت اچھا ہوں، نزلہ بدستور ہے[۳۹]۔ افسوس ہے کہ مَیں علی گڑھ نہ جا سکوں گا۔ سردی کا موسم [ہے] اور مجھے اس موسم میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔[۴۰]

....

اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کشمیر کے لوگوں میں خودداری کی رُوح پیدا کی جائے۔ مَیں نے بھی ایک نظم اس مضمون پر لکھی ہے، جو عنقریب فارسی مجموعے میں شائع ہو گی۔ افسوس ہے کہ مجھے تاریخ کشمیر سے بہت کم آگاہی ہے۔[۴۱]

'اسلام میں سیاست' چودہ سال ہوئے، انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا، یعنی ۱۹۰۸ء میں، جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا، جس کا نتیجہ آخر کار ۱۹۰۹ء میں عبدالحمید خاں کی معزولی ہوا۔ یہ مضمون لندن کے سوشیالوجیکل ریویو میں شائع ہوا تھا۔ پیسہ اخبار نے اس کا ترجمہ بہت غلط شائع کیا ہے۔ صحیح ترجمہ زمیندار میں شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ چودھری محمد حسین صاحب ایم اے سیکرٹری نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب نے کیا تھا، معتبر ہے۔[۴۲]

۳۸: بنام شاد، ۲۶/۱۰/۱۹۲۲ء، دوم، ۳۹۹
۳۹: بنام گرامی، ۱۰/۱۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۴۰۱
۴۰: بنام خان نیاز، ۱۶/۱۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۴۰۷
۴۱: بنام فوق، ۱۹/۱۲/۱۹۲۲ء، دوم، ۴۰۹
۴۲: ایضاً، ۴۱۰

۱۹۲۳ء

پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال نے مجھے بلا کے کہا کہ 'مجھ سے گورنمنٹ نے خطابات کے لیے سفارشیں طلب کی ہیں اور مَیں تمھارا نام 'خان بہادر' کے خطاب کے لیے تجویز کرنا چاہتا ہوں'۔ مَیں نے کہا، 'مَیں اپنے لیے کوئی خطاب نہیں چاہتا، آپ زحمت نہ فرمایئے'۔ وہ کہنے لگے، 'اس قدر جلد فیصلہ نہ کرو، بلکہ پہلے اچھی طرح غور کر لو'۔ مَیں نے کہا، 'مَیں غور کر چکا، مجھے خطاب کی ضرورت نہیں'۔ دو تین دِن کے بعد پھر سر شادی لال کا پیغام ملا کہ مجھ سے مل جاؤ۔ مَیں نے پیغامبر کی زبانی کہلا بھیجا کہ 'خطاب کے سلسلے میں مجھ سے گفتگو کرنا بے سود ہے، کیونکہ مَیں جو فیصلہ ایک بار کر چکا، سو کر چکا۔ ہاں، اگر کوئی اَور بات ہے تو مجھے آپ سے ملاقات کرنے میں کوئی عذر نہیں'۔ اس واقعے کو کچھ دِن گزرے تھے کہ میکلگن صاحب گورنر پنجاب نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے، 'آیئے، آپ کو اپنے ایک دوست سے ملواؤں'۔ ایک انگریز اُنھی دِنوں لاہور آیا تھا، اس نے میرا نام سن رکھا تھا، انگریزی میں اسرارِ خودی کا ترجمہ بھی پڑھا تھا۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی، اُس کے متعلق میری رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ غرض خاصی دیر تک صحبت رہی۔ جب مَیں رخصت ہونے لگا تو ایک شخص یہ پیغام لے کر آیا کہ گورنر صاحب نے کہا ہے، 'مجھ سے ملتے ہوئے جائیں'۔ مَیں اُن کے کمرے میں گیا تو انھوں نے کہا، 'اقبال! مجھے انتہائی افسوس ہے کہ گورنمنٹ نے تمھاری ادبی خدمات کا اعتراف کرنے میں تساہل روا رکھا ہے۔ مَیں اس وقت خطابات کی
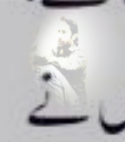
سفارش کر رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ 'نائٹ ہڈ' کے لیے تمھاری سفارش کی جائے، لیکن اس سے قبل معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں۔ [مَیں نے کہا] 'اسلام سماجی امتیازات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، لیکن اگر میرا یہ انکار گورنمنٹ کے[1] جذبات مجروح کرنے کا باعث ہو تو مجھے تامل نہیں'۔ میرے اس جواب سے میکلگن صاحب کے چہرے پر مسرت جھلکنے لگی۔ کہنے لگے، 'شمس العلما کے خطاب کے سلسلے اس دفعہ پنجاب کی باری ہے، مَیں نے چند سرکردہ مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ موزوں نام تجویز کریں۔ اگر تمھارے ذہن میں کوئی مناسب نام ہو تو بتاؤ'۔ مَیں نے کہا، 'اس شرط پر بتاتا ہوں کہ اس کے بعد کسی اَور نام پر غور نہ کیا جائے'۔ میکلگن صاحب نے اس اقرار سے پہلے کچھ تامل کیا اور پھر کہا، 'اچھا، تم نام بتاؤ'۔ مَیں نے اپنے استاد مولوی سید میر حسن (پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ) کا نام لیا۔ میکلگن صاحب فرمانے لگے، 'اس سے قبل یہ نام نہیں سنا۔ اچھا، یہ بتایئے کہ انھوں نے کون کون سی کتابیں تصنیف کی ہیں؟' ...... [مَیں نے کہا] کہ 'انھوں نے کوئی کتاب تو تصنیف نہیں کی، لیکن مَیں ان کی 'زندہ تصنیف' آپ کے سامنے موجود ہوں، جسے گھر سے بلا کر 'سر' کے خطاب کی پیشکش کی جا رہی ہے'۔ ایک شرط بھول گیا ہوں کہ اگر شمس العلما کے خطاب کی سفارش منظور ہو جائے تو میرے ضعیف العمر استاد کو یہ سند لینے کے لیے سیالکوٹ سے لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے'۔[2]

....

خطاب، جو مجھ کو دیا گیا ہے، اَسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے اور یورپ اور امریکا میں جو ریویو اس پر شائع ہوئے ہیں، ان کا نتیجہ ہے۔ اس کا کوئی سیاسی مفہوم نہیں ہے، نہ دنیا کی عزت و دولت مجھ ایسی فطرت والے آدمی کو اپیل کرنے والی چیزیں ہیں...... باقی رہی، ہندوستانی سیاست، سو مَیں فطرتاً اس کے لیے موزوں نہیں ہوں۔ عملی طور پر آج تک میرا کوئی سروکار اس سے نہیں رہا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ بات لٹریری مقاصد کی تکمیل میں

۱: روزگارِ فقیر، ۳۸ ۲: ایضاً، ۳۷

سدِ راہ ہے، جن کی تکمیل کے لیے امن و سکون کی ضرورت ہے، خصوصاً ایسے آدمی کے لیے، جس کی صحت اچھی نہیں رہتی۔[3]

سیکڑوں خطوط اور تار آئے اور آ رہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطر، جس کا ...... [میر سید غلام بھیک نیرنگ] کے قلب کو احساس ہوا؛ سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی، جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی، جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں، لیکن اس کا دل مومن ہے۔[4] یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا؛ ہاں، کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔[5]

....

میری صحت ایک مدت سے خراب ہے، اسی واسطے لٹریری مشاغل کی طرف بہت کم توجہ کر سکتا ہوں۔ پیامِ مشرق نام [سے] ایک مجموعہ نظم، جو فارسی میں ہے، تیار ہو رہا ہے؛ شاید دو تین ماہ تک شائع ہو جائے گا۔[6]

انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ مارچ کے آخر میں ہوگا۔ مَیں بھی اِن شاء اللہ ایک نظم پڑھوں گا، جس کا نام 'طلوعِ اسلام' ہوگا۔ خدا کرے، اُس وقت تک ختم ہو جائے۔[7]

رموزِ بے خودی کے ترجمے کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر امید نہیں کہ اس کا ترجمہ یورپ میں ہو کہ اُس کے مضمون سے یورپ والوں کو چنداں دلچسپی نہیں ہے۔ مسلمان ہی اس کا مفہوم سمجھ جائیں تو غنیمت ہے، البتہ پیامِ مشرق کا ترجمہ ہونا ممکن ہے، لیکن مجھے اس قدر فرصت نہیں کہ اس کا ترجمہ کروں۔ اگر اُن کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو خود کر لیں گے۔[8]

۳: عبدالواحد، ۱۹۲۳/۱/۲۸ء، دوم، ۳۲۱، ۳۲۲-۳۲۳

۴: بنام نیرنگ، ۱۹۲۳/۱/۴ء، دوم، ۴۱۶

۵: بنام عبدالماجد دریابادی، ۱۹۲۳/۱/۲۰ء، دوم، ۴۱۸

۶: بیگم صغریٰ ہمایوں، ۱۹۲۳/۲/۱۸ء، دوم، ۴۲۵

۷: بنام گرامی، ۱۹۲۳/۲/۲۳ء، دوم، ۴۲۶-۴۲۹

۸: بنام خان نیاز، ۱۹۲۳/۳/۱۲ء، دوم، ۴۳۴

میرے ایک سکھ دوست اسرارِ خودی کا بھگوت گیتا سے مقابلہ کر رہے ہیں، اُن کی تحریر انگریزی میں ہوگی۔[9]

میرے کلام کی مقبولیت محض فضل ایزدی ہے، ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہُنر نہیں دیکھتا اور اعمالِ صالحہ کی شرط بھی مفقود ہے۔[10]

پیامِ مشرق اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں، لیکن افسوس ہے، انھیں ختم نہ کر سکا۔ فکرِ روزی قاتلِ روح ہے، یکسوئی نصیب نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے، اسے شائع کر دیا جائے۔[11]

پیامِ مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن 'حکیم حیات' گوئٹے کا مغربی دیوان ہے......

پیامِ مشرق، جو مغربی دیوان سے سو سال بعد لکھا گیا ہے، اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقائق کو پیش نظر لانا ہے، جن کا تعلق فرد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب، جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی، جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔ یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوف ناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھول لی ہے، مگر اقوامِ شرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ

9: بنام عبدالماجد دریابادی، ۱۷/۴/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۴۴ 10: ایضاً
11: ایضاً

پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون، جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ [۱۳:۱۱] کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور مَیں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔[۱۲]

اِس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش، جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے، اسی بنا پر مَیں نے ان چند اَوراق [پیامِ مشرق] کو اعلیٰ حضرت فرماں روائے افغانستان کے نامِ نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت انھیں خاص طور پر مدِنظر ہے۔[۱۳]

اردو نثر میں بھی ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔[۱۴]

کتاب [پیامِ مشرق] کو شائع ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے اور شاید نصف کے قریب نکل بھی گئی ہے۔ ایک ہزار کاپی شائع ہوئی تھی۔[۱۵]

....

افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت، بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آئندہ تیس سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی۔[۱۶]

میری رائے میں اس وقت مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ گذشتہ پچاس سال کی تعلیمی مساعی کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اور یہ نتیجہ کسی طرح بھی امید افزا نہیں ہے۔ اگر اس وقت حالات میں تبدیلی نہ لائی گئی تو مسلمانوں کی آئندہ نسل کا خدا حافظ ہے۔[۱۷]

۱۲: دیباچہ پیامِ مشرق، ۷، ۱۱-۱۲

۱۳: ایضاً، ۱۳

۱۴: بنام گرامی، ۲۴/۴/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۳۵

۱۵: بنام خان نیاز، ۲۵/۵/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۴۷

۱۶: بنام شاد، ۱۹/۳/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۳۹

۱۷: شیخ فیض محمد، ۱۶/۴/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۴۱-۴۴۳

مجھ سے بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ لاہور کی نیابت کونسل میں کرو، لیکن اور امیدوار بھی ہیں اور مَیں یہ بات خلافِ انصاف تصور کرتا ہوں کہ اُن سے کہوں کہ تم میری خاطر امیدواری سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ غالباً مَیں کھڑا نہ ہوں گا؛ ہاں، اگر لاہور کے لوگوں نے مجبور کیا تو یہ بوجھ سر پر اٹھانا ہوگا۔[۱۸]

....

'ساقی نامہ' اور کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گلہ سن کر مجھے تعجب ہوا۔ سعدی نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہوگی، کیونکہ ایک زمانے میں کشمیر ایران کا ہمسر رہ چکا ہے۔ مَیں نے تو دُکھڑا رویا ہے اور یہ بات سیاقِ اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ دُکھڑے کی بنا بھی واقعات پر ہے، جن کا مَیں نے کشمیر میں خود مشاہدہ کیا۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ نظم کا موضوع کشامرۂ کشمیر ہیں، نہ [کہ] کشامرۂ پنجاب۔ جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں، وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کے لیے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آبا و اجداد اہلِ خطہ میں سے ہیں۔[۱۹]

کسی صاحب [شمس الدین حسن، سابق مدیر انقلاب[۲۰]] نے [زمیندار[۲۱] میں] میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے ہیں۔ [ان کے خیال میں، بالشویک نظامِ حکومت کارل مارکس کے فلسفہ سیاست کا لب لباب ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اِن حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی 'خضرِ راہ' اور پیامِ مشرق کو بغور دیکھے تو فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں، بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ بھی ہیں[۲۲]۔] چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے، اس واسطے اس تحریر کی

۱۸: بنام خان نیاز، ۱۹۲۳/۵/۲۵ء، دوم، ۴۴۷
۱۹: خورشید احمد، ۱۹۲۳/۵/۲۶ء، دوم، ۴۴۸-۴۴۹
۲۰: خطوطِ اقبال، ۱۵۳
۲۱: بحوالہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ۴۵۳
۲۲: ایضاً

تردید میرا فرض ہے۔ مَیں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے، لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش [کذا] اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِعمل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے، جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔ میری دِلی آرزو ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام قومیں اپنے اپنے ممالک میں ایسے قوانین وضع کریں، جن کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی، جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا اُن سے ملتے جلتے ہوں گے۔[۲۳]

....

'اقبال فنڈ' قائم کرنا میری رائے میں، جس میں میرے ضمیر کی آواز بھی شامل ہے، درست نہیں۔ مسلمان غریب قوم ہیں اور باوجود اس غریبی کے گذشتہ دس بارہ سال میں ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ چندوں میں دے چکے ہیں۔ مَیں تو یہاں تک احتیاط کرتا ہوں کہ جو لوگ کتاب کو پڑھ نہیں سکتے، وہ اسے خرید بھی نہ کریں، کیونکہ ان کو اس خریداری کی ترغیب دینا ایک قسم کی ناانصافی ہے۔ باقی رہا مَیں، سو میری طرح اُمتِ مرحومہ میں سیکڑوں آدمی آگے گزر گئے ہیں، جنھوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے۔ مجھ سے بھی، جہاں تک ہو سکے گا، انھی کی تقلید کروں گا۔[۲۴]

....

۲۳: بنام مدیر زمیندار، ۲۴/۶/۱۹۲۳ء، دوم، ۲۵۳-۲۵۷ ۲۴: بنام خان نیاز، ۲۵/۶/۱۹۲۳ء، دوم، ۲۵۸

کونسل کی امیدواری کے متعلق لاہور کے مسلمانوں نے مجھ سے بہت کہا، مگر مَیں نے انکار کیا، لیکن اب تک ان کا اصرار بدستور جاری ہے۔ قریباً ہر روز ان کا ایک نہ ایک وفد آ جاتا ہے۔[۲۵]

غالباً مَیں الیکشن کے ہنگامے میں نہ پڑوں گا۔ لاہور کے لوگ مجبور کرتے ہیں اور بہت سے ڈیپوٹیشن ان کے آ چکے ہیں، مگر میاں عبدالعزیز سے مقابلے کے بعد انتخاب ہو جانا یقینی ہے، تاہم یہ بات میرے نزدیک مروّت کے خلاف ہے کہ ایک موہوم دنیوی فائدے کی خاطر دیرینہ تعلقات کو نظر انداز کر دوں۔[۲۶]

....

ستمبر کے آخر تک مجھے بالکل فرصت نہیں۔ اگرچہ ہائی کورٹ جولائی کے آخر میں بند ہو جائے گا، تاہم مجھے تعطیلوں میں مطلقاً فرصت نہیں۔ بہت سے کام ہیں، جن میں سے ایک پیامِ مشرق کی دوسری ایڈیشن کی ترتیب ہے، جو غالباً جرمنی میں طبع ہو گی۔[۲۷]

پروفیسر نکلسن نے [پیامِ مشرق پر سید سلیمان ندوی کے نوٹ مطبوعہ معارف کو] بہت پسند کیا ہے اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اور ہیجنل خیالات سے مملو ہے اور گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا قابلِ تحسین جواب ہے۔[۲۸]

پیامِ مشرق کے متعلق بہت سے خطوط دُور و نزدیک سے آئے ہیں اور آ رہے ہیں۔ برلن سے ایک پروفیسر نے لکھا ہے کہ حیرت انگیز کتاب ہے۔ پروفیسر ہاروِٹز [Harovitz]، جو علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر تھے اور اب جرمنی میں اس پر ریویو لکھ رہے ہیں، جو جرمن اخبارات میں شائع ہو گا۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک قابلِ تحسین جواب گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا ہے اور جدید اور اور ہیجنل خیالات و افکار سے لبریز ہے۔[۲۹]

۲۵: بنام خان نیاز، ۲۵/۶/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۵۸
۲۶: بنام خان نیاز، ۲۰/۷/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۶۳
۲۷: بنام شاہ نظیر احمد، ۲۹/۶/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۶۰
۲۸: بنام سلیمان ندوی، ۵/۷/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۶۱
۲۹: بنام خان نیاز، ۲۰/۷/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۶۳

ڈاکٹر سپونر پیامِ مشرق کا ترجمہ کریں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر سپونر مغربی افکار و خیالاتِ فلسفیانہ سے واقف ہیں تو ان رباعیوں کی تلمیحات سمجھ جائیں گے، گو یہ امر شعر کے لطف اُٹھانے کے لیے ضروری نہیں، تاہم ترجمہ کرنے والوں کو ان باتوں کا جاننا ضروری ہے۔[30]

فرنک فورٹ کے پروفیسر ہارووِٹز کا ریویو عنقریب ہندوستان آئے گا۔ وہ غالباً خود ہی اس ریویو کی ایک کاپی میرے ملاحظے کے لیے ارسال کریں گے۔ اس کا انگریزی ترجمہ کرا کے یہاں شائع کر دیا جائے گا۔[31]

مثنوی [اَسرارِ خودی] کے تیسرے حصے کے لیے دل و دِماغ تیار ہو رہے ہیں۔ تکمیل اس کام کی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ کیا عجب کہ اپنے حبیبِ پاکؐ کے صدقے میں ان مضامین کو معرضِ شہود میں لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ مثنوی کے تیسرے حصے میں مسلمانوں کے آئندہ سو سال کے افکار و اعمال کے لیے مواد ہو گا۔[32]

....

میرا مکان اسٹیشن لاہور سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ قلعہ گجر سنگھ کا علاقہ ہے، جو لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ہے، [یعنی] 3. McLeod Road۔[33]

....

مَیں ۸/اگست کی شام [شملہ کے لیے] روانہ ہونے کو تھا اور اس امر کا بھی قطعی فیصلہ ہو چکا تھا، مگر اَب افسوس ہے کہ کم از کم اگست میں حاضر نہ ہو سکوں گا۔ ۲/اگست کے روز سیالکوٹ سے لاہور واپس آیا تو میری بیوی کو بخار آ گیا۔ خیال تھا کہ معمولی بخار ہے، ایک دو روز میں اُتر جائے گا، مگر آج معلوم ہوا کہ میعادی بخار ہے، جس کو ٹائیفائڈ کے خوفناک نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جو چودہ روز یا اکیس روز رہتا ہے۔ ایسی حالت میں شملہ کی سیر کو جانا مروّت اور دیانت دونوں کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو صحت عطا کرے، مجھے فکر و تردد ہو

۳۰: بنام چودھری محمد حسین، ۲۴/۷/۱۹۲۳ء، چہارم، ۹۷۵ ۳۱: بنام خان نیاز، ۲۸/۷/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۶۸
۳۲: بنام خان نیاز، ۲۰/۷/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۶۳ ۳۳: بنام سعید الدین جعفری، ۲۴/۷/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۶۶

رہا ہے۔ اس کی صحت کے بعد اِن شاء اللہ ستمبر میں یہ سفر ممکن ہوگا۔ حیدر آباد دکن سے بھی مسٹر حیدری کا تار آیا تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے فلسفہ کے کورسوں میں مشورہ دینے کے لیے ایک ہفتے کے لیے آؤ، اخراجات کی کفیل عثمانیہ یونیورسٹی ہوگی، مگر اس مجبوری کی وجہ سے وہاں بھی نہ جا سکا۔ ان کو ابھی تار کا جواب دیا ہے اور خط میں مفصل حالات لکھ دیے ہیں۔[۳۴]

کل مہارانی گیلوارڈ (بڑودہ) کے پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کا خط آیا تھا، وہ مجھ سے میری زندگی کے حالات طلب کرتے ہیں۔ انھوں نے کوئی کتاب اردو لٹریچر کی تاریخ پر لکھی ہے۔[۳۵]

مریضہ کو اب [۱۸/اگست کو] بالکل صحت ہے، الحمد للہ ستمبر میں شملہ آنا ہو سکے گا،[۳۶] [لیکن] اگر ستمبر میں عطائے تمغہ جات کا جلسہ نہ ہوا تو یقینی نہیں، کیونکہ ستمبر کام کا مہینا ہے۔ بہر حال، ابھی شملہ آنے کی تاریخ معین نہیں ہو سکتی۔[۳۷]

دِین کی نصرت کے لیے آسمانوں پر شور ہے، مگر زمین والے خاموش ہیں اور آسمانی آوازوں کو نہیں سمجھتے۔ خدا ان پر رحم کرے، اسلام کو علما و مشائخ نے محض ایک قدیم ایشیائی مذہب کی صورت میں منتقل کر دیا۔ اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ اسلام کی عمر صرف تیرہ سو سال ہے تو وہ مسلمانوں کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے کبھی اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ یہ اس قدر جدید مذہب ہے، بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ عام خیالات کے اعتبار سے اسلام اور ایشیا کے دیگر قدیم مذاہب میں کوئی فرق نہ پائے گا، حالانکہ حق بات یہ ہے کہ جب ہم وید، انجیل وغیرہ کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد قرآن کا مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خیالات کی ایک نئی فضا میں داخل ہو گئے ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں کو قرآن کی جدت کا کبھی احساس نہ ہوا، بلکہ انھوں نے اس جدید کتاب کے مطالب و حقائق کو قدیم اقوام کے خیالات کی روشنی میں تفسیر کر کے اس کے اصل مطلب و مفہوم کو مسخ کر دیا۔ اب اقوامِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ خود اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کے صدقے میں

۳۴: بنام چودھری محمد حسین، ۶/۸/۱۹۲۳ء، چہارم، ۹۷۷ ۳۵: ایضاً، ۹۷۸

۳۶: بنام چودھری محمد حسین، ۱۸/۸/۱۹۲۳ء، چہارم، ۹۷۹ ۳۷: بنام چودھری محمد حسین، ۲۱/۸/۱۹۲۳ء، چہارم، ۹۸۲

مسلمانوں میں اس قسم کا مفسر پیدا کر دے، جو اس گمشدہ حکمت کو پھر پا کر قوم کی نذر کرے۔[۳۸]

مَیں روز بروز اس بات کا قائل ہوتا جاتا ہوں کہ تفسیر قرآن ازبس ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان امرا کو، جو اس کام میں مدد دے سکتے ہیں، قطعاً توجہ نہیں۔[۳۹]

تفسیر قرآن کے لیے ایک واقف کار اسسٹنٹ کی ضرورت ہے، لیکن خدا کو اگر یہ کام منظور ہے تو ایسا آدمی بھی پیدا ہو جائے گا اور میری فراغت کا سامان بھی نکل آئے گا اور کچھ نہیں تو اِن شاءاللہ جو کتاب بزبانِ انگریزی میرے زیرِ نظر ہے، اس میں کم از کم مکمل تفسیر کا خاکہ تو کھینچ کر رکھ دیا جائے گا۔[۴۰]

....

نئی کوٹھی ابھی نہیں خریدی۔ سودا تو ہو گیا تھا، مگر تمام امور زبانی طے ہو جانے کے بعد بائع، جو ہندو تھا، مکر گیا۔ اب اَور جگہ کی تلاش ہو رہی ہے۔ یقین ہے کہ کوئی اَور کوٹھی حسب دل خواہ مل جائے۔[۴۱]

بیوی کی صحت خدا کے فضل و کرم سے اچھی ہے، پندرہ روز کے بعد بخار اُتر گیا، مگر کمزوری بے انتہا ہے اور یہ مرحلہ بیماری سے زیادہ خطرناک ہے۔ احتیاط کامل کی جا رہی ہے، اللہ فضل کرنے والا ہے۔[۴۲]

....

حیدر آباد سے مجھے دو تین تار آئے تھے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے آؤ، مگر مَیں بیوی کی علالت کی وجہ سے نہ جا سکا۔ آخر انھوں نے وہاں کے ایک اہل کار صاحب [پروفیسر عبدالباری] کو لاہور بھیج دیا، جو دو روز یہاں رہے۔ مَیں نے ان کو تمام ضروری امور کے متعلق مشورہ دے دیا تھا۔[۴۳]

....

۳۸: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۳/۸/۲۱ء، چہارم، ۹۸۳
۳۹: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۳/۸/۲۶ء، چہارم، ۹۸۴
۴۰: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۳/۸/۳۰ء، چہارم، ۹۸۶
۴۱: بنام گرامی، ۱۹۲۳/۸/۲۲ء، دوم، ۴۷۰
۴۲: ایضاً
۴۳: بنام گرامی، ۱۹۲۳/۸/۲۷ء، دوم، ۴۷۳

ستمبر کی آٹھ سات تک شملہ کا قصد ہے۔ پانی پت کے مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن بھی گورنر صاحب کی خدمت میں جا رہا ہے، حاضر ہوا تو اس میں بھی شریک ہو جاؤں گا، گو میں ایسی تجویزوں کا قطعاً قائل نہیں ہوں۔ اتحادِ اسلام کی تجاویز ملک کے...... مختلف حصوں میں ہو رہی ہیں۔ قدرت کی قوتیں اس وقت تمام تر مسلمانوں کی بیداری میں مصروف ہیں۔ میری رائے ہے کہ ہندو سنگٹھن اور شدھی کا نتیجہ خود ہندوؤں کے حق میں بہت بُرا نکلے گا۔ بہرحال، ان کو اپنی قوم کو مضبوط کرنے اور منظوم کرنے کا پورا حق حاصل ہے، بلکہ اگر وہ طاقت اور دولت کے نشے میں مسلمانوں پر دراز دستی بھی کریں تو شکایت نہ کروں گا، نہ حکام کے پاس فریاد لے جاؤں گا۔[۴۴]

اگر تمام ہندوستان میں صرف پنجاب کے مسلمانوں کا ہی نظام مرتب ہو جائے تو کافی ہے۔ مستقبل قریب میں پنجاب کا علاقہ، خصوصاً اس کی مسلمان آبادی کی وجہ سے نہایت وقیع اور سیاساتِ ایشیا میں ایک بھاری عنصر ہو جانے والا ہے۔[۴۵]

....

'پیامِ بدانایانِ فرنگ' کی تکمیل شروع ہے، اس کے چند اشعار پیامِ مشرق میں چھپے تھے، باقی اَب لکھ رہا ہوں۔ طویل نظم ہوگی۔[۴۶] کُل پچاس شعر شاید ہوں گے، مگر نظم لاجواب ہوگی، اِن شاءاللہ۔[۴۷] خدا تعالیٰ اپنے حبیبؐ کے طفیل سے اس کے ختم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔[۴۸]

پیامِ مشرق کی دوسری ایڈیشن تیار ہو رہی ہے، اس میں بہت سا اضافہ ہو جائے گا۔[۴۹]

....

نوبل پرائز کا یہاں بہت چرچا ہو رہا ہے، قریباً ہر روز کوئی نہ کوئی گروہ آدمیوں [کا] آ کر پوچھتا ہے۔[۵۰]

....

۴۴: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۳/۸/۳۰ء، چہارم، ۹۸۶، ۹۸۸
۴۵: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۳/۹/۵ء، چہارم، ۹۹۱
۴۶: ایضاً، ۹۹۲
۴۷: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۳/۹/۸ء، چہارم، ۹۹۳
۴۸: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۳/۹/۵ء، چہارم، ۹۹۲
۴۹: ایضاً
۵۰: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۳/۹/۸ء، چہارم، ۹۹۳

گذشتہ تین ماہ سے مسلسل بیماری کی وجہ سے آلام وافکار میں گرفتار ہوں۔ پہلے میری بیوی کو ٹائیفائڈ فیور ہو گیا اور وہ قریباً دو ماہ صاحب فراش رہیں۔ اس کے بعد میری باری آئی۔ مجھ کو ڈنگو فیور ہو گیا، بعد میں مسوڑا پھول جانے سے بھی سخت تکلیف رہی۔[51]

....

حضور وائسرائے آج کل لاہور میں رونق افروز ہیں۔ کل انھوں نے نئے ہائی کورٹ پنجاب کا افتتاح فرمایا۔ چیف جسٹس سر شادی لال نے جو تقریر اس موقع پر کی، اس کے جواب میں حضور وائسرائے نے اقبال کی تعریف بھی کی۔ تقریر نہایت دلکش اور نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کی گئی۔ اقبال کی تعریف سے سب کو تعجب ہوا کہ اس کی توقع نہ تھی۔[52]

....

ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانۂ حال کی روشنی میں مطالعہ کیے جانے کا محتاج ہے۔ پرانے مفسرینِ قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے، مگر ان کی تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو جدید دِماغ کو اپیل نہیں کریں گی۔ میری رائے میں بحیثیت مجموعی زمانۂ حال کے مسلمانوں کو امام ابنِ تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں، مگر شاہ صاحب موصوف کی حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ حکما میں ابنِ رُشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس غزالی اور رومی علیہم الرحمۃ، مفسرین میں معتزلی نقطہ خیال سے زمخشری، اشعری نقطہ خیال سے رازی اور زبان ومحاورے کے اعتبار سے بیضاوی۔ نئے تعلیم یافتہ مسلمان اگر عربی میں اچھی دستگاہ پیدا کر لیں تو اسلام کے re-interpretation میں بڑی مدد دے سکیں گے۔ مَیں نے اپنی تصانیف میں ایک حد تک یہی کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِن شاءاللہ اس پر نثر میں بھی لکھوں گا۔[53]

میرے نزدیک اسلام نوعِ انسانی کی اقوام کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل

۵۱: بنام شاد، ۲۱/۹/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۷۷
۵۲: بنام گرامی، ۲۸/۱۰/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۸۷
۵۳: بنام شاد، ۲۴/۱۰/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۸۵
۵۴: بنام سعید الدین جعفری، ۱۴/۱۱/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۹۳

وقومیت کی مصنوعی، مگر ارتقاے انسانی کے ابتدائی مراحل میں مقید امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے؛ اسی وجہ سے اَور مذاہب (یعنی مسیحیت، بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ چونکہ اِس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لیے یہ الگ بہت بڑی لعنت ہے۔ ابتدا میں مَیں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے مَیں نے دیکھا تھا، لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیالات میں تبدیلی کر دی۔ Pan-Islam میرے نزدیک ایک طریق چند اقوامِ انسانی کو جمع کرنے اور ان کو ایک مرکز پر لانے کا ہے۔ پس اسلام ایک قدم ہے نوعِ انسانی کے اتحاد کی طرف۔ پس جو کچھ مَیں اسلام کے متعلق لکھتا ہوں، اس سے میری غرض محض خدمتِ بنی نوع انسان ہے اور کچھ نہیں۔ غرضیکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس وقت اقوامِ انسانی کے لیے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے اور جو شخص مسلمان کہلاتا ہے، اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں، بلکہ خالصتاً للہ اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے اور اگر دِماغی قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے، تا کہ نوعِ انسانی قدیم توہمات سے نجات پائے۔[۵۵]

....

[اردو] مجموعہ [کلام] شائع کرنے کی فکر میں ہوں، اِن شاء اللہ ۲۴ء میں ضرور شائع ہو جائے گا۔[۵۶]

میرے فرصت کے اوقات پرائیویٹ لٹریری کام کے نذر ہو جاتے ہیں۔ مَیں ایک عرصے سے فلسفے کا مطالعہ چھوڑ بیٹھا ہوں، صرف ایک آدھ مسئلے سے دلچسپی باقی ہے۔[۵۷]

۵۵: بنام سعید الدین جعفری، ۱۴/۱۱/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۹۳-۴۹۴ ۵۶: ایضاً، ۴۹۵

۵۷: بنام ابراہیم حنیف، ۱/۱۲/۱۹۲۳ء، دوم، ۴۹۸

۱۹۲۴ء

مَیں نے چند نظمیں فارسی میں لکھی تھیں، جو پیامِ مشرق کی دوسری ایڈیشن میں شائع کردی گئیں۔ انھی نظموں میں سے ایک ...... [سلیمان ندوی] کی خدمت میں ارسال کی گئی، ایک جامعہ ملیہ علی گڑھ کے لیے اور ایک علی گڑھ منتھلی کے لیے بھیجی گئی، اور کسی جگہ کوئی نظم مَیں نے نہیں بھیجی[1]

مَیں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مَیں نے اسرارِ خودی شائع کر کے غلطی کی ہے۔ چونکہ خودی کا نظریہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی چیز نہیں اور اس کے عرفان کا دارومدار زیادہ تر ذاتی اور روحانی مشاہدے پر ہے، نہ کہ منطقی استدلال پر۔...... جن خیالات کو مَیں نے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، وہ بہت دُوررَس ہیں اور انسانی دِماغ ان کی وسعت اور معنی کا احاطہ آہستہ آہستہ ہی کرسکتا ہے۔ خود میری مثال لیجیے، اس پر قدرت حاصل کرنے میں پندرہ سال سے کم مدت نہیں لگی[2]

انسانی شخصیت، یعنی ذاتِ محدود کے نصب العین کا اظہار فارسی کے ایک شاعر سے بہتر نہیں ہوا، جو ایک قدیم فارسی شاعر [جمال دہلوی] نے آنحضرتؐ کی شان میں لکھا تھا:

موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تُو عین ذات می نگری در تبسمی

میرا بھی نصب العین ذاتِ محدود کے مقابل بھی فرد کی شخصیت کے استحکام کے بارے میں یہی ہے۔ مسلم ادبیات کے تمام ذخیرے میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے اور ان دو مصرعوں

1: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۲۴/۲/۱ء، دوم، ۵۰۷
2: بنام ہادی حسن، ۱۹۲۴/۲/۲ء، دوم، ۵۱۱-۵۱۲

میں ایک دنیائے معنی آباد ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ آیا شاعر کو خود بھی شعور تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میری رائے میں حیاتِ جاوِدانی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے، اگر اس سے محدود شخصیت کا تسلسل مراد نہ ہو:

زِ خود گذشتہ ای اے قطرۂ محال اندیش
شدن بہ بحر و گہر بر نخاستن تنگ است

یہ ذاتِ انسانی کا نظریہ ہے، جو میرے خیال میں قرآن کی تمام تعلیمات کی اساس ہے اور اس نظریے کا احیا زمانۂ حاضر میں اسلام کے لیے ناگزیر ہے۔ مَیں محسوس کرتا ہوں کہ کوئی ایسی قوت، جس کے دباؤ کو روکا نہیں جا سکتا، مجھے مجبور کر رہی ہے کہ مَیں اس نظریے کی معنوی تہ داری اور زندگی، نیز آخرت پر اس کے اثرات کو نئی مسلم نسل پر واضح کروں۔ میرا خیال ہے کہ مَیں نے عصرِ حاضر کے مسلمانوں کی دُکھتی رَگ پکڑ لی ہے اور امید کرتا ہوں کہ مَیں ان کے مرض کی تشخیص کر سکتا ہوں۔ مجھے اپنے اس کام کی اہمیت کا پوری طرح احساس ہے اور امید ہے کہ میری تصنیفات کا مطالعہ کرنے والے بھی اس ذمہ داری کو محسوس کریں گے، جو اُن کے شانوں پر ہے۔[۳]

دنیا کے دل میں انقلاب ہے، اس واسطے قلوبِ انسانی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اسلام کی عظمت کا زمانہ اِن شاء اللہ قریب آ رہا ہے۔[۴]

پیامِ مشرق [کا دوسرا ایڈیشن] چھپ رہا ہے۔ مجموعہ [بانگِ درا] اردو مرتب ہو چکا ہے، دو تین روز تک کاتب کے ہاتھ میں ہوگا۔[۵]

....

[فروری کی] سردی اور متواتر بارش کی وجہ سے کمر میں درد ہونے لگی، یورک ایسڈ کے دُور کرنے کی دوائی پی رہا ہوں، اس اندیشہ سے کہ گوٹ کا حملہ نہ ہو جائے۔[۶]

۳: بنام ہادی حسن، ۲/۲/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۱۳-۵۱۴ ۔ ۴: بنام محمد اکبر منیر، ۲/۲/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۱۵
۵: بنام خان نیاز، ۱۱/۲/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۱۶ ۔ ۶: ایضاً

مَیں اتوار کو دہلی سے واپس آیا اور ۲۷ [مارچ] کو اپنے بھتیجے [شیخ اعجاز احمد] کی شادی میں شرکت کی غرض سے سیالکوٹ جا رہا ہوں، لہٰذا میرے لیے پنجاب یونیورسٹی یا ' ٹ ب ' [ٹیکسٹ بک؟] کمیٹی کی منعقد ہونے والی میٹنگوں میں شامل ہونا ممکن نہ ہوگا۔[7]

....

لاہور میں طاعون کا زور ہے۔ مَیں چند دِنوں سے مع اہل و عیال لدھیانہ میں مقیم ہوں، دو چار روز میں واپس لاہور جاؤں گا۔[8]

....

[بوعلی] قلندر صاحب بڑے پایے کے بزرگ تھے۔ اُن کے عرس پر روپیہ صرف کرنا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا بڑی برکت کا باعث ہے۔[9]

....

میرا اِرادہ ہے کہ دَورِ حاضر میں اسلام میں آزادیِ اجتہاد پر ایک مقالہ لکھوں اور اس ضمن میں ترکی میں رُونما موجودہ واقعات کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ اجتہاد کی تاریخ مرتب کرنے کے واسطے، میرا خیال ہے کہ مجھے (امام) ابنِ تیمیہ اور عبدالوہاب نجدی کی تعلیمات کا مطالعہ کرنا ہوگا، نیز ایران میں بہائی تحریک کی اوّلین شکل کا بھی (بانی محمد علی باب)۔[10]

....

حکام کا اپنا ایک مسلک اور طریق کار ہوتا ہے۔ مَیں حکام سے لوگوں کی سفارش نہیں کرتا۔ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ایسی سفارشات شاذ و نادر ہی کارگر ہوتی ہیں، اس کے باوجود گذشتہ دو سال میں دوستوں اور دوسرے لوگوں کے اصرار پر تحریری و زبانی سفارشات کرنے پر مجبور ہوا ہوں اور نتیجہ ہیچ۔ تجربے نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ یہ خودداری کے قطعی منافی ہے۔ بلا نتیجہ سفارش پر سفارش کرتے چلے جانا مجھے ذلت انگیز معلوم ہوتا ہے۔[11]

....

۷: بنام مولوی محمد شفیع، ۱۹۲۴/۳/۲۵ء

۸: بنام خان نیاز، ۱۹۲۴/۴/۲۲ء، دوم، ۵۱۷

۹: ایضاً

۱۰: بنام مولوی محمد شفیع، ۱۹۲۴/۴/۲۹

۱۱: بنام مولوی محمد شفیع، ۱۹۲۴/۵/۲ء، دوم، ۵۱۹

مَیں لدھیانہ سے مع عیال واپس آیا تھا۔ اَب لاہور میں خدا کا فضل ہے، بیماری [طاعون] قریباً معدوم ہوگئی ہے۔ اَور دو چار روز تک بالکل نہ رہے گی۔[۱۲]

....

عبدالمجید [پرویں رقم] بدستور سابق ہے۔ ابھی اس کے پاس دس یا بارہ کا پیاں لکھنے کو ہیں۔ شیخ عبدالقادر صاحب سے مَیں نے کہہ دیا ہے، وہ دیباچہ لکھ دیں گے۔[۱۳]

مَیں نے مسئلہ اجتہاد فی الاسلام پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا تھا (انگریزی)، جس کا ایک تہائی حصہ لکھا بھی گیا تھا، مگر اَب خوف آیا ہے کہ ہندوستان کے قدامت پسند علما کہیں کفر کا فتویٰ نہ تیار کر دیں۔[۱۴]

پروفیسر نکلسن کا خط آیا تھا، وہ عنقریب پیامِ مشرق پر مضمون لکھیں گے۔[۱۵]

اردو مجموعہ چھپ گیا ہے، قریباً دو ہفتے تک بالکل تیار ہو جائے گا۔ شیخ عبدالقادر صاحب اس کا دیباچہ لکھ رہے ہیں، جو کل اِن شاءاللہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی لکھائی چھپائی میں ایک ہفتہ لگ جائے گا۔[۱۶]

ایک چھوٹی سی کتاب لکھ رہا ہوں، جس کا نام غالباً یہ ہوگا: Songs of a Modern David۔[۱۷]

دیباچہ شیخ صاحب آج دیں گے یا کل ملے گا۔ طویل نظموں کے متعلق اعلان کرنے کی ضرورت نہیں، جو چند نظمیں شائع ہوئی ہیں، وہ اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں تمام نظموں کا کاپی رائٹ ہے، البتہ یہ اعلان ہو جائے کہ کتاب چھپ گئی ہے، دیباچہ عبدالقادر نے لکھا ہے۔ تاجروں کو معقول کمیشن دی جائے گی، جس کا فیصلہ طاہر دین، بازار انارکلی سے کرنا چاہیے۔ چودھری غلام رسول صاحب شملہ ہی میں ہیں، وہ

۱۲: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۲۲/۵/۸ء، چہارم ۹۹۶
۱۳: ایضاً
۱۴: ایضاً
۱۵: ایضاً، ۹۹۸
۱۶: بنام خان نیاز، ۱۹۲۴/۷/۱۳ء، دوم ۵۲۰
۱۷: ایضاً، ۵۲۲

وہاں سے لکھ کر زمیندار میں بھیج دیں گے۔ وہ تو کہتے تھے کہ اعلان زمیندار نمبر میں ہو جائے گا، جس کی اشاعت بیس ہزار ہوگی، مگر تعجب ہے۔ اس میں کچھ نہ تھا، معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے رہ گیا ہے۔ علی گڑھ بک ڈپو سے خود بخود خط و کتابت کرنے کی کیا ضرورت ہے، اشتہار دیکھ کر شاید وہ خود ہی دریافت کریں۔[۱۸]

....

مَیں کئی روز تک بیمار رہا، مسوڑا پھول گیا تھا، جس کو کل چِر دایا گیا۔ اب خدا کے فضل سے آرام ہے، مگر گذشتہ ہفتے سخت تکلیف رہی۔[۱۹]

آج کل گرمی سخت ہے، بارش مطلق نہیں ہوئی۔ فکرِ سخن کے لیے یہ موسم نہایت خراب ہے، تاہم کبھی کبھی شبنم کی کوئی نہ کوئی بوند برس جاتی ہے۔[۲۰]

....

نادر خاں کابل جاتے ہوئے لاہور میں ٹھہر گئے تھے۔ وہ میری صورت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے، 'آپ اقبال ہیں! مَیں تو سمجھتا تھا کہ آپ لمبی داڑھی والے بزرگ صورت ہوں گے'۔ مَیں نے کہا، 'آپ سے زیادہ مجھے حیرانی ہے، آپ تو جرنیل ہیں۔ مَیں سمجھتا تھا، آپ دیو ہیکل ہوں گے، مگر آپ میں جرنیلی کی کوئی شان نہیں۔ اس قدر دُبلے پتلے!'[۲۱]

وہ اردو بہت اچھی بولتے ہیں اور نہایت بے تکلف اور سادہ آدمی ہیں، مَیں [گذشتہ کل [۱۵ر جولائی کی] شام نیڈو ہوٹل میں ان سے ملا، وہ خود ہی میرے مکان پر آنے والے تھے۔ چٹھی میرے نام کی لکھ کر بھیجنے والے تھے کہ مَیں خود وہاں جا پہنچا۔ ان کی دعوت چائے کی تھی اور مجھے بھی میزبان نے مدعو کیا تھا، نہایت اخلاص اور محبت سے ملے اور جب مَیں نے ان کی عسکری قابلیت کی تعریف کی تو کہا، 'آپ نے جو کچھ لکھا ہے، دنیا کی کوئی توپ اور بندوق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایک ایک لفظ ایک ایک بیٹری کا حکم رکھتا ہے'۔ وہ پیرس میں

۱۸: بنام چودھری محمد حسین، ۱۶ر۷ر۱۹۲۴ء، چہارم، ۹۹۸، ۹۹۹ ۱۹: بنام خان نیاز، ۱۳ر۷ر۱۹۲۴ء، دوم، ۵۲۰
۲۰: ایضاً، ۵۲۲ ۲۱: ملفوظاتِ اقبال، ۱۴۶-۱۴۷

سال یا دو سال رہیں گے۔ اپنے چھوٹے بچے کو بھی ساتھ لے جا رہے ہیں، جس کی عمر تقریباً دس سال کی ہوگی۔ سنا ہے، وزیر خاں کی مسجد میں انھوں نے کوئی تقریر بھی کی ہے۔ عصر کی نماز انھوں نے وہاں ادا کی تھی، کل شام ساڑھے سات بجے وہ گاڑی سے بمبئی تشریف لے گئے۔ اُن کا خیال ہے کہ تمام ممالک کے مسلمانوں کو ایک خاص جگہ جمع ہو کر اپنے لیے ایک مشترک پروگرام تجویز کرنا چاہیے، جس پر تمام ممالکِ اسلامیہ عمل کریں، باقی مقامی اور خاص حالات کے لیے ہر ملک اپنا اپنا پروگرام تجویز کرے، جو اُن کے مناسب حال ہو۔ غرض کہ چند منٹ ان سے خوب صحبت رہی۔ ان کو وزیر خاں کی مسجد میں جانے اور لوگوں سے ملنے کے لیے، جو اُن کا دیر سے انتظار کر رہے تھے، جلدی تھی، اس واسطے وہ ہم سے بادلِ نخواستہ رخصت ہو گئے۔[۲۲]

....

کتاب [بانگِ درا] پریس میں ہے اور امید ہے کہ تقریباً ایک ہفتے میں تیار ہو جائے گی۔[۲۳]

کتاب کا دیباچہ مختصر ہے اور محض تاریخ، آج اس کے پروف دیکھ کر میں نے بھیج دیے ہیں۔ علی بخش ابھی لے کر گیا ہے۔ امید ہے کہ دو چار روز تک کتاب مارکیٹ میں آ جائے گی۔ لاہور کے کتب فروش مل کر اسے خریدنا چاہتے ہیں، مگر پچاس فی صد کمیشن مانگتے ہیں، مَیں نے انکار کر دیا ہے۔[۲۴]

....

شملہ آنے کا قصد تھا، مگر شیخ اصغر علی صاحب ڈلہوزی کھینچتے ہیں۔ پچھلے سال بھی انھوں نے اصرار کیا تھا۔ میرے نہ جانے سے کبیدہ خاطر ہوئے تھے۔ اب کے سال انھوں نے پھر لکھا ہے۔ مَیں نے نواب صاحب کی خدمت میں خط لکھا ہے اور دریافت کیا ہے کہ آیا کرنال کے مقدمات کا تصفیہ اگست میں ہوگا یا نہ۔ اگر نہ ہوا تو مَیں خیال کرتا ہوں کہ شیخ صاحب کو

۲۲: بنام چودھری محمد حسین، ۱۶/۷/۱۹۲۴ء، چہارم، ۹۹۹ ۲۳: بنام دینا ناتھ، ۲۳/۷/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۲۳

۲۴: بنام چودھری محمد حسین، ۲۵/۷/۱۹۲۴ء، چہارم، ۱۰۰۹

خوش کرنا ضروری ہے۔ ان کی خوشی کی خاطر چند روز کے لیے مَیں اور مرزا [جلال الدین] صاحب ڈلہوزی چلے جائیں گے۔ بعد میں ممکن ہوا تو شملہ کا سفر بھی ہو جائے گا۔[۲۵]

....

کتاب سلائی جا رہی ہے۔ [شیخ] مبارک علی سب کا پیاں خرید کرنا چاہتا ہے۔ کل اس بات کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔[۲۶]

مَیں ایک مفصل مضمون انگریزی میں لکھ رہا ہوں، جس کا عنوان ہے:

[۲۷]The Idea of Ijtehad in the law of Islam

ایک اَور فارسی کتاب زبورِ جدید زیرِ تصنیف ہے۔ یہ نظم ہو گی، مگر بہت عرصہ لے گی۔[۲۸]

کتاب کی فروخت کا معاملہ ابھی تک طے نہیں ہوا، دو چار روز تک اِدھر اُدھر ہو جائے گا۔ ابھی اس کی سلائی بھی ختم نہیں ہوئی، شاید آج پانچ سو کتاب تیار ہو گئی ہو گی۔ ایک کتاب نمونے کے طور پر آئی تھی، جو مَیں نے سردار جوگندر سنگھ صاحب کو دے دی تھی۔[۲۹]

مضمون اجتہاد [فی الاسلام] آج ٹائپ ہو کر تیار ہو گیا ہے۔ ۳۲ ٹائپ شدہ صفحات ہیں۔[۳۰]

....

کوہاٹ کے فسادات کی خبریں مَیں نے پڑھی ہیں۔ اس قسم کی جنگوں کا نتیجہ، مجھے یقین ہے، اچھا ہو گا اور ہندوؤں کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان سے بگاڑ کرنا اچھا نہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق، جو (برے) صاحب نے اسمبلی کے سامنے پڑھی ہے، پچاس لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔ ہندوؤں کے تمام محلات اور مندر جلا دیے گئے ہیں او وہ شہر چھوڑ کر راولپنڈی آ گئے ہیں۔[۳۱]

....

۲۵: بنام چودھری محمد حسین، ۲۵/۷/۱۹۲۴ء، چہارم ۱۰۰۹ — ۲۶: بنام چودھری محمد حسین، ۵/۸/۱۹۲۴ء، چہارم، ۱۰۱۱

۲۷: بنام سعید الدین جعفری، ۱۳/۸/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۳۰ — ۲۸: ایضاً، ۵۳۲

۲۹: بنام چودھری محمد حسین، ۱۵/۸/۱۹۲۴ء، چہارم، ۱۰۱۱ — ۳۰: بنام چودھری محمد حسین، ۱۸/۸/۱۹۲۴ء، چہارم، ۱۰۱۳

۳۱: ایضاً، ۱۰۱۴

مجھے افسوس ہے کہ مجھے کتاب [کلیاتِ اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق] کی فروخت کو برطانوی ہند سے باہر، یعنی مملکت نظام تک محدود رکھنے پر اصرار کرنا پڑا، کیونکہ جن لوگوں سے میرا معاملہ ہونا ہے، وہ اس قسم کی کسی شرط کے بغیر میرے ساتھ معاہدہ نہیں کریں گے اور اُن کے نقطہ نظر سے مَیں سمجھتا ہوں، بات خاصی معقول ہے۔ امید ہے کہ اب یہ لوگ کنٹریکٹ کی تکمیل کریں گے۔ ویسے مجھے اندیشہ ہے کہ ایک ہزار روپے کی رقم معاوضے کے سلسلے میں وہ مجھے ذاتی طور پر ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔[۳۲]

....

صاحبِ 'تذکرہ' [عنایت اللہ مشرقی] کے خیالات سے حیرت ہے۔ وہ قرآن کو محض مادہ پرستی کی طرف لے جانے والی کتاب تصور کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن تجربے اور مشاہدے کی طرف بار بار اپیل کرتا ہے اور نظامِ عالم کی قوائے کی تسخیر پر مومن کو آمادہ کرتا ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کتاب سراسر جرِثقیل وجغرافیہ وغیرہ کی تلقین ہے، کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ اس عمل اور فعلی کوشش کا مقصود حکومت وسلطنت کا حصول نہیں۔ (یہ ضمنی نتیجہ ہے، یورپ نے اسی کو مقصودِ اصلی تصور کرلیا ہے)، بلکہ انکشافِ حقائق ہے۔ یاایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملقیه[۶:۸۴]۔ پس ہر شدید سعی کا نتیجہ مومن کے نزدیک نظامِ عالم کی حقیقت اصلی کا انکشاف ہے، جس کو قرآن مذہبی اصطلاح میں 'تقائی الہیٰ' سے تعبیر کرتا ہے، یعنی یہ انکشاف نظامِ الہیٰ کی بنا روحانیت پر ہے۔ مضمونِ اجتہاد [فی الاسلام] میں مَیں نے اس پر مفصل لکھا ہے۔[۳۳]

اس میں شک نہیں کہ ان [عنایت اللہ مشرقی] کی تصانیف کسی خارجی اثر کا نتیجہ ہیں۔ مجھے کسی نے کہا ہے کہ مصنف نے تمام اچھی باتیں اسرار و رموز سے لے کر نثر میں لکھ دی ہیں اور تمام بُری باتیں اپنی طرف سے اضافہ کردی ہیں۔ عجمی شاعری پر مجھ سے پہلے مولانا حالی حملہ کرچکے ہیں، البتہ مَیں نے جو حملہ کیا، اس میں گہرائی زیادہ ہے اور یہ حملہ

۳۲: بنام اکبر حیدری، ؟/۸/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۴۴

۳۳: بنام چودھری محمد حسین، ۳۰/۸/۱۹۲۴ء، چہارم، ۱۰۲۲

تصوف کے بعض اسکولوں (کی) شاعری پر خاص طور پر کیا گیا تھا۔ اس میں بھی انھوں نے میری ہی تقلید کی ہے، مگر چونکہ لٹریچر کے نفسیاتی احساسِ ادا، جس کے اثرات سے وہ پورے طور پر آگاہ نہیں، اس واسطے وہ اغلاط میں مبتلا ہوگئے اور لٹریچر کو کلیتہً فضول سمجھنے لگے، یہاں تک کہ حضرت حسانؓ پر بھی اعتراض کرنے سے نہ چوکے۔ میری رائے میں اپنے خیالات کے متعلق خود ان کا ذہن صاف نہیں ہے اور اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ یہ خیالات مستعار ہیں۔ مَیں خود علمِ نبوت کو شعر پر ترجیح دیتا ہوں اور شعر کو محض اس کا خادم جانتا ہوں۔ ان کے نزدیک یہ خدمت کے بھی قابل نہیں اور یہی بات غلط ہے۔ نفسیاتِ انسانی کی رُو سے بھی اور انسانی تجربے کی رُو سے بھی میری رائے میں اگر وہ اپنے طرزِ بیان میں محتاط رہتے تو شاید کوئی شخص ان پر اعتراض نہ کرتا، لیکن ان کا محتاط نہ رہنا بھی اسی وجہ سے ہے کہ ان کا ذہن پورے طور اپنے خیالات کے اندرون و بیرون کے متعلق صاف نہیں ہے۔[۳۴]

....

انجمن حمایت اسلام کا صدر مجھے منتخب کیا گیا تھا، مگر مَیں نے بعض وجوہ سے استعفا دے دیا ہے۔ کونسل میں اختلاف ہے اور عام حالت اس انجمن کی اچھی نہیں ہے۔ بعض ارکان ذاتی اغراض سے اس میں داخل ہیں اور ان کے نزدیک انجمن ان کے اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے اور بس![۳۵]

....

تقدیرِ الٰہی کا مقابلہ تدبیرِ انسانی سے نہیں ہوسکتا۔ [میری اہلیہ مختار بیگم] مرحومہ کی موت کا منظر نہایت دردانگیز تھا۔ بہترین ڈاکٹروں کا علاج تھا، جو دِن میں تین دفعہ اور اگر ضرورت ہو تو اس سے زیادہ دفعہ آتے تھے اور بعض دفعہ رات بھر یہیں رہتے تھے، مگر اللہ کے علم میں مرحومہ کی زندگی کے دِن ختم ہو چکے تھے۔ مرحومہ نے نہایت طمانیت اور سکون سے جان دی۔ موت سے دس پندرہ منٹ پہلے مَیں نے اس کو دیکھا اور حال پوچھا تو اس نے خدا

۳۴: بنام چودھری محمد حسین، ۱۰/۱۰/۱۹۲۴ء، چہارم ۱۰۲۵ ۳۵: بنام سلیمان ندوی، ۵/۹/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۴۶-۵۴۷

کا شکر ادا کیا اور کہا کہ 'اچھی ہوں'، حالانکہ اُس وقت اس کا وقت بالکل قریب تھا اور اس کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ نمونیہ نے اسے سخت کمزور کر دیا تھا، یہاں تک کہ ڈلیوری کی زحمت وہ برداشت کرنے کے ناقابل تھی۔ آخر مَیں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، اس کی جان بچانے کی کوشش کریں اور بچے کا خیال نہ کریں؛ چنانچہ یہی تجویز قرار پائی۔ بچے کو رحم سے نکالنے کے لیے آلات کا استعمال شروع ہی ہوا تھا کہ اس نے جان دے دی۔ مرنے سے قریباً دو گھنٹے پہلے تمام دردِ زہ بند ہو گیا تھا اور یہی علامت بڑی خراب تھی۔ غرض کہ درد کی حالت میں اُس کی حالت بے چارگی اور بے کسی کی تھی کہ میرے لیے اُس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنا بھی مشکل تھا اور میرا قلب سخت رقیق ہو گیا۔ ایک معمولی انسان کو دنیا میں لانے کے لیے، جو پچاس ساٹھ سال سے زیادہ اس دارِ فانی میں نہیں ٹھہرتا، نیچر اس قدر تکلیف ایک ضعیف عورت کو دیتی ہے۔...... مَیں ۲۵ر اکتوبر تک یہیں رہوں گا۔ قُلوں کے بعد جاؤں گا۔[۳۶]

اے دریغا کہ مرگِ ہم سفرے
دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخن پاک مصطفیٰ آورد
بہرِ سالِ رحیلِ او فرمود
بشہادت رسید و منزل کرد[۳۷]
[۱۳۴۳ھ]

سردار بیگمؒ [کو چاہیے کہ] زہرہ اور عائشہ کے نام بہت ہمدردی کا خط لکھے، کیونکہ ان دونوں لڑکیوں کا رونا کوئی شخص کیسا ہی سنگ دل ہو، نہیں سن سکتا۔ اُن کی ہر طرح تسلی کرنی چاہیے اور لکھنا چاہیے کہ مَیں تاعمر تمھاری بہن ہوں اور ہمیشہ تم کو ایسا ہی سمجھوں گی۔ یوں بھی سردار بیگم کو ان دونوں لڑکیوں سے محبت ہے اور اس موقع پر وہ بہت ہمدردی کی مستحق ہیں۔

۳۶: بنام شیخ عطا محمد، ۲۲/۱۰/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۵۶-۵۵۷ ۳۷: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ۵۲۱

جب...... [سردار بیگم] اچھی ہو جائے تو لدھیانہ بھی اظہارِ ہمدردی کے لیے آئے۔[۳۸]

مرحومہ گذشتہ دس بارہ سال میری زندگی میں شریک رہیں اور اس مدت میں انھوں نے جو میری خدمت گزاری کی، کم کسی بیوی نے اپنے شوہر کی کی ہوگی۔ خدا تعالیٰ ان کو اس کا اجرِ جزیل عطا فرمائے۔[۳۹]

ماتم پُرسی کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ طبیعت نہایت پریشان ہے۔ مرحومہ کے بھائیوں نے اس کا تمام زیور اور سامان واپس کر دیے ہیں۔ ہر چند مَیں نے کہا کہ شریعت کی رُو سے اس کے بیشتر حصے کے وارث اس کے بھائی بہن ہیں، مگر انھوں نے ایک نہیں مانی۔ معلوم ہوتا ہے، وہ مرنے سے پہلے اُن سے یہی کہہ گئی تھی۔ اب ارادہ ہے کہ یہ ترکہ اس کی کسی یادگار کی صورت میں صَرف کیا جائے۔ کچھ روپیہ اپنی طرف سے اس میں اضافہ کر دوں گا۔ اگر خدا نے توفیق دی تو بہت اچھی صورت ہو جائے گی۔[۴۰]

....

[حرمِ پاک کی خدمت وحفاظت کا منصب سابق خلیفہ عبدالمجید کے سپرد کرنے کی] تجویز نامناسب ہے اور اگر موجودہ نازک صورتِ حالات میں اس پر زیادہ زور دیا گیا تو اندیشہ ہے کہیں دنیاے اسلام کے پیچیدہ معاملات میں مزید الجھنیں پیدا نہ ہو جائیں۔ ...... اگر اس حالت میں سابقہ خلیفۃ المسلمین کو حاکمِ حجاز بنانے کی کوشش کی گئی تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں ...... میں سخت کشمکش شروع ہو جائے گی۔ مَیں اس انتظام کو عارضی اور ہنگامی طور پر بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ میری راے یہ ہے کہ ایسی تجویز کا پیش کرنا ہی ایک غلطی ہے۔ مَیں حجاز کی موجودہ صورتِ حالات سے پورے طور پر مطمئن ہوں اور ابنِ سعود پر بدون تذبذب اعتماد رکھتا ہوں۔ میری راے میں سلطانِ نجد ایک روشن خیال آدمی ہے اور جو لوگ سلطانِ موصوف سے ملے ہیں یا انھوں نے نجد کو دیکھا ہے، وہ میری اس راے کے مؤید ہیں۔ اس وقت دنیاے اسلام میں گوناگوں تغیرات کا سلسلہ قائم ہے، لیکن ابنِ سعود چونکہ خود

۳۸: بنام شیخ عطا محمد، ۲۲/۱۰/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۵۶ ۳۹: بنام گرامی، ۲۵/۱۰/۱۹۲۴ء، دوم، ۵۵۷

۴۰: بنام شیخ عطا محمد، ۲۷/۱۰/۱۹۲۴ء، ۵۵۸-۵۵۹

نمائندگانِ اسلام کی مؤتمر منعقد کرنے کے خواہاں ہیں، اس لیے توقع ہے کہ وہ اس مؤتمر کے فیصلے کی پابندی کریں۔ بہت ممکن ہے کہ عرب میں ابنِ سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشو و نما پائے اور اس کے آثار و علائم نظر آرہے ہیں۔ اس احساسِ خودی کا ہمیں تہِ دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے، اگرچہ اس کی تہہ میں تجرد و تفرید کے مادہ کے نشو و نما کا ابھی اندیشہ ہے، لیکن ہمیں کچھ مدت تک اس تجرد و تفرید کو بھی برداشت کرنا چاہیے۔ عرب فطرتاً جمہوریت پسند ہیں اور سرزمینِ عرب میں کوئی مطلق العنان حکومت زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی۔[۴۱]

....

بہت سی مصروفیتیں ہیں، نئے گورنر صاحب کے بہت سے ڈنر ہیں، وہاں جانا ہے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کے ایک پروفیسر مجھ سے ملنے آرہے ہیں، وہ میرے متعلق کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔[۴۲]

....

دوسری بیوی کے ہاں خدا کے فضل و کرم سے لڑکا [پیدا] ہوا، جس سے کسی قدر تلافی ہوئی۔ خدائے تعالیٰ کا شکر ہے۔ خوشی ہو یا غم، سب کچھ اسی کی طرف سے ہے اور ہرچہ از دوست می رسد نیکوست۔ بچے کا نام جاوید رکھا ہے۔[۴۳]

والدِ مکرم کی طبیعت پہلے بھی رقیق تھی، اب بہ سبب ضعفِ پیری کے اَور بھی رقیق ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ عمر کا آدمی کوئی رفیق اپنا نہیں دیکھتا، اس کو دنیا نئی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے، جس سے اس کی طبیعت اَور گھبراتی ہے۔[۴۴]

۴۱: گفتارِ اقبال، ۱۰-۱۲

۴۲: بنام شیخ عطا محمد، ۱۹۲۴/۱۱/۵ء، دوم، ۵۶۰

۴۳: بنام شاد، ۱۹۲۴/۱۲/۲۲ء، دوم، ۵۶۵-۵۶۶

۴۴: بنام شیخ اعجاز احمد، ؟/۱۹۲۴/۱۲ء، دوم، ۵۷۳-۵۷۴

۱۹۲۵ء

زبورِ عجم کے لیے ایک مدت درکار ہوگی۔ بہت سے اَور مشاغل ہیں، جن کی طرف توجہ ضروری ہے۔ اگر اسی کام میں سراپا محو ہوسکتا تو اب تک ختم ہوگیا ہوتا[۱]

دکن میں اردو [سید نصیر الدین ہاشمی کی] نہایت مفید کتاب ہے، خصوصاً اس کا پہلا حصہ، جو مَیں نے نہایت غور سے پڑھا۔ اردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ کے لیے جس قدر مسالہ ممکن ہو، جمع کرنا ضروری ہے۔ غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہوگئی تو مؤرخِ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے۔[۲]

....

پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہوگیا تھا، مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی، مَیں نے اجتہاد [فی الاسلام] پر ایک انگریزی مضمون یہاں ایک جلسے میں پڑھا تھا، مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔[۳]

میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے، البتہ فرصت کے اوقات میں مَیں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔ یہ بات زیادہ تر ذاتی اطمینان کے لیے ہے، نہ [کہ] تعلیم و تعلم کی غرض سے۔ اجتہاد پر [لکھتے ہوئے] احساس ہوا کہ یہ

۱: بنام محمد اکبر منیر، ۱۷/۳/۱۹۲۵ء، دوم، ۵۸۱-۵۸۲ ۲: بنام نصیر الدین ہاشمی، ۷/۵/۱۹۲۵ء، دوم، ۵۸۷

۳: بنام اکبر شاہ، ۲۰/۴/۱۹۲۵ء، دوم، ۵۸۴

مضمون اس قدر آسان نہیں، جیسا مَیں نے ابتدا میں تصور کیا تھا۔ اس پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورت میں وہ مضمون اس قابل نہیں کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں؛ کیوں کہ بہت سی باتیں، جن کو مفصل لکھنے کی ضرورت ہے، اس مضمون میں نہایت مختصر طور پر محض اشارۃً بیان کی گئی ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے اُسے آج تک شائع نہیں کیا۔ اب مَیں اِن شاء اللہ اسے ایک کتاب کی صورت میں منتقل کرنے کی کوشش کروں گا، جس کا عنوان یہ ہوگا: *Islam as I understand it*۔ اس عنوان سے مقصود یہ ہے کہ کتاب کا موضوع میری ذاتی رائے تصور کیا جائے؛ جو ممکن ہے، غلط ہو۔[۴]

میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعے میں گزری ہے اور یہ نقطہ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ مَیں اسی نقطہ نگاہ سے حقائقِ اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے مَیں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا۔[۵]

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانۂ حال کے 'جورس پروڈنس' [Jurisprudence] پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ تقریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے)، مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے؛ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ...... غرض کہ یہ وقت عملی کام کرنے کا ہے، کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام پر اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔[۶]

....

۴: بنام صوفی تبسم، ۱۹۲۵/۹/۲ء، دوم، ۵۹۷-۵۹۹   ۵: ایضاً

۶: ایضاً، ۶۰۱-۶۰۴

الحمد للہ علی ذالک، جاوید اب بالکل تندرست ہے، آج پورے ایک سال کا ہو گیا ہے۔اس کی والدہ آج [عقیقے کی غرض سے] قربانی دینے میں مصروف ہے۔[۷]

....

لاہور ہائی کورٹ کی اسامی کے لیے سرکاری فیصلے میں میرا نام بھی مذکور ہوا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے اس احتجاج سے سخت نقصان پہنچے گا، جو اس پر مسلم پریس میں کیا گیا ہے یا کیا جائے گا۔ چیف جج (چیف جسٹس) کا خیال ہے کہ چند اصحاب، جن میں مَیں بھی شامل ہوں، اس ایجی ٹیشن کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اگرچہ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مَیں اس قسم کی کسی سازش کرنے کا قطعاً اہل نہیں ہوں۔ بہرکیف، ان حالات میں میرے لیے بحیثیت وکیل کام کرنا دُشوار ہوگا، بالخصوص اس لیے کہ ماضی میں بھی مختلف طریقوں سے مجھے اعلیٰ عہدے سے محروم رکھا گیا ہے۔مَیں اپنے گرد و پیش کے ماحول سے سخت دل برداشتہ ہو گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہاں سے راہِ فرار اختیار کر لوں۔ کشمیر میرے آبا و اجداد کا وطن تھا اور میرے دل میں ہمیشہ سے اس ریاست سے دل وابستگی رہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ نئے مہاراجا صاحب اپنی سرکار میں کچھ تبدیلیوں کے بارے میں غور کر رہے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو اس معاملے میں سلسلہ جنبانی کے لیے یہ مناسب موقع ہے۔[۸]

۷: بنام شیخ عطا محمد، ۱۹۲۵/۱۰/۵ء، دوم، ۶۰۷ ۸: بنام تھامسن، ۱۹۲۵/۱۰/۱۷ء، دوم، ۶۰۹-۶۱۰

۱۹۲۶ء

جہاں تک مجھے علم ہے، علمانے فکرِ اسلامی کو فلسفہ عہد حاضر کی روشنی میں از سرِ نَو ترتیب دینے کی کوئی کوشش نہیں فرمائی، لیکن دنیاے اسلام کو جو حوادث پیش آ رہے ہیں، ان کی بنا پر[1] ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلام کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس مبحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی، جو میری نظر سے گزری ہے، مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن پر بحث کی ضرورت ہے، مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلیؒ زندہ ہوتے تو مَیں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے...... [سید سلیمان ندوی] کے اس کام کو کون کرے گا۔ مَیں نے ایک رسالہ اجتہاد [فی الاسلام] پر لکھا تھا، مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں، اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔ مسلمانوں پر اس وقت (دِماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آ رہا ہے، جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی، مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہنما نہیں ہے، اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں، نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاحِ لوتھر نے مسیحیت کے لیے کیا کیا نتائج پیدا کیے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علما اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔[2] ہندوستان کے مسلمان، جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالکِ اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دِماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ کیا عجب کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں 'ندوہ' علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو۔[3]

۱: بنام محمد شریف، ؟/۲/۱۹۲۶ء، دوم، ۶۲۶-۶۲۷ ۲: بنام سلیمان ندوی، ۱۸/۳/۱۹۲۶ء، دوم، ۶۲۷-۶۲۹
۳: بنام سلیمان ندوی، ۷/۴/۱۹۲۶ء، دوم، ۶۳۳

بعض خیالات زمانۂ حال کے فلسفیانہ نقطہ نظر کا نتیجہ ہیں، ان کے ادا کرنے کے لیے قدیم فارسی اسلوبِ بیان سے مدد نہیں ملتی ۔بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے، اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے، جو ضرور ہے کہ اہلِ زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں۔ بعض اشعار کے لکھنے میں تو مجھے اس قدر روحانی تکلیف ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔[4]

....

پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی کے باعث جو شرم ناک حالات پیدا ہو رہے ہیں اور صوبے کی فضا جیسی مکدر ہو رہی ہے، اسے کوئی مخلص انسان اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ مَیں دِل سے چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو دُور کر کے ملک میں بھائیوں کی طرح سے رہیں اور بات بات پر ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑتے پھریں۔ میرے بعض احباب نے مجھ سے کہا کہ پنجاب کی مختلف اقوام کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ایک متحدہ کوشش ضروری ہے، جس میں ہر جماعت کے افراد شامل ہوں گے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ میرے پیشِ نظر فی الحال کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے، تاہم اخلاقی اعتبار سے اس میں شرکت کرنا مَیں اپنا فرض سمجھتا ہوں، چنانچہ مَیں ان کی اس کوشش میں شریک ہوا، لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ گوہرِ مقصود یہاں بھی مفقود ہے اور ملک میں ابھی حصولِ مقصد کے امکانات بہت کم ہے۔ اس بنا پر مَیں نے اس جماعت سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد، چند روز ہوئے، مسٹر چنتامنی کا تار میرے نام موصول ہوا، جس میں مجھ سے استدعا کی گئی تھی کہ مجوزہ نیشنلسٹ کانفرنس کے داعیوں میں اپنا نام درج کرنے کی اجازت دیجیے۔ مَیں نے رسمی طور پر جلسے کا داعی بننا منظور کر لیا اور ان کو اجازت دے دی کہ وہ میری طرف سے دستخط کریں، جس سے میری مراد کسی سیاسی جماعت کی موافقت یا مخالفت نہ تھی، نہ مسٹر چنتامنی کے تار میں ایسے الفاظ تھے، جن سے معلوم ہوتا کہ ان کا جلسہ

۴: بنام سلیمان ندوی، ۱۸/۳/۱۹۲۶ء، دوم، ۶۲۹

کسی سیاسی جماعت کی مخالفت کے لیے ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ان کے جلسے کا مقصود بالخاصہ سوراجی جماعت کی مخالفت تھا۔ میں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رہا ہوں، البتہ میری خواہش یہ رہی ہے اور ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں کہ موجودہ فضا ملک کے لیے بالبداہت باعثِ ننگ ہے اور مختلف اقوام کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کے لیے نہایت مضرت رساں ہے۔ کسی سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق نہیں: ہاں، اہلِ ہند کے باہمی تعلقات کی درستی میں ہر مخلص شخص کے ساتھ ہوں۔[5]

....

عبادات کے متعلق کوئی ترمیم و تنسیخ میرے پیشِ نظر نہیں ہے، بلکہ میں نے اپنے مضمون اجتہاد [فی الاسلام] میں ان کی ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہاں، معاملات کے متعلق بعض سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں، اس ضمن میں چونکہ شریعتِ احادیث (یعنی وہ احادیث، جن کا تعلق معاملات سے ہے) کا مشکل سوال پیدا ہو جاتا ہے اور ابھی تک میرا دل اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہوا، اس واسطے وہ مضمون شائع نہیں کیا گیا۔ میرا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے، مگر غلامانہ انداز میں نہیں، بلکہ ناقدانہ انداز میں۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے۔ یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا، مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادّہ پیدا ہوا تو انھوں نے اسی فلسفے کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ اِس عصر میں بھی معاملات کے متعلق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے۔ قاعدۂ میراث کے حصص کے متعلق میں نے مضمون اجتہاد میں یہی طریق اختیار کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لڑکی کو لڑکے سے آدھا حصہ ملنا عین انصاف ہے، مساوی حصہ ملنے سے انصاف قائم نہیں رہتا ہے۔ میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں 'قدیم' ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے، جیسا کہ 'جدید'، بلکہ میرا ذاتی میلان 'قدیم' کی طرف ہے، مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی

5: گفتارِ اقبال، ۱۳۰-۱۴

ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ، دونوں طبقے علومِ اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ اس بے خبری سے یورپ کے 'معنوی استیلا' کا اندیشہ ہے، جس کا سدِ باب ضروری ہے۔[6]

....

مضمون اجتہاد [فی الاسلام] کی تکمیل کے بعد حافظ ابنِ قیم کی کتاب طرق الحکمیہ اور اس کے بعد المقابلات پر لکھنے کا ارادہ ہے۔[7]

....

غالب گمان یہ ہے کہ [پنجاب کونسل کے الیکشن میں] کوئی ہماری مخالفت کے لیے کھڑا نہیں ہوگا، مگر ہمیں اپنی والی احتیاط لازم ہے[8] [اور اب] یہ خبر پڑھ کر کہ ملک محمد حسین صاحب صدرِ بلدیہ لاہور، پنجاب کونسل کی امیدواری سے میرے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں، مجھے بہت مسرت ہوئی۔ مَیں ملک صاحب کی اس عنایت فرمائی کا تہ دل سے شکرگزار ہوں اور ان کے اس جذبے کو بے انتہا قابلِ تعریف سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں برادریوں کے افتراق کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے اور اتحادِ مسلمین کے مقصدِ عزیز کے لیے انتہائی ایثار سے کام لے سکتے ہیں۔[9]

مَیں انگریزی، اردو، فارسی میں برنگِ نثر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا، لیکن یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ طبائع نثر کی نسبت شعر سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں، لہٰذا مَیں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقشِ قدم پر چلانے اور نااُمید، بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ مَیں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی۔ اَب اُن کی بطرزِ خاص عملی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ اسلامیانِ ہند پر عجب دَور گزر رہا ہے، ۱۹۲۹ء میں ایک شاہی مجلس تحقیقاتِ اصلاحات، جسے رائل کمیشن کہتے ہیں، یہ تحقیق کرے گی کہ آیا ہندوستان مزید رعایات و اصلاحات کا مستحق ہے یا نہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اس باب میں

۶: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۲۶/۴/۷ء، دوم، ۶۳۲-۶۳۳
۷: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۲۶/۴/۲۴ء، دوم، ۶۳۵
۸: بنام میاں عبدالعزیز، ۱۹۲۶/۸/۳ء، دوم، ۶۴۵
۹: بنام زمیندار، ۱۹۲۶/۱۰/۳ء، دوم، ۶۵۰-۶۵۱

پوری توجہ سے کام لیں اور اپنے حقوق کا تحفظ کریں۔ [پنجاب کونسل کے] ممبر کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی اور قومی منفعت کی ٹکر کے وقت اپنے شخصی مفاد کو مقاصدِ قوم پر قربان کر دے۔ مَیں اغراضِ ملّی کے مقابلے میں ذاتی خواہشوں پر مر مٹنے کو موت سے بدتر خیال کرتا ہوں۔[۱۰]

اگر قوم متفقہ طور پر مجھے دستبردار ہونے کا حکم دے تو مَیں حکم کی تعمیل کے لیے بسروچشم تیار ہوں۔ مَیں ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانا بدترین گناہ سمجھتا ہوں۔ مَیں عنقریب نوجوانوں کا ایک جیش تیار کروں گا، جو مسلمانوں کے درمیان فرقہ پرستی کی موجودہ لعنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گا۔[۱۱]

مذہب جیسی مقدس چیز کو الیکشن کی آڑ نہ بنایا جائے اور باہمی اتفاق سے کام لیا جائے۔ ہم کو پھر ابراہیمی کام کرنا ہے اور ذات پات کے بُتوں کو پاش پاش کرنا ہے۔ مَیں نوجوانوں کے سامنے عنقریب ایک سوشل پروگرام پیش کرنے والا ہوں۔[۱۲]

[مجھ پر دو الزامات لگائے گئے ہیں کہ مَیں قادیانی ہوں اور یہ کہ رُشد و ہدایت کے کسی سلسلہ طریقت سے تعلق نہیں رکھتا]، دونوں کی نسبت میرا وضاحتی حلفیہ بیان یہ ہے کہ مَیں حنفی ہوں اور کٹر حنفی ہوں...... مَیں اور میرے خاندان کی نسبت سلطانِ عرب و عجم حضرت شیخ عبدالقادر غوث الاعظم محی الدین جیلانی سے ہے۔[۱۳]

مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ مَیں نے برسوں مطالعہ کیا، راتیں غور و فکر میں گزاریں، تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں، جس پر کاربند ہو کر عرب حضور سرورِ کائناتؐ کی محبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق ہے، جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے۔ کاش! ہر مسلمان کے دل میں بیٹھ جائے۔ ......
مسلمانانِ ہند کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسیات کے ساتھ گہری

۱۰: گفتارِ اقبال، ۱۶۔۱۷
۱۱: زندہ رُود، ۳۶۸
۱۲: ایضاً، ۶۴
۱۳: اقبال اور گجرات، ۴۵

دل بستگی پیدا کریں۔ جو لوگ خود اخبار نہ پڑھ سکتے ہوں، وہ دوسروں سے سنیں۔ اس وقت جو قوتیں دنیا میں کارفرما ہیں، اُن میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں، لیکن لیظھرہ علی الدین کلہ [۲۸:۴۸] کے وعدے کی بِنا پر میرا ایمان ہے کہ انجامِ کار اسلام کی قوتیں کامیاب و فائز ہوں گی؛ لا تھنوا و لا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین [۱۳۹:۳]۔[۱۴]

....

اب کے مَیں اہلِ لاہور کے اصرار سے پنجاب کونسل کے الیکشن میں گرفتار تھا۔ الحمدللہ کہ تین ہزار کی مجارٹی سے کامیاب ہوا۔[۱۵]

جن بے شمار احباب نے پنجاب کونسل کی ممبری میں میری کامیابی پر مبارک باد کے تار اور خطوط ارسال فرمائے ہیں، ان کا فرداً فرداً جواب دینا میرے لیے بے انتہا مشکل ہے، اس لیے زمیندار کی وساطت سے ان سب کا دِلی شکریہ ادا [کیا]۔[۱۶]

۱۴: گفتارِ اقبال، ۱۸، ۱۹
۱۵: بنام شاد، ۱۹۲۶/۱۲/۲۸ء، دوم، ۶۵۳
۱۶: بنام زمیندار، ۱۹۲۶/۱۲/۲۲ء، دوم، ۶۵۲

۱۹۲۷ء

محمود شبستری نے جن سوالات کا جواب گلشن راز میں دیا ہے، [مثنوی گلشن راز جدید میں] انھی سوالات پر مَیں نے زمانۂ حال کے مشاہدات و تجربات کے لحاظ سے نظر ڈالی ہے۔[1]

....

چند احباب کی تجویز ہے کہ آئندہ سال لاہور میں یورپین مسلمانوں کی ایک کانفرنس کی جائے، جس کا خرچ قریباً تیس ہزار روپیہ ہوگا۔[2] چندہ اس کانفرنس کے لیے اِن شاء اللہ ہو جائے گا، بڑے آدمیوں کی منت نہیں کرنی پڑے گی۔ فی الحال تین آدمیوں نے آٹھ ہزار روپیہ جمع کر دینے کا وعدہ کرلیا ہے، باقی روپیہ بھی اس غرض کے لیے عام مسلمان دینے کو تیار ہو جائیں گے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ رقمِ مطلوبہ کا بہت بڑا حصہ غالباً لاہور ہی سے جمع کرلوں گا، بلکہ میرا ارادہ یہ ہے کہ جب تک رقمِ مطلوبہ کے وعدے پرائیویٹ طور پر نہ ہو جائیں، اس کانفرنس کے متعلق کوئی اعلان نہ کیا جائے۔ یورپ اور امریکا سے کم از کم آٹھ دس آدمیوں کو دعوت دی جائے گی، باقی جو مسلمان یورپین ہندوستان میں موجود ہیں، اُن کی فہرست تیار کی جائے گی۔ کم از کم سو یورپین مسلمان اس کانفرنس میں جمع ہو جائیں تو خوب ہو۔ کانفرنس کے اجلاسوں کے لیے ٹکٹ لگانے کا قصد ہے۔ مسٹر پکتھال کو مَیں نے حیدر آباد خط لکھا تھا، اُن کو اس خیال سے، نہ معلوم کیوں ہمدردی نہیں۔ مَیں انگلستان سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔ اگر کچھ کمی چندے میں رہ گئی تو والیِ بھوپال سے مدد کی التجا کرنا بہتر ہوگا۔[3]

۱: بنام گرامی، ۱۳۰/۱/۱۹۲۷ء، دوم، ۶۵۷   ۲: بنام نیرنگ، ۲۰/۱/۱۹۲۷ء، دوم، ۶۶۰

۳: بنام نیرنگ، ۲۴/۱/۱۹۲۷ء، دوم، ۶۶۰-۶۶۱

میری کتاب زبورِ عجم ختم ہوگئی ہے۔ ایک دو روز تک کاتب کے ہاتھ میں جائے گی اور پندرہ دِن کے اندر اندر شائع ہو جائے گی۔[4]

....

مسٹر محمد یعقوب ۷رمئی کو شملہ جانے والے ہیں، اس واسطے ضروری ہے کہ اُن کے جانے سے پہلے جس قدر مَیں لکھوا سکوں، لکھا لیا جائے۔ مَیں ان سے پہلا لیکچر، جو دیباچے کے طور پر ہوگا، لکھوانا شروع کر دوں گا۔ اس طرح ممکن ہے کہ دسمبر تک سب لیکچر ختم ہو جائیں، ان کے جانے کے بعد کسی اَور شارٹ ہینڈ رائٹر کو بلا لیا جائے گا۔[5]

....

مجھے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ مَیں سب سے پہلا ہندوستانی ہوں، جس نے اتحادِ ہند مسلم کی اہمیت وضرورت کا احساس کیا اور میری ہمیشہ سے آرزو ہے کہ یہ اتحاد مستقل صورت اختیار کرے، لیکن حالات حلقہ ہائے انتخاب کے اشتراک کے لیے موزوں نہیں ہیں اور ہمارے صدر [سر محمد شفیع] نے ہندو رہنماؤں کی تقریروں کے جو اقتباسات اپنے خطبہ صدارت میں دیے ہیں، اُن سے ہندوؤں کی افسوس ناک ذہنیت آشکار ہوتی ہے۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت ہے اور اگر کوئی اَور وجہ نہ بھی ہوتی تو تنہا اسی وجہ سے حلقہ ہائے انتخاب الگ رکھے جائیں۔...... ایک طرف ہندوؤں کی کوششیں اُن کے خلاف ہو رہی ہیں، دوسری طرف حکومت کے موجودہ نظام کی سرگرمیاں مسلمانوں کے خلاف جاری ہیں۔ ان مصیبتوں میں بچاؤ کی صورت محض یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور مردانہ وار ہر مصیبت کا مقابلہ کریں۔[6]

مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کبھی سمجھوتے [تجاویزِ دہلی] پر رضامند ہوسکیں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر مسلمان زعما ہندو لیڈروں کی سب شرطیں مان لیں اور بلاشرط مفاہمت کی پیش کش کریں، جب بھی ہندو اس سے انحراف کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی کریں گے۔[7]

۴: بنام گرامی، ۳۱/۱/۱۹۲۷ء، دوم، ۲۶۲

۵: بنام عبداللہ چغتائی، ۳۰/۴/۱۹۲۷ء، دوم، ۲۶۹

۶: گفتارِ اقبال، ۲۷-۲۸

۷: اقبال کا سیاسی کارنامہ، ۱۶۶

۴/مئی کو مَیں ڈبی بازار میں تقریر کر رہا تھا کہ حاضرین میں سے کسی نے مداخلت کی اور کہا کہ سکھوں کے پاس تو کرپانیں ہیں، مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں، وہ بھلا اپنی حفاظت کس چیز سے کریں؟ [میرا خیال ہے کہ] مسلمانوں کے رہنماؤں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ اگر اپنی حفاظت اور اغیار کے حملوں کی مدافعت کے لیے مسلمانوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ ملے تو کونسل کے تمام مسلمان علی العموم (اور مَیں علی الخصوص) اس کے لیے سعی بلیغ کریں گے۔[۸]

جو افسوس ناک فرقہ وارانہ فسادات لاہور میں ہوئے ہیں، جن کے نتیجے میں جان و مال کا سخت نقصان ہوا ہے، ان کی سب کو مذمت کرنی چاہیے۔ گذشتہ اتوار کو کمشنر صاحب کے دفتر میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ممتاز شہریوں پر مشتمل مصالحتی کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ یہ کمیٹیاں ایسی تدابیر تجویز کریں، جن سے آئندہ ایسے ناخوش گوار واقعات رُونما نہ ہونے پائیں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رائے بہادر لالہ موتی لال ساگر کے دولت کدے پر ایک میٹنگ مؤرخہ ۱۳/۹/۱۹۲۷ء کو شام ساڑھے چار بجے بلائی گئی ہے۔[۹]

ہمیں لاہور کے فسادات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صرف یہ حقیقت کہ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے برطانوی تحفظ کی ضرورت ہے، یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہم کس منزل پر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت نے مجھے اپنے سیاسی خیالات اور سیاسی عقائد پر ازسرِ نَو غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں، خاص طور پر دیہاتی مسلمانوں میں، جو ہماری قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہیں، جہالت عام ہے اور کسی قسم کی سیاسی یا اقتصادی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔ قوم کی قوتوں کو فرقہ بندی اور ذاتوں کی تقسیم نے علیحدہ منتشر کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سراسر غیر منظم کے غیر منظم ہیں۔ اب مَیں اس امر کا قائل ہوگیا ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی تنظیم اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔[۱۰]

۸: گفتارِ اقبال، ۳۲

۹: بنام میاں عبدالعزیز، ۱۱/۵/۱۹۲۷ء، دوم، ۶۷۰

۱۰: گفتارِ اقبال، ۳۷

مسلمانانِ مزنگ نے مسلم ریلیف کمیٹی کو اس سے پہلے پانچ سو روپیہ بھیجا ہے۔ آج دوسری قسط سات سو روپے کی ان کی طرف سے موصول ہوئی ہے (بذریعہ چیک)۔ یہ بارہ سو روپیہ کی رقم خان بہادر میاں چراغ دین صاحب اور ان کے احباب کی مساعی کا نتیجہ ہے۔[۱۱]

آج ککے زئی برادری کی طرف سے مبلغ ایک ہزار روپیہ مسلم ریلیف کمیٹی کو عطا کیا گیا ہے۔ یہ روپیہ برادریِ مذکور نے خان بہادر ملک محمد حسین صاحب پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی لاہور کو سرکار کی طرف سے خطاب ملنے کے موقع پر ان کی دعوت کے لیے جمع کیا تھا۔ ملک صاحب موصوف اور ان کی برادری نے مسلمانانِ شہر کی فوری ضروریات کو مقدم سمجھا اور سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا یہ رقم خطیر اعانتِ مجروحین و مظلومین کے لیے دے دی جائے۔ اس روپیہ کو پہلی قسط تصور کرنا چاہیے۔ ملک صاحب کے وارڈ میں الگ چندہ ہو رہا ہے، جو عنقریب وصول ہوگا۔[۱۲]

....

میری بیوی دفعتہً بہت بیمار ہوگئی ہے، اس وجہ سے مَیں مذاکرۂ طبیہ کے جلسے میں، جو شام کو اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں میرے زیرِ صدارت ہونے والا ہے، حاضر نہیں ہوسکوں گا۔ جلسے کا وقت شام کا ہے اور اُسی وقت ڈاکٹر صاحب آنے والے ہیں۔ کل بخار ۱۰۶ درجے سے زیادہ ہوگیا تھا، اس تردد و فکر کی حالت میں جلسے میں جا کر تقریر کرنا میرے لیے مشکل ہے۔[۱۳]

....

لاہور میں جو کچھ ہو رہا ہے، یہ دل شکن واقعات حکومت کی غیر جانب داری پر سے اعتقاد اٹھانے کے لیے کافی ہیں۔ مَیں ان واقعات کے لیے ضروری مواد جمع کر رہا ہوں، تاکہ ایک دِن اسے برطانوی عوام کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ فی الحال گورنر صاحب سے ملاقات کی تجویز پر غور کر رہے ہیں۔ تازہ واقعہ یہ ہوا ہے کہ میرے قریب ہی گوالمنڈی میں ہندوؤں کے ایک مکان سے خشت باری کے نتیجے میں ایک مسلمان زخمی ہوا ہے۔ کل سہ پہر

۱۱: بنام مدیر انقلاب، ۱۹۲۷/۱۰/۱۵ء

۱۲: بنام انقلاب، ۱۹۲۷/۵/۳۱ء، دوم، ۶۷۲

۱۳: بنام عبداللہ چغتائی، ۱۹۲۷/۵/۳۱ء، دوم، ۶۷۲۔ ۶۷۳

تین مسلمان مجھ سے ملنے آئے اور تین افراد کی موجودگی میں بیان کیا کہ پولیس اسے ڈرا دھمکا کر یہ بیان حاصل کرنا چاہتی ہے کہ جس مکان سے اینٹ پھینکی گئی، وہ مختلف تھا۔ یہ ہندوؤں کی طرف سے مسلم کشی اور سول وار کے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔[14]

....

ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی ابتلا نہیں ہو سکتی، جو اس وقت درپیش ہے۔ راجپال کی تصنیف نے، جس کا نام لینا مَیں پسند نہیں کرتا، مسلمانوں کے قلب کے نازک ترین حصے کو چوٹ لگائی ہے۔[15]

ہم باتیں ہی کرتے رہے اور ترکھانوں کا ایک لڑکا [علم دین، گستاخِ رسول کو قتل کر کے] بازی لے گیا۔[16]

....

مَیں نہیں سمجھا کہ اراکین [پنجاب] کونسل نے یہ محسوس کیا ہے یا نہیں کہ ہم حقیقتاً خانہ جنگی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر اسے سختی کے ساتھ فرو نہ کیا گیا تو...... باقی ماندہ ملک اور دیہات میں بھی لوگ ایک دوسرے مدِ مقابل آ گئے تو خدا ہی جانتا ہے کہ یہ سلسلہ ہمیں کہاں تک پہنچا کر دم لے گا۔[17]

....

مولانا [گرامی] مرحوم کا کلام تیار ہو گیا...... [مگر]...... افسوس ہے کہ مجھے دیباچہ لکھنے کی مطلق فرصت نہیں، البتہ مَیں چودھری محمد حسین صاحب کے سپرد یہ کام کروں گا اور ان کو اس کام کے متعلق ضروری ہدایات دے دوں گا۔ وہ میرے مشورے سے لکھتے جائیں گے، اس کے علاوہ مجھے پورا کلام بھی سنا دیں گے۔[18]

....

۱۴: بنام فضل حسین، ۱۹۲۷/۶/۱۳ء، دوم، ۶۷۴-۶۷۵
۱۵: گفتارِ اقبال، ۴۲
۱۶: زندہ رُود، ۳۸۰
۱۷: علامہ اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات، ۷۵
۱۸: بیگم گرامی، ۱۹۲۷/۹/۱۳ء، دوم، ۶۷۷-۶۷۸

مؤرخہ ۱۴ر اکتوبر کو مبلغ تین سو اور ڈھائی سو روپیہ کی دو رجسٹریاں گئے بعد دیگرے موصول ہوئیں۔ یہ دونوں رجسٹریاں ایسے آڑے وقت پر پہنچی ہیں کہ کمیٹی کو ایک پیسہ بھی مہیا کرنا محال تھا۔ اس امدادِ غیبی کے پہنچنے سے جو خوشی ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے، لیکن ان تمام مسرتوں سے زائد جس شے نے دل کو قوی کیا، وہ یہ تھی اب بھی مسلمانوں میں اسلامی حمیت باقی ہے کہ کوسوں دُور بیٹھے ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کی حالتِ زار کو فراموش نہیں کرتے۔[19]

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس ملک میں محمڈن لا کے مسئلے کو سنجیدگی سے اٹھائیں۔ برطانوی عدالتوں نے بشمولہ ہائی کورٹ اور پریوی کونسل بتدریج اور غیر محسوس طور پر اسلام کے قانون کو اُلٹی چھری سے ذبح کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ کسی حد تک مسلمان وکلا کی نااہلی کے سبب ہوا ہے، جنھوں نے کبھی اس نظامِ قانون کے اصولوں کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا ہے اور اس کو قرونِ وسطیٰ کے تصورات پر مبنی سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی بات بعید از حقیقت نہیں ہو سکتی۔[20]

بلاشبہ اس [سائمن کمیشن] میں کسی ہندوستانی کا نہ لیا جانا ہندوستان کے وقار پر حملہ ہے، لیکن اس حملے کی وجہ وہ بے اعتمادی اور بدظنی ہے، جو ہندوستان کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے متعلق ہے۔...... پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر کامل غور و خوض کے بعد ایک قرارداد منظور کی ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ [سائمن] کمیشن کا بائیکاٹ ملکی زاویہ نگاہ سے علی العموم اور اسلامی نقطہ نگاہ سے علی الخصوص نقصان رساں ہو گا۔ میرے خیال میں یہ قرارداد پنجابی مسلمانوں کے احساسات کا آئینہ ہے۔...... اس ملک کی قلیل التعداد جماعتوں کو رائل کمیشن کی آمد سے بڑھ کر اپنے اندیشے، اپنی امیدیں اور اپنے مقاصد ظاہر کرنے کا اَور کوئی موقع نہیں مل سکتا۔ میری رائے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنی اپنی تہذیبوں کے مطابق نشو و ارتقا حاصل کریں۔ یہ مقصد حاصل ہونا چاہیے، خواہ مغرب کے دستوری اصول سے حاصل ہو یا کسی دوسرے ایسے ذریعے سے، جو وقت کے مطابق ہو اور لوگوں کی ضروریات پوری کرے۔[21]

۱۹: بنام زمیندار، ۲۷/۱۰/۱۹۲۷ء، دوم، ۶۸۲
۲۰: بنام مولانا محمد علی، ۳۱/۱۰/۱۹۲۷ء، دوم، ۶۸۳
۲۱: گفتارِ اقبال، ۵۰، ۵۲- ۵۳

چند روز ہوئے، مسٹر جناح اور چند ایک دیگر سر برآوردہ اشخاص نے ایک اعلان شائع کیا تھا، جو ملک کے موجودہ ناگوار حالات کی طرف سے پریشان کر دینے والی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس اعلان میں اس حقیقتِ عظمیٰ کو نظر انداز کر دیا گیا کہ رائل کمیشن موجودہ تاسف زار حالات ہی کی پیدائش ہے...... ہم نہایت عاجزی سے اہلِ وطن کو بالعموم اور مسلمان بھائیوں کو بالخصوص متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ مقاطعے کی لاحاصل روِش اختیار کرنے سے، جیسا کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیالوں نے تجویز کی ہے، افسوس اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا...... یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے ان حقوق کا تحفظ کر لیں، جو ہندو ہمیں دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ جن مسلمانوں نے مسٹر جناح کے اعلان پر دستخط کیے ہیں، ان میں سے بعض تو ایسے صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں مسلمان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ اُن کی روِش پنجاب اور بنگال ایسے صوبوں کے مسلمانوں کی حکمت عملی کو تبدیل یا وضع نہیں کر سکتی...... ہمارا صاف اور غیر مبہم رویہ اس خیال پر قائم ہے کہ ملک کی اکثریت سے اپنے منصفانہ حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہ کر ہم یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ایسا قیمتی وقت ضائع کرنا ہمارے اہم مفاد کے منافی ہوگا۔ ہم نہایت جرأت اور زور سے کہتے ہیں کہ ہم کرایے کے ٹٹو بننے کے لیے تیار نہیں۔ مسٹر جناح اور دیگر حضرات نے یہ فقرہ اڑا لیا ہے کہ ہماری خودداری ہمیں رائل کمیشن کی تائید کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ فرقہ وار جنگ اور خودداری یکجا قائم نہیں رکھی جا سکتیں۔ تدبر کا اقتضا یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جذبات کو عقل اور دلیل پر حاوی نہ ہونے دیں۔[22]

[لاہور کے بجائے] کلکتہ میں [مسلم لیگ کا] اجلاس منعقد کرنے کے وجوہ کچھ اُور ہی ہیں اور وہ نہیں، جو ہمیں یا پبلک کو بتائے جا رہے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کلکتہ میں مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ۲۰ رمارچ کی منظور کردہ تجاویزِ دہلی کو مسلمان قوم کے سر منڈھنے کا موقع لاہور کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ مسلمانانِ پنجاب متفقہ طور پر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے حامی ہیں۔[23]

۲۲: گفتارِ اقبال، ۵۳-۵۶ ۲۳: ایضاً، ۶۰

۱۹۲۸ء

مسٹر جناح اور ان کے رفقا نے بدقسمتی سے قومی زندگی کی ایسی حالت کا تصور کر رکھا ہے، جو حقیقت میں مفقود ہے۔...... مسٹر جناح کو بخوبی علم ہے کہ تقرر کمیشن کا اعلان ہونے سے پہلے مسلمانوں نے متعدد مرتبہ اکثریت سے درخواست کی کہ باہمی اختلافات کا تصفیہ کرائیں۔ پھر مؤتمر اتحاد شملہ میں مسلمانوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے شکوے کی آواز بلند کی اور اب اس موقع پر پھر مسلمان ان کو صلح کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس تماشے میں مسٹر جناح چیف ایکٹر رہے ہیں۔ کیا وہ ہم کو بتلا سکتے ہیں کہ ان کو کبھی ہندوؤں کی جانب سے سوائے سخت ہٹ دھرمی کے اَور کوئی جواب ملا ہے؟...... اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ دولت، رسوخ، سیاسی قیادت اور تعداد کے لحاظ سے ہم ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لیے جب تک ہم ہندوؤں اور انگریزی حکومت دونوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ مستعدی اور سرگرمی سے نہ کریں، ہماری سیاسی موت مسلمہ امر ہے۔ اب قیاسات اور جذبات کی گنجائش نہیں، ہمیں ٹھوس دلائل کی ضرورت ہے۔[1]

اس وقت مسلمانوں کے سامنے دو مسائل پیش ہیں؛ ایک حصولِ سواراج کا معاملہ اور دوسرا فرقہ وار نیابت کے قیام کا معاملہ...... بدقسمتی سے ملک کی اکثریت کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو حصولِ سوراج کے مسئلے کی طرف سے بددل کر رکھا ہے۔ اب انھیں اپنے حقوقِ ملی کے تحفظ کی فکر لاحق ہو رہی ہے اور مسلمانانِ ہند کی ترقی کا انحصار اس مسئلے پر ہے۔[2]

....

۱: گفتارِ اقبال، ۶۱-۶۴ ۲: ایضاً، ۶۴

اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا گوارا نہیں ہو سکتا۔ افسوس، اہلِ خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دُور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دِکھا رہے ہیں، جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا۔[3]

....

پنجاب مسلم لیگ کی طرف سے میمورنڈا [memoranda] سائمن کمیشن کو بھیجا جائے گا، جس میں مفصل حالات اور مسلمانوں کے مطالبات درج ہوں گے۔ انگلستان میں پراپیگنڈا کا وقت اس سال نہیں، آئندہ سال آئے گا۔ افسوس کہ مسلمان پورے طور پر بیدار نہیں اور یوں بھی مفلس ہیں۔ امرا اَور خیالات میں غرق ہیں، علما مذہبی جھگڑوں میں مصروف ہیں، بعض خود غرض لوگ محض اپنی گرم بازاری کے لیے مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرتے رہتے ہیں۔[4]

....

مجھے دردِ گردہ کی شکایت رہی، جس کا سلسلہ ایک ماہ سے اوپر جاری رہا۔ جدید طبی آلات کے ذریعے گردے کا معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ گردے میں پتھر ہے اور کہ عملِ جراحی کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے، مگر اعزا اور دوست عملِ جراحی کے خلاف ہیں۔[5] ڈاکٹروں نے ولایت جا کر آپریشن کروانے کی صلاح دی۔ مَیں جانے کو تیار ہو گیا۔ اتنے میں مولوی میر حسن صاحب کا سیالکوٹ سے خط پہنچا۔ انھوں نے آپریشن کی مخالفت کی، مَیں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اسی اثنا میں دہلی سے حکیم نابینا صاحب کا خط آیا کہ مجھے اخبار کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ آپ پتھری کا آپریشن کروانے ولایت جا رہے ہیں۔ آپ دہلی آ جائیں، بغیر آپریشن کے پتھری دُور ہو جائے گی۔[6] درد فی الحال رُک گیا ہے اور مَیں حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے کی خاطر آج شام دہلی جا رہا ہوں، وہاں چند روز قیام رہے گا۔ اس کے بعد تبدیلیِ ہوا کے لیے چند روز کے لیے شملہ میں قیام کروں گا۔ اس طویل علالت نے مجھے

3: بنام سلیمان ندوی، ۱۸/۳/۱۹۲۸ء، دوم، ۶۹۶
4: بنام خان نیاز، ۳۰/۳/۱۹۲۸ء، دوم، ۶۹۸
5: بنام خان نیاز، ۱۵/۶/۱۹۲۸ء، دوم، ۶۹۹
6: ملفوظاتِ اقبال، ۱۳۵

کمزور کر دیا ہے۔[7]

حکیم [نابینا] صاحب نے گولی دی کہ اسے ابھی کھا لیں۔ پانچ بجے سہ پہر تک گرانی جاتی رہے گی، چنانچہ ویسے ہی ہوا۔ باقاعدہ علاج کے لیے دوائی دے کر رخصت کر دیا۔ لاہور آ کر دوائی شروع کی تو پیشاب کا رنگ سیاسی مائل ہونا شروع ہوا۔ روز بروز زیادہ سیاسی مائل ہوتا گیا، آخر کم ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ اصلی رنگ پر آ گیا۔ سال بھر دوائی کھاتا رہا، اس کے بعد دس سال سے دردِ گردہ نہیں ہوا۔[8]

....

اخبارات میں [شفیع] لیگ کی یادداشت کا جو اقتباس شائع ہوا ہے، اس میں مکمل صوبائی خودمختاری کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ دوسرے، اس میں وحدانی طرز کی صوبائی حکومت کی تجویز پیش کی گئی ہے، جس میں امن وامان اور عدل کے محکمے براہِ راست گورنر کی تحویل میں دے دیے گئے ہیں۔ میرے لیے یہ کہنا بمشکل ضروری ہوگا کہ اس تجویز میں دو عملی مضمر ہے اور اسے مطلق آئینی ترقی نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ میں اَب بھی اپنی راس رائے پر قائم ہوں، جس کا اظہار مَیں نے مسودہ کمیٹی کے پہلے اجلاس میں کیا تھا، یعنی آل انڈیا مسلم لیگ مکمل صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرے۔ ان حالات میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری نہیں رہنا چاہیے۔[9]

....

فرصت کے اوقات الٰہیاتِ اسلامیہ پر لیکچر لکھنے میں صَرف ہوں گے، جن کا وعدہ مَیں مسلم ایسوسی ایشن مدراس سے کر چکا ہوں۔ اگر فروری ۲۹ء تک یہ لیکچر لکھ سکا تو مدراس میں پڑھے جائیں گے۔[10]

مَیں ذاتی طور پر ترجموں کا قائل نہیں ہوں۔ مَیں نے خود پہلے اَسرارِ خودی اردو میں لکھنی شروع کی تھی، مگر مطالب ادا کرنے سے قاصر رہا۔ جو حصہ لکھا گیا تھا، اس کو تلف کر

۷: بنام خان نیاز، ۱۹۲۸/۶/۱۵ء، دوم، ۶۹۹-۷۰۰ — ۸: ملفوظاتِ اقبال، ۱۳۵
۹: علامہ اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات، ۲۷۵-۲۷۶ — ۱۰: بنام تمکین کاظمی، ۱۹۲۸/۹/۱۸ء، دوم، ۷۰۷

دیا گیا۔ کئی سال بعد پھر یہی کوشش میں نے کی، قریباً ڈیڑھ سو اشعار لکھے، مگر میں ان سے مطمئن نہیں ہوں۔[11]

لیکچروں کے ترجمے کا کام ناممکن نہیں تو مشکل اور ازبس مشکل ضرور ہے۔ ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں، جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں مَیں نے فلسفہ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اردو خواں دنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے، کیونکہ بہت سی باتوں کا علم، مَیں نے فرض کرلیا ہے کہ پڑھنے والے (یا سننے والے) کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ تین لیکچر امسال لکھے گئے ہیں اور تین آئندہ سال لکھوں گا اور مدراس ہی میں دسمبر ۲۹ء یا جنوری ۳۰ء میں دوں گا۔ حیدرآباد دکن بھی ٹھہروں گا، کیونکہ عثمانیہ یونیورسٹی کا تار آیا ہے کہ لیکچر وہاں بھی دیے جائیں۔ آئندہ دسمبر تک یہ تمام لیکچر تیار ہوکر چھپ جائیں گے۔[12]

مندرجہ ذیل تین خطبات مدراس اور حیدرآباد میں حسب ذیل ترتیب میں دیے جائیں گے:

(۱) علم اور مذہبی مشاہدات

(۲) مذہبی مشاہدات اور فلسفیانہ معیار

(۳) ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا[13]

امید ہے کہ مَیں ۱۵؍جنوری ۱۹۲۹ء سے قبل حیدرآباد پہنچوں گا۔ میرے خطبات کی تاریخ ۱۵، ۱۶، ۱۷؍جنوری رکھ سکتے ہیں۔ ۱۷؍جنوری کو حیدرآباد سے واپسی کا قصد ہے۔[14]

....

۱۱: بنام تمکین کاظمی، ۱۹۲۸/۸/۲۶ء، دوم، ۷۰۴

۱۲: بنام نیرنگ، ۱۹۲۸/۱۲/۵ء، دوم، ۷۰۹-۷۱۰

۱۳: بنام حمید احمد، ۱۹۲۸/۱۲/۲۱ء، دوم، ۷۱۲

۱۴: بنام حمید احمد، ۱۹۲۸/۱۲/۹ء، دوم، ۷۱۰-۷۱۱

میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اِس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کے 'قوم پرستوں' کے رویے سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات مَیں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیاتِ حاضرہ کے تھوڑے سے تجزیے کے بعد۔ ہندوستان کی سیاسیات کی روِش، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، خود مذہبِ اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔[15]

مَیں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہِ عمل قائم کی تھی، وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لیے سعی و کوشش کرنی چاہیے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹکل پروگرام بنانا چاہیے۔ اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیشن پیش ہوا ہے، وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک دلیل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری اُمت کا اجماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا۔[16]

۱۵: بنام نیرنگ، ۱۲/۵/۱۹۲۸ء، دوم، ۷۰۹
۱۶: گفتارِ اقبال، ۷۳

۱۹۲۹ء

[سیٹھ جمال محمد] ایک کروڑ کی سالانہ تجارت کرتا ہے، تہمد کرتا پہنتا ہے اور حقیقت روح و مادّہ جیسے مسائل پر انگریزی اردو میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کو فکر دامن گیر ہے کہ مسلمانوں کی قدیم اور نئی تعلیم کا حقیقی اتصال ہو اور اسلام اپنی اصلی شان میں دنیا پر ظاہر ہو۔ مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ قسم پیدا نہ ہوگی، نصب العین تک رسائی محال ہے۔[1]

....

میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قسم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا، جو اپنی ماں کی تربیت کے اثرات اپنی طبیعت میں نہ پاتا ہو یا بہنوں کی محبت اس کے دل پر اپنا نشان نہ چھوڑتی ہو۔ وہ خوش نصیب شوہر، جن کو نیک بیویاں ملی ہیں، خوب جانتے ہیں کہ عورت کی ذات مرد کی زندگی کے ارتقا میں کس حد تک اس کی ممد و معاون ہے۔ اسلام میں مرد و زن میں قطعی مساوات ہے۔ مَیں نے قرآنِ پاک کی آیت سے یہی سمجھا ہے۔...... وہ حق، جس کا عورت انصاف و عقل کے ساتھ کبھی مطالبہ کر سکتی ہے، وہ قرآنِ پاک نے دے دیا ہے۔ ہاں، مادر پدر آزادی کی شریعت نے کبھی اجازت نہیں دی، نہ کوئی ہوش مند انسان کبھی اس کی خواہش کرے گا۔...... مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کر سکتی ہیں، بشرطیکہ اصلاح کا صحیح اور عقل مندانہ رستہ اختیار کریں اور ترکی یا دیگر یورپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے در پے نہ ہو جائیں۔ یورپ کی آزادی ہم خوب دیکھ چکے ہیں۔ یورپین تہذیب باہر ہی سے

[1]: زندہ رُود، ۴۲۲

دیکھی جارہی ہے۔ کبھی اندر سے دیکھی جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں[۲]

جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں، خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے، جس کو مَیں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نیک فال تصور کرتا ہوں۔ بنگلور کی مسلم لائبریری نے اس احساس کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے اور مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اَور بھی وسیع ہو جائے گا۔[۳]

عالمِ اسلام میں قدامت پسندانہ جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پسند اسلام بغیر جدوجہد کے سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا، اس لیے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہیے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں، بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں، جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہیں۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں، ان کو ملتوی کر دینا چاہیے، کیونکہ ضروری چیزیں فی الحقیقت قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے، کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اُٹھا کر منزلِ ارتقا طے کرتی ہے۔[۴]

....

باوجود مالی مشکلات کے ایران و ترکی کے سفر کی تیاری میں مصروف ہوں۔ خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسا ہے اور مَیں امید رکھتا ہوں کہ اس سفر کے لیے، جو مَیں محض اسلام اور مسلمانوں کی بہتری و بلندی کے لیے اختیار کر رہا ہوں، زادِ راہ میسر آ جائے گا۔[۵]

تاریخِ اسلام میں یہ دَور نہایت نازک ہے۔ اگر مناسب ذرائع اختیار کیے جائیں تو اسلام اقوامِ عالم کو اب بھی مسخر کر سکتا ہے۔ مجھ سے، جو خدمت ممکن ہوئی، بجا لاؤں گا۔[۶]

....

۲: مقالاتِ اقبال، ۳۱۸۔۳۲۷
۳: بحوالہ زندہ رُود، ۴۲۸
۴: گفتارِ اقبال، ۸۶
۵: بنام عبدالجمیل، ۱۹۲۹/۲/۱۸ء، سوم، ۵۳
۶: بنام عبدالجمیل، ۱۹۲۹/۵/۲۱ء، دوم، ۶۳

کتاب پیامِ مشرق آج [۲۴/اپریل کو] ختم ہوگئی ہے، صرف اغلاط درست کرنے باقی ہیں، جو کاتب کر رہا ہے، کل پرسوں تک ختم کر لے گا۔[7] [انگریزی] لیکچروں کا اردو ترجمہ [بھی] ان شاء اللہ کیا جائے گا۔[8]

میرا ارادہ...... [نذیر نیازی] کے مطبع سے کتب انگریزی و اردو و فارسی چھپوانے کا تھا، مگر افسوس ہے مجیب صاحب بیمار ہو گئے۔ کتاب بانگِ درا بھی تقریباً تیار ہے، اس کی چھپوائی کا انتظام تو شاید ابھی نہ ہو سکے۔ اگر...... [نذیر نیازی] نہ چھاپ سکیں تو لاہور ہی میں چھپوائی کا انتظام کیا جائے۔[9]

....

مجھے اس اطلاع سے بے حد مسرت ہوئی کہ جنوبی ہندوستان میں یوم النبیؐ کی تقریب کے لیے ایک ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے لیے رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس ہی ہماری سب سے بڑی اور کارگر قوت ہو سکتی ہے۔[10]

[ٹیپو] سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی، جسے مَیں اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں۔ مَیں نے اس کا ایک حصہ کچھ عرصہ ہوا، مرتب کیا تھا، لیکن پھر ضروری مشاغل کی بِنا پر اس کو نامکمل چھوڑ دینا پڑا۔[11]

....

آج کل [ماہِ اگست میں] عدالتیں تعطیلاتِ گرما کے سلسلے میں بند ہیں اور مَیں اپنے آخری تین خطبات مرتب کر رہا ہوں، جو امید ہے، اواخرِ اکتوبر تک مکمل ہو جائیں گے۔[12]

یہ بات قطعاً غلط ہے کہ مسلمانوں کا ضمیر حبِ وطن کے جذبات سے خالی ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ حبِ وطن کے علاوہ مسلمانوں کے دل میں دینیت و محبت اسلام کا جذبہ بھی برابر موجود رہتا ہے اور یہ وہی جذبہ ہے، جو ملت کے پریشان اور منتشر افراد کو اکٹھا کر دیتا ہے اور

۷: بنام نذیر نیازی، ۱۹۲۹/۴/۲۴ء، سوم، ۵۸

۸: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۲۹/۴/۲۵ء، سوم، ۵۸

۹: بنام نذیر نیازی، ۱۹۲۹/۸/۲ء، سوم، ۷۲-۷۴

۱۰: بنام عبدالجمیل، ۱۹۲۹/۸/۴ء، سوم، ۷۵

۱۱: ایضاً، ۷۴

۱۲: ایضاً

[اکٹھا] کر کے چھوڑے گا اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔[13]

....

اگر دہلی میں طباعت کا انتظام نہ ہو سکے تو پھر مَیں لاہور میں ابھی سے اس کا انتظام کر لوں[14]۔ کاغذ کے لیے آرڈر دے دیا گیا ہے، ٹیٹا گڑھ ملز سے منگوایا جائے گا۔[15]

....

افسوس ہے کہ مَیں مولوی [احمد دین] صاحب مرحوم کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔ مجھے اس سے دو ایک روز پہلے نقرس ہو گیا، جس کی وجہ سے پاؤں میں سخت تکلیف تھی، حرکت سے قاصر رہا۔ دوسرے روز دانت کے درد کا پھر اضافہ ہو گیا۔ بہر حال، مجھے یہ افسوس تازیست رہے گا کہ مرحوم کے لیے آخری دُعا جو کی گئی، مَیں اس میں شریک ہونے سے محروم رہا۔[16]

....

میرے خطبات اب مکمل ہو چکے ہیں اور غالباً اسی ماہ [نومبر میں] علی گڑھ میں ان کے سنانے کے لیے جاؤں گا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے بھی اواخرِ جنوری ۱۹۳۰ء میں اسی سلسلے میں حاضری کی دعوت موصول ہوئی ہے۔ مدراس کی طرف سے بھی دعوت نامہ موصول ہوا ہے، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ حاضر نہ ہو سکوں گا۔[17]

....

مَیں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں؛ مَیں تو مستقبل کا معتقد ہوں، مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ مَیں حال کو سمجھوں، تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں چاہتا ہوں کہ...... [طلبہ علی گڑھ مسلم کالج] ماضی کو سمجھیں۔ چونکہ ہم جدید تہذیب اور شائستگی کے اصولوں سے

۱۳: گفتارِ اقبال، ۹۱-۹۲
۱۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹۲۹/۹/۱۳ء، سوم، ۷۸
۱۵: بنام عبداللہ چغتائی، ۱۹۲۹/۱۰/۲۳ء، سوم، ۸۸
۱۶: بنام بشیر احمد، ۱۹۲۹/۱۰/۱۱ء، سوم، ۸۶-۸۸
۱۷: بنام عبدالجمیل، ۱۹۲۹/۱۱/۴ء، سوم، ۹۲

ناواقف ہیں، اس لیے ہم علومِ جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔[18]

مَیں گذشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں، مگر مَیں ابھی تک یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو مَیں ایک دِن کامل تاریخ اس بات کی قلم بند کروں گا کہ دنیاے جدیدہ اس مطمحِ حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے، جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔[19]

ذاتی طور پر مَیں ڈیماکریسی کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں ہے۔[20]

۱۸: گفتارِ اقبال،۱۰۴
۱۹: ایضاً،۱۰۴-۱۰۵
۲۰: ایضاً،۱۰۴

۱۹۳۰ء

دائرۃ المعارف اسلامیہ کا مقصد ایشیا میں مسلم تہذیب و تمدن کی بازیافت اور تحفظ ہے۔ اس کام کی ابتدا اُس وقت تک ممکن نہیں، جب تک مسلم والیانِ ریاست اور خاص طور پر ان سب کے سرتاج اعلیٰ حضرت نظام کی جانب سے وافر امداد حاصل نہ ہو۔ مَیں ملک کے دیگر مسلم والیانِ ریاست تک بھی رسائی حاصل کر رہا ہوں۔ اگر کم از کم تین ہزار روپیہ سالانہ مستقل آمدنی کا یقین ہو جائے تو اس منصوبے کو فوراً شروع کر سکتے ہیں۔ مجھے بھوپال اور بہاولپور دونوں سے پانچ سو روپیہ سالانہ سے زائد کی توقع نہیں۔ پبلک سے چندہ نہیں کیا جائے گا، بجز معدودے چند ممتاز اصحاب کے، جو منصوبے کے مقصد اور معنویت کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔[1]

....

مَیں ایک ہفتے کے لیے علی گڑھ گیا تھا، وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سید راس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی ہو گی۔ باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے، جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف (اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں، مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام کے لیے تڑپ ہے، لیکن کوئی آدمی ہم میں نہیں، جس کی زندگی قلوب پر مؤثر ہو۔[2]

جنوری کے آخر میں حیدرآباد آنا میرے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ گذشتہ بار تو مَیں یہ سفر اس

۱: بنام امین جنگ، ۲۰/۱/۱۹۳۰ء، سوم، ۹۸-۹۹ ۲: بنام دریابادی، ۵/۱/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۰۰-۱۰۱

لیے کر سکا تھا کہ مَیں نے ایک ماہ کے لیے لاہور چھوڑ دیا تھا۔ اس بار ویسا ہی کرنا ممکن نہیں۔ حیدر آباد کے سفر اور وہاں کے قیام میں دو ہفتے سے زیادہ صَرف ہو جائیں گے؛ اتنے طویل عرصے تک لاہور سے میری غیر حاضری میرے تمام کاموں کو درہم برہم کردے گی۔[۳]

....

بانگِ درا کی تیسری اڈیشن، جس کی تعداد دس ہزار ہوگی، چھپ رہی ہے۔ غالباً دو ماہ تک تیار ہو جائے گی۔[۴] انگریزی لیکچر [بھی] قریباً ۱۵/اپریل تک چھپ کر تیار ہو جائیں گے۔[۵]

کھانسی کی شکایت اب نہیں ہے، طبی معائنہ ہو چکا ہے۔ بجلی، یعنی Ultra violet rays کے ذریعے علاج کل [۵/فروری] سے شروع ہے، چند روز تک معلوم ہوگا کہ کس قدر فائدہ اس سے ہوتا ہے۔[۶] برقی علاج کا سلسلہ ابھی جاری رہے گا اور مجھے دو ماہ کے بعد [مئی میں] پھر بھوپال جانا ہوگا۔[۷]

....

مسٹر جناح نے اپنی قابلیت کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ عام مسلمانوں کی پالیسی کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھائیں گے۔ میری اُن سے مفصل گفتگو ہو چکی ہے اور انتخابِ جداگانہ ومشترکہ پر بھی گفتگو ہو چکی ہے۔[۸]

....

افغانستان میں دوبارہ امن قائم ہوتا جاتا ہے۔ ہندوستان میں معدودے چند افراد کو اُس ملک کے انقلاب کے اسباب سے واقفیت ہے۔ میری رائے میں امیر امان اللہ کی واپسی کے کوئی امکانات نہیں۔ جہاں تک مَیں جانتا ہوں، افغان اُسے نہیں چاہتے۔ اعلیٰ حضرت نادر خاں ملک کو شاہراہِ ترقی پر ڈالنے کی بے حد کوشش فرما رہے ہیں۔ وہ افغانوں

۳: بنام حمید احمد، ۳/۱/۱۹۳۰ء، سوم، ۹۹-۱۰۰
۴: بنام دریابادی، ۵/۱/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۰۱
۵: بنام نذیر نیازی، ۴/۴/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۰۶
۶: بنام راغب احسن، ۶/۲/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۰۲
۷: بنام حسن لطیفی، ؟/۳/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۰۵
۸: بنام راغب احسن، ۱۲/۲/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۰۳

کے محبوب ہیں اور نیم پنجابی بھی۔ ان کی والدہ لاہور میں پیدا ہوئیں اور یہیں پرورش پائی۔[9]

....

ایک صاحب امیر شامی نے، جو غالباً جامعہ ملیہ سے تعلق رکھتے ہیں، گلشن راز جدید کی شرح لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ مَیں نے ان کو اجازت بھی دے دی تھی، اس کے بعد ان کا کوئی خط نہیں آیا۔[10]

کتاب [خطبات] چھپ گئی ہے، اس کی جلد بندی ۶/ [مئی؟] تک ختم ہو جائے گی۔[11]

....

میرا خیال تھا کہ شاید مَیں عرس کے موقع پر [پاکپتن] حاضر نہ ہو سکوں، لیکن مزید غور کرنے پر مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے اس موقع پر جانا چاہیے۔[12]

مجھ کو یہ خیال ہمیشہ تکلیف روحانی دیتا ہے کہ آنے والی مسلمان نسل کے قلوب ان واردات سے یکسر خالی ہیں، جن پر میرے افکار کی اساس ہے۔ ان اشعار کی دِقت زبان کی وجہ سے نہیں، مَیں تو اتنی فارسی ہی نہیں جانتا کہ مشکل زبان لکھ سکوں۔ دِقت جو کچھ بھی ہے، واردات و کیفیات کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ اگر کیفیات کا احساس ہو تو مشکل زبان بھی سہل ہو جاتی ہے۔ جذباتِ انسانی کی تخلیق یا بیداری کے کئی ذرائع ہیں، جن میں سے ایک شعر بھی ہے اور شعر کا تخلیقی یا ایقاظی اثر محض اس کے مطالب و معانی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس میں شعر کی زبان اور زبان کے الفاظ کی صوت اور طرزِ ادا کو بھی بہت بڑا دخل ہے، اس واسطے ترجمے یا تشریح سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، جو مترجم کے زیرِ نظر ہوتا ہے۔[13]

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا وہ رسالہ، جس میں انھوں نے آسمانوں اور سیاروں کی سیر کا ذکر کیا ہے۔ مجھے اس کی مدت سے تلاش ہے، اب تک دستیاب نہیں ہو سکا، آج تک شائع بھی کسی نے نہیں کیا۔[14]

۹: بنام عبدالجمیل، ۱۹۳۰/۳/۴ء، سوم، ۱۰۴

۱۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۰/۴/۴ء، سوم، ۱۰۶-۱۰۹

۱۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۰/۴/۲۷ء، سوم، ۱۱۳

۱۲: بنام ادیب تونسوی، ۱۹۳۰/۵/۱۰ء، سوم، ۱۱۵

۱۳: بنام ادیب تونسوی، ۱۹۳۰/۵/۳۰ء، سوم، ۱۱۸-۱۱۹

۱۴: بنام ادیب تونسوی، ؟/۱۹۳۰/۶ء، سوم، ۱۲۰

[خطبات کے] ترجمے کا خیال بدستور ہے، بلکہ بعض اصحاب کی طرف سے تقاضا ہے کہ جلد کیا جائے۔ مجھے اس پر شبہ ہے کہ عام لوگ اس سے مستفیض ہو سکیں گے۔ ہاں، علما، جنھوں نے فلسفے کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، وہ میرا مقصد سمجھ سکیں گے۔ بہر حال، جب [سید نذیر نیازی] لاہور آئیں تو نمونہ کے طور پر کچھ حصہ اس کا ترجمہ کر لیں، تا کہ معلوم ہو کہ کہاں تک اس کوشش میں کامیابی ہو سکے گی۔[15]

مَیں ۱۵/ جولائی کو بھوپال جانے کا قصد رکھتا ہوں، وہاں بغرضِ علاج ڈیڑھ ماہ قیام رہے گا۔ جاوید کو ساتھ لے جاؤں گا۔[16]

....

حضرت خواجہ [سلیمان تونسوی] صاحب کسی آدمی کو بھیج دیں تو کتاب جلدی مل جائے گی اور مَیں اس سے اپنی کتاب کو ختم کرنے سے پہلے مستفیض ہو سکوں گا۔ میرا مقصود سرّ السما کے مطالعہ سے علمی تحقیقات نہیں ہے، میرا مقصود اس تحقیق سے ہے، جس کی بِنا مکاشفاتِ قلبی پر ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعے سے گوہرِ مقصود ہاتھ آئے گا۔ جہاں تک میرا علم ہے، کسی اسلامی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔ کتاب نظم میں ہے، زبان فارسی ہے، مثنوی مولانا روم کے بحر میں ہے۔[17]

[۲۴/ جولائی کی] رات میرے ہاں بہت سے احباب کا مجمع تھا، مسلمانانِ ہندوستان کی عام روحانیت کا ذکر تھا اور بہت سے احباب مسلمانوں کے موجودہ انحطاط سے متاثر ہو کر ان سے مایوسی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں مَیں نے ریمارک کیا کہ جس قسم سے خواجہ سلیمان تونسوی، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی اور خواجہ فرید چاچڑاں والے اب اس زمانے میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اس کی روحانیت کا خزانہ ابھی ختم نہیں ہوا۔[18]

....

ان [پروفیسر آرنلڈ] کی وفات سے نہ صرف برطانوی دنیائے علم کو، بلکہ دنیائے اسلام

۱۵: بنام نذیر نیازی، ۱/۶/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۲۱
۱۶: بنام راغب احسن، ۶/۷/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۲۹
۱۷: بنام ادیب تونسوی، ۲۵/۷/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۳۶
۱۸: ایضاً

کو بے حد نقصان پہنچا ہے۔ میرے لیے یہ زیاں ایک ذاتی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ انھی کا اثر تھا، جس نے میری روح کی تربیت کی اور اسے جادۂ علم پر گامزن کیا۔[19]

....

پنجاب کے حالات مختلف ہیں اور میری توجہ زیادہ تر اس طرف ہے۔ پنجاب میں اس وقت زیادہ توجہ کے مستحق پولیٹکل امور ہیں اور ایک مدت تک غالباً یہی امور جاذبِ توجہ رہیں گے۔[20]

آج کل ہندوستانیوں کی سب سے بڑی ضرورت ہندو مسلم سمجھوتہ ہے، جو ناممکن ہے اور اس ضمن میں تمام کوشش رائگاں جائے گی اور مجھے یہ کہنے سے بھی عار نہیں کہ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ہمیں برطانیہ کی امداد کی ضرورت ہوگی، بشرطیکہ اس کے اغراض نیک نیتی پر مبنی ہوں۔ آئندہ گول میز کانفرنس میں اگر برطانیہ نے دونوں قوموں کے اختلاف سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو آخر کار یہ بات دونوں ملکوں کے لیے تباہ کن ثابت ہو گی۔ اگر برطانیہ اپنے کسی مادی مفاد کے پیشِ نظر ہندوؤں کو سیاسی اختیارات سونپ دے اور اسے برسرِ اقتدار رکھے تو ہندوستان کے مسلمان اس بات پر مجبور ہوں گے کہ سوراجیہ یا اینگلو سوراجیہ نظامِ حکومت کے خلاف وہی حربہ استعمال کریں، جو گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایشیا کے تمام مسلمان روسی کمیونزم کے آغوش میں چلے جائیں اور اس طرح مشرق میں برطانوی تفوق و اقتدار کو سخت دھکا لگے۔[21]

مجھے کوئی اعتراض نہیں، اگر ہندو ہم پر حکومت کریں، بشرطیکہ ان میں حکومت کرنے کی اہلیت اور شعور ہو، لیکن ہمارے لیے دو آقاؤں کی غلامی ناقابلِ برداشت ہے۔ ہندو اور انگریزوں میں سے صرف ایک ہی کا اقتدار گوارا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندو مسلم سمجھوتے کے متعلق مایوس ہوں۔ مجھے تو امید ہے کہ آئندہ گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم مسئلے کا کوئی نہ کوئی اس قسم کا حل ضرور مل جائے گا، جس سے نہ صرف ہندو اور مسلمان،

۱۹: بنام لیڈی آرنلڈ، ۱۶/۷/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۳۰
۲۰: بنام بیگم نامعلوم، ۱۸/۷/۱۹۳۰ء، ۱۳۳
۲۱: بنام ینگ ہسبنڈ، ۳۰/۷/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۴۱

بلکہ انگریز بھی مطمئن ہوں گے۔ ہمیں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے حالات کا روشن پہلو لینا چاہیے۔[22]

....

قونصل جنرل افغانستان متعینہ ہند (دہلی) نے مجھ سے کہا تھا کہ جشن استقلال کے موقع پر اعلیٰ حضرت آپ کو دعوت دینے کا قصد رکھتے ہیں۔ جشن استقلال وسط اگست میں ہے، لیکن وسط اگست میں مَیں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے لکھنؤ جا رہا ہوں۔ اگر اس موقع پر کابل نہ جا سکا تو کسی اَور موقع پر ان شاء اللہ ضرور جاؤں گا۔[23]

جلسہ مسلم لیگ ملتوی ہو گیا ہے، اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہو گا، غالباً لکھنؤ میں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اَور جگہ ہو۔ لکھنؤ پنجاب والوں کے لیے ذرا دُور ہے۔ بہت سے لوگ جانے کو تیار تھے، مگر اخراجات سے گھبراتے تھے۔[24]

خطبہ صدارت قریباً تیار ہے، ایک ہزار کی تعداد میں چھپے گا۔ اردو ترجمہ کرنا اور اسے رسالے کی صورت میں شائع کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ غالباً مدیرِ انقلاب اپنے اخبار کے لیے ترجمہ کریں گے، جو اخبار ہی میں شائع ہو گا۔[25]

....

ایک دِن والد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ مَیں نے تمھارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت صرف کی ہے، مَیں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ مَیں نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ والد مرحوم نے کہا، 'کسی موقع پر بتاؤں گا'، چنانچہ انھوں نے ایک دفعہ کہا کہ 'بیٹا! میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا'۔ بات ختم ہو گئی، اس کے بعد مَیں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہو کر لاہور کام شروع کر دیا۔ ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا۔ نوجوانوں کے لیے اسلام کا ترانہ بنایا اور دوسری نظمیں لکھیں اور لوگوں نے ان کو ذوق وشوق سے پڑھا اور سنا اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا تو ان ہی

۲۲: بنام ینگ ہسبنڈ، ۱۹۳۰/۷/۳۰ء، سوم، ۱۴۲

۲۳: بنام ادیب تونسوی، ۱۹۳۰/۸/۴ء، سوم، ۱۴۶-۱۴۷

۲۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۰/۸/۱۴ء، سوم، ۱۵۶

۲۵: بنام محمد یعقوب، ؟/۱۹۳۰/۸ء، سوم، ۱۳۸-۱۳۹

دِنوں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ مَیں ان کے دیکھنے کو لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دِن مَیں نے پوچھا کہ 'آپ سے مَیں نے جو اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا، وہ پورا کیا یا نہیں؟' انھوں نے بستر مرگ پر شہادت دی کہ 'تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا'۔[۲۶]

پدر و مرشدِ اقبال ازیں عالم رفت
ما ہمہ راہ رواں ، منزلِ ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخ رحیل
آمد آواز 'اثر رحمت' و 'آغوش لحد'[۲۷] [۱۳۴۹ھ]

....

معلوم ہوا کہ شمس الدین صاحب کا کتب خانہ محفوظ ہے اور ان کے بیٹے ریاست کی ملازمت میں ہیں۔ ممکن ہے، وہ کتاب (سرّ السما) اس کتب خانے میں محفوظ ہو۔ اگر یہ کتاب مل گئی اور میرے مطلب کے موافق ہوئی تو امید ہے، بہت فائدہ ہوگا۔[۲۸]

....

مجھ کو آج بمبئی سے ابراہیم رحمت اللہ صاحب کا خط آیا تھا کہ مسلم ڈیلی گیشن کے ساتھ انگلستان جاؤں۔ مَیں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا ہے۔ من جملہ دیگر وجوہ کے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لیگ کا اجلاس قریب ہے، ان کا ڈیلی گیشن ۴ر اکتوبر کو بمبئی سے روانہ ہوگا۔[۲۹]

مسلمانانِ پنجاب کی رائے عامہ دہلی مسلم کانفرنس کی منظور کردہ قراردادوں پر قائم ہے اور ان میں ردّ و بدل کو ناقابلِ برداشت خیال کرتی ہے۔ اگر کوئی ردّ و بدل کیا گیا تو مسلم مندوبین پر اعتماد نہیں رہے گا۔ اگر ہندو، مسلم مطالبات کو نہیں مانتے تو مسلمان کانفرنس کو چھوڑ کر چلے آئیں۔[۳۰]

پنجاب اور دوسرے حصوں کے مسلمان جداگانہ انتخاب پر مضبوطی کے ساتھ جمے

۲۶: بحوالہ زندہ رُود، ۸۸
۲۷: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ۵۲۲
۲۸: بنام ادیب تونسوی، ؟/۸/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۵۹
۲۹: بنام شمس الحسن، ۸/۹/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۶۴-۱۶۵
۳۰: بنام آغا خاں، ۱۵/۱۱/۱۹۳۰ء (گفتارِ اقبال، ۱۰۹)

ہوئے ہیں۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کے صدر [نواب محمد اسماعیل خاں] نے اس باب میں مسلمانوں کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نیز یہ سمجھتے ہوئے کہ فرقہ وار مسائل کے متعلق بیان کردہ مفاہمت مسلمانانِ ہند کے مفاد کے لیے نقصان رساں ہوگی، ہز ہائینس آغا خاں کو تار دیا کہ مسلمان کسی حالت میں بھی جداگانہ انتخاب ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پنجاب اور دوسرے صوبوں سے بھی اسی مضمون کے برقی پیغامات آغا خان اور دوسرے مندوبین کے نام بھیجے جا چکے ہیں۔ یہ تجویز پیش ہو چکی ہے کہ شمالی و مغربی ہند اور پنجاب کے مسلمان لاہور میں ایک اجلاس منعقد کر کے بیان کردہ مفاہمت کے متعلق اپنی رائے کا پُرزور طریقے پر اظہار کریں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کو باعتبارِ آبادی اکثریت حاصل ہے، ان میں حصولِ اکثریت کے لیے اصرار ضروری ہے۔[۳۱]

حالاتِ حاضرہ کے اعتبار سے شمالی ہند سے مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے، جس میں صوبہ سرحد، بلوچستان، پنجاب و سندھ کے نمائندے شریک ہوں اور ان صوبوں کے مسلمانوں کو اسلامی حقوق کے حصول کے لیے منظم بنانے اور ان میں جوشِ عمل پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔[۳۲]

اس کانفرنس کے طلب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان صوبہ جات کے مسلمانوں کو حالاتِ حاضرہ اور آج کی سیاسی تحریکات سے آگاہ کیا جائے اور ہماری ہمسایہ اقوام اور ہندوستان کی حاکم قوم کی حکمتِ عملی سے واقف کر کے اُن خطرات سے آگاہ کیا جائے، جن سے ملتِ مرحومہ دوچار ہے اور اس کے بعد مسلمانانِ ہند کی اس اکثریت کو، جو اِن صوبہ جات میں ہے، جن کو خدائے حکیم و علیم و خبیر نے یقیناً بلا مصلحت نہیں، بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لیے، جو اربابِ دانش و بینش پر روز بروز عیاں ہوتی چلی جا رہی ہے، یکجا رکھا ہے، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سرگرم ہونے کا پیغام دیا جائے۔[۳۳]

....

۳۱: گفتارِ اقبال، ۱۱۰-۱۱۱ ۳۲: ایضاً، ۱۱۲

۳۳: ایضاً، ۲۱۴

ایک اعتبار سے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ تمام حوادث پہلے سے متعین ہیں۔میرے لیکچروں کا مشکل ترین حصہ غالباً یہی بحث ہے۔مَیں نے اس حصے میں eternity اور time کے تناقض کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ time کے اعتبار سے حوادث متعین نہیں، eternity کے اعتبار سے ان کو متعین تصور کرنا بالکل بجا اور درست ہے۔اس مسئلے پر غالباً جدید سائنس مزید روشنی ڈال سکے گا۔ Einstein سے اس بحث کا آغاز سمجھنا چاہیے۔علما کے اعتراضات واستفسارات سے زیادہ سروکار نہ رکھنا چاہیے۔آخر یہ مباحث فلسفیانہ ہیں اور فلسفہ ایک متحرک شے ہے۔اس کی کوئی دلیل قطعی اور آخری قرار نہیں دی جا سکتی۔ علمِ انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی تصورات بھی improve ہوتے جاتے ہیں۔ فلسفہ محض حقائق کو تصور کرنے کی کوشش کا نام ہے۔[۳۴]

۳۴: بنام نذیر نیازی، ۱۱/۱۲/۱۹۳۰ء، سوم، ۱۸۳۔۱۸۴

۱۹۳۱ء

مجوزہ اسلامی ریاست ایک نصب العین ہے۔ اس میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال (آبادیوں کے تبادلے)، مدت ہوئی، لالہ لاجپت رائے نے ظاہر کیا تھا۔ اس ایک ریاست یا متعدد اسلامی ریاستوں میں، جو شمال مغربی ہند میں اس اسکیم کے مطابق پیدا ہوں گی، ہندو اقلیت کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔[1]

....

میرے زیرِ نظر حقائق اخلاقی وملّی ہیں، زبان میرے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی میں بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔ اگر ان خیالات کو کوئی شخص ان [ایرانیوں] کی مروّجہ زبان میں لکھ دے تو شاید اُن لوگوں کے لیے مفید ہو۔[2]

نظم جاوید نامہ، جس کے دو ہزار شعر ہوں گے، ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ممکن ہے، مارچ تک ختم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی ڈِوائن کامیڈی ہے اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ بہت دلچسپ ہوگا اور اس میں غالباً ہند و ایران، بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لیے نئی باتیں ہوں گی۔ ایرانیوں میں حسین ابنِ منصور حلاج، قرۃ العین، ناصر خسرو علوی وغیرہ کا نظم میں ذکر آئے گا۔ جمال الدین افغانی کا پیغام مملکت روس کے نام ہوگا۔[3]

....

میں اِن شاء اللہ ۲/اپریل کی شام بمبئی میل میں یہاں [لاہور] سے چلوں گا، ۳/[اپریل] کی صبح کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔[4]

۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۱/۱/۱۱ء، سوم، ۱۸۸

۲: بنام ناموس منشی، ۱۹۳۱/۱/۲۰ء، سوم، ۱۸۹

۳: ایضاً

۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۱/۳/۳۱ء، سوم، ۱۹۴

اسلام پر ایک بہت بڑا نازک وقت ہندوستان میں آرہا ہے۔ سیاسی حقوق وملی تمدن کا تحفظ تو ایک طرف، خود اسلام کی ہستی معرضِ خطر میں ہے۔ مَیں ایک مدت سے اس مسئلے پر غور کررہا تھا، آخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے مقدم ہے کہ ایک بہت بڑا نیشنل فنڈ قائم کریں، جو ایک ٹرسٹ کی صورت میں ہو اور اس کا روپیہ مسلمانوں کے تمدن اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت اور ان کی دینی اشاعت وغیرہ پر خرچ کیا جائے۔ فی الحال قدیم سجادوں کے نوجوان ایک جا جمع ہو کر مشورہ کریں کہ کس طرح اس درخت کی حفاظت کی جا سکتی ہے، جو ان کے بزرگوں کی کوششوں سے پھلا پھولا تھا۔ اب جو کچھ ہوگا، نوجوان علما و نوجوان صوفیہ سے ہی ہوگا، جن کے دلوں میں خدا نے احساس حفاظت مِلّی کا پیدا کر دیا ہے۔ خواجہ [سلیمان تونسوی] صاحب ایسے نوجوان سجادہ نشینوں کو ایک جگہ جمع کر لیں، مَیں بھی وہاں حاضر ہو کر ان کی مشورت میں مدد دوں گا۔[5]

اس گروہ کے جمود کا مجھے بھی احساس ہے اور یہی وجہ ہے کہ مَیں نے اس گروہ میں سے ایسے نوجوانوں کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر ان کو کسی مرکزی مقام پر جمع کیا جائے تو مَیں شاید ان کو یقین دلا سکوں کہ نظر بہ حالات آئندہ اُن کے خانوادوں کا احترام و اقتدار بھی اس پر موقوف ہے کہ وہ اس نازک زمانے میں اسلام کی حفاظت کریں۔ فی الحال تجویز یہ ہے کہ ایک قومی فنڈ قائم کیا جائے کہ بغیر اس کے اسلام کے سیاسی و دینی مقاصد کی تکمیل و اشاعت ناممکن ہے۔ مسلمان اخباروں کو قوی کیا جائے، نئے اخبار اور نیوز ایجنسیاں قائم کی جائیں۔ مسلمانوں کو مختلف مقامات میں دینی اور سیاسی اعتبار سے منظم کیا جائے۔ قومی عساکر بنائے جائیں اور تمام وسائل سے اسلام کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے اس کے مستقبل کو محفوظ کیا جائے۔ ہم تو اپنا زمانہ حقیقت میں ختم کر چکے، آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک سے فنا ہو جائے۔ اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے مجھے اپنے کام چھوڑنے

۵: بنام ادیب تونسوی، ۱۸/۴/۱۹۳۱ء، سوم، ۱۹۴-۱۹۵

پڑیں تو اِن شاء اللہ چھوڑ دوں گا اور اپنی زندگی کے باقی ایام اسی ایک مقصد جلیل کے لیے وقف کر دوں گا۔ خواجہ [سلیمان تونسوی] صاحب اپنے دیگر احباب میں بھی یہی تحریک کریں، ورنہ ہم لوگ قیامت کے روز خدا اور رسولؐ کے سامنے جوابدہ ہوں گے[6]۔ اگر قومی سرمایہ مسلمان جمع کر سکیں تو میرا یہ اندازہ ہے کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کی نسبت زیادہ مادۂ قربانی اور اپنے حقوق کے لیے ایجی ٹیشن کرنے کی جرأت وہمت موجود ہے۔[7]

....

بہت بہتر ہے، اگر جامعہ [ملیہ] خطبات کا ترجمہ خریدنا چاہتی ہے۔ میرے خیال میں کتاب عمدہ کاغذ پر چھپنی چاہیے اور کتابت بھی عمدہ ہونا چاہیے۔ اب تک میرا دستور یہ رہا ہے کہ کتاب کمیشن پر فروخت کر دی جاتی ہے، بشرطیکہ کُل کتاب خریدی جائے اور قیمت یک مشت بوقتِ خریداری ادا کی جائے۔[8]

کتاب جاوید نامہ ختم ہوگئی ہے، آج کل کاتب کے حوالے کر دی جائے گی۔[9]

[لگتا ہے] جاوید نامہ میں بہت سی باتوں کا ذکر رہ گیا۔ میرا تو جی چاہتا تھا، سید احمد بریلوی اور سید احمد دہلوی کی روحوں کو بھی اس میں جمع کر دوں، لیکن خیال نہ رہا۔ علاوہ اس کے، اَور بھی کئی باتیں میرے ذہن میں ہیں، بلکہ مَیں نے بطور یادداشت کہیں لکھ بھی رکھا ہے۔ موقعہ ملا تو ان کا ذکر بھی کر دیا جائے گا۔[10]

تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، جو مَیں نے انگریزی زبان میں لکھی تھی، اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے، عنقریب شائع ہو جائے گا۔[11]

....

[آفتاب سے متعلق] یہ قصہ طولانی اور اس کا بیان اذیت ناک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر...... [اکبر حیدری] کو تمام حقائق کا علم ہوتا تو اس کی جانب سے مجھے لکھنا دشوار معلوم

۶: بنام ادیب تونسوی، ۲۲/۴/۱۹۳۱ء، سوم، ۱۹۷-۱۹۸
۷: بنام نذیر نیازی، ؟/۵/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۰۲
۸: بنام نذیر نیازی، ۱۹/۴/۱۹۳۱ء، سوم، ۱۹۵-۱۹۷
۹: بنام ادیب تونسوی، ۲۲/۴/۱۹۳۱ء، سوم، ۱۹۸
۱۰: اقبال کے حضور، ۶۴
۱۱: بنام ادیب تونسوی، ۲۲/۴/۱۹۳۱ء، سوم، ۱۹۸

ہوتا۔ دراصل مَیں دہلی میں ...... [اکبر حیدری] سے ملاقات کرنے سے بھی اس لیے کترایا کہ مَیں نے سوچا، وہ ہماری گفتگو میں موضوع بن سکتا ہے اور اس سے کچھ دیر کے لیے میرا ذہنی سکون برباد ہوگا۔ مَیں پہلے ہی اپنی بساط سے زیادہ اس کی مدد کر چکا ہوں، اس طرزِ عمل کے باوجود، جو وہ میرے ساتھ اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ کرتا رہا ہے۔ کوئی باپ تحمل کے ساتھ وہ شرارت آمیز خطوط نہیں پڑھ سکتا، جو اس نے مجھے لکھے ہیں۔ اب جو کچھ وہ کر رہا ہے، وہ صرف بلیک میلنگ کے منصوبے کا ایک حصہ ہے، جو وہ کچھ عرصے سے کرتا آ رہا ہے۔ بہر حال، یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ اس کی مدد کرسکوں۔ مَیں ایک بوڑھا آدمی ہوں، جس کی صحت بھی ڈانواڈول رہتی ہے، کسی طرف سے کوئی امید نہیں۔ دو چھوٹے بچے ہیں، جن کی پرورش کرنا ہے۔ اگر مَیں کوئی مال دار آدمی ہوتا تو شاید اس کی کچھ اَور مدد کر دیتا، اگرچہ وہ اس کا مستحق نہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ میرے حالات کے بارے میں ...... [اکبر حیدری] کو کچھ علم نہیں۔ فطرت نے مجھے کچھ چیزیں دی ہیں اور کچھ نہیں دیں۔ مَیں پوری طرح قانع ہوں اور میرے لبوں پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آیا۔ شاید ...... [اکبر حیدری] پہلے آدمی ہیں، جسے مَیں نے یہ باتیں لکھی ہیں، جو اس سے قبل کسی کو نہیں لکھیں۔ مَیں اپنے زخموں کی نمائش ناپسند کرتا ہوں، کیونکہ عموماً یہ دنیا بے درد ہے اور ہر کسی شخص کو سر اکبر کی سی فطرت نہیں ملی، جس کی ہمدردی کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ [اکبر حیدری] نے اس کی مدد کی ہے، کچھ اس لیے کہ اس نے خوب متاثر کیا ہے اور کچھ میرے تعلق کی وجہ سے۔ ...... [اکبر حیدری] کی فیاض فطرت اس کے سوا اَور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی، مگر مجھے یقین ہے کہ ...... [اکبر حیدری] کا اس پر اور مجھ پر بہت بڑا اکرم ہوتا، اگر اس کو کوئی موزوں ملازمت جامعہ عثمانیہ میں دلا سکتے[12]

یہ نوجوان [آفتاب] اب تک ستر ہزار روپے اپنے اوپر خرچ کر چکا ہے۔ اس میں سے، خود اپنے بقول، اس نے پچاس ہزار روپے انگلستان میں قرض لیے تھے۔ مَیں نے اس

12: بنام اکبر حیدری، ۲/۵/۱۹۳۱ء، ۱۹۹۔۲۰۰

کی ماں کو دس ہزار روپے دیے تھے، جو اس نے سب کے سب اس پر خرچ کر دیے اور یہ رقم بھی اس کے علاوہ ہے، جو اس [کریم بی بی] نے اور اس کے باپ [حافظ عطا محمد] نے اس لڑکے کو دیے۔ اس کی انگلستان سے واپسی کے صرف ایک یا دو ماہ قبل ہی مجھے ایک ہزار روپے دینے پر مجبور کیا گیا اور اس کی ہندوستان آمد کے چند روز بعد ہی مجھے اس کے انگلستانی قرض خواہوں میں سے ایک کا پہلا خط ملا۔ اس کے باوجود وہ اکثر و بیشتر بلیک میلنگ پر مبنی خطوط بھیجتا رہتا ہے۔[13]

....

گاندھی جی نے مسلم کانفرنس دہلی کے متعلق کہا تھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ متحدہ نہیں۔ لیکن وہ حق بجانب نہ تھے، [کیونکہ خود] ہندوؤں کا ایک طبقہ جداگانہ انتخاب مانگتا ہے، دوسرا مخلوط انتخاب کا حامی ہے اور تیسرا سوشل ڈیموکریسی چاہتا ہے۔ جب ہندوؤں میں اس قدر اختلاف ہے تو مسلمانوں کے معمولی اختلاف پر ایک بہانہ بنا لینا منافقت نہیں تو کیا ہے۔ ...... ہندوستان میں جس قدر اقوام ہیں، سب چاہتی ہیں کہ ان کی خصوصیات باقی رہیں، اس لیے مسلمان بھی یہی چاہتے ہیں۔ مسلمان دوسروں پر حکومت نہیں چاہتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان پر حکمران ہوں اور وہ ان کے غلام بنے رہیں۔ ...... اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یا انگریز اس کی دست گیری کرے گا، تو وہ بد بخت ہے۔[14]

ریاست بھوپال میں بھی نواب صاحب کی دعوت پر مَیں اسی مطلب کے واسطے گیا تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اختلاف رفع کرنے کی کوشش کر کے ان کو ایک مرکز پر متحد کیا جائے۔ معاملہ امید افزا ہے؛ مگر چونکہ ہر روز قریباً دو بجے رات تک کام کرنا اور جاگنا پڑا، مَیں وہیں بیمار ہو گیا۔ آج صبح واپس آیا ہوں، کسی قدر افاقہ ہے۔[15]

....

مَیں یقیناً نہیں کہہ سکتا کہ پاکپتن شریف حاضر ہو سکوں گا، مگر چونکہ حضرت خواجہ

۱۳: بنام اکبر حیدری، ۱۹۳۱/۵/۱۴ء، سوم، ۲۰۴-۲۰۵ ۱۴: گفتارِ اقبال، ۱۱۶-۱۱۸

۱۵: بنام ادیب تونسوی، ۱۹۳۱/۵/۱۴ء، سوم، ۲۰۲

صاحب نے امید دلائی ہے، اس واسطے میں پوری کوشش کروں گا کہ حاضر ہوں۔ اگر مَیں پاکپتن حاضر نہ ہو سکا تو کوئی اَور ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ مَیں ان سب سے ایک مقام پر مل سکوں اور اپنے معروضات ان کی خدمت میں پیش کر سکوں۔[١٦]

....

چونکہ کتاب [خطبات] کے متعلق بہت لوگ استفسار کر رہے ہیں، اس واسطے ضروری ہے کہ اس کی اشاعت میں جلدی کی جائے۔[١٧] کتاب پر نظرِ ثانی ...... [نیازی] کی موجودگی میں ہو تو بہتر ہوگا۔ مَیں دو اقساط میں روپیہ لے لوں گا، بشرطیکہ دو اقساط کی درمیانی مدت تین ماہ سے زائد نہ ہو۔ کمیشن بیس فی صدی ادا کر دی جائے گی۔[١٨]

....

کل میٹنگ کا اجلاس تمام دِن رہا اور شام کو مَیں دردِ دنداں میں مبتلا ہو گیا، اس واسطے مجبوراً آج پاکپتن کا سفر کرنے سے قاصر ہوں کہ دانت کو نکلوا دینے کا ارادہ ہے۔ اِن شاء اللہ پھر کسی موقع پر خواجہ [سلیمان تونسوی] صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام معروضات پیش کروں گا۔[١٩]

مدت ہوئی، مَیں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک سیاہ پوش فوج عربی گھوڑوں پر سوار ہے۔ مجھے تفہیم ہوئی کہ یہ ملائکہ ہیں۔ میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ ہے کہ ممالکِ اسلامیہ میں کوئی جدید تحریک پیدا ہونے والی ہے۔ عربی گھوڑوں سے مراد روحِ اسلاف ہے۔[٢٠]

اس [تحریک] کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اسلام بحیثیت مذہب کے دین و سیاست کا جامع ہے، یہاں تک کہ ایک پہلو کو دوسرے پہلو سے جدا کرنا حقائقِ اسلامیہ کا خون کرنا ہے۔ مَیں نے جو حضراتِ مشائخ کو اس طرح متوجہ کرنے کا قصد کیا تھا، وہ محض اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر تھا، نہ [کہ] اپنے نام و نمود کی خاطر۔ خیال یہ تھا کہ شاید اسی

١٦: بنام ادیب تونسوی، ١٩٣١/٥/١٤ء، سوم، ٢٠٣
١٧: بنام نذیر نیازی، ١٩٣١/٥/٢٠ء، سوم، ٢٠٦
١٨: بنام نذیر نیازی، ١٩٣١/٥/٢٠ء، ٢٠٨
١٩: بنام ادیب تونسوی، ١٩٣١/٥/٢٥ء، سوم، ٢١١
٢٠: بنام راغب احسن، ١٩٣١/٥/٢٨ء، سوم، ٢١٢

طریق سے نوجوان صوفیہ میں کہ اُن کے اقتدار کا دارومدار بھی اسلام کی زندگی پر ہے، کچھ حرات پیدا ہو جائے اور وہ کلاً یا جزاً اس کام میں شریک ہو جائیں۔ خواجہ صاحب اگر اس تحریک میں شریک ہوں تو میرے عقیدے کی رُو سے اُن کی سعادت ہے، بلکہ مَیں تو چاہتا ہوں کہ اس ساری تحریک کا سہرا اُن ہی کے سر رہے۔[21]

مسلمانوں کا اتحاد حضورؐ کے مطابق برہانِ قاطع ہے۔ اس امر میں خلوص سے عمل کیا اور [کامیابی کی صورت میں] اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ مسلمانوں کے سامنے عنقریب بہت بڑے امور پیش ہونے والے ہیں، جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ اسی طرح سے ثابت قدم رہیں۔[22]

بنارس، آگرہ اور مرزا پور کے بعد کانپور میں مسلمانوں کا قتل عام ہندوستان کے مسلمانوں کو چیلنج تھا کہ وہ ایک ایک کر کے اس ملک سے نابود کر دیے جائیں گے اور کوئی ان کی امداد کرنے والا نہ ہوگا۔...... پوربیوں نے انگریزوں سے غدر میں وہ کچھ نہ کیا تھا، جو اس شہر میں دوسرے ہندوؤں نے مسلمانوں سے کیا ہے۔ جس طرح جنگلی جانوروں کے ایک گلے میں گھس کر شکاریوں کا گروہ بے تحاشا بندوقیں چلانا شروع کرتا ہے، اسی طرح کانپور میں ہوا۔ مسلمانوں کے ہزارہا مکانات جلا دیے گئے۔ پیشہ وروں کے آلات بڑے بڑے ہتھوڑوں سے کوٹ کوٹ کر بیکار کر دیے گئے۔ بے کس مسلمانوں کو مارا ہی نہیں گیا، بلکہ ان پر تیل ڈال کر ان کو جلایا بھی گیا اور بعض جگہ تو سسکتے ہوئے زندہ آدمی جلا دیے گئے۔ کئی گھروں اور مساجد میں اب تک خون کے چھینٹے ان دردناک حوادث کی یاد دِلا رہے ہیں، جن میں غریب مسلمانوں کو مار مار کر ان کے سر پھوڑ دیے گئے۔...... تیس مسجدیں کلی طور پر یا جزوی طور پر توڑ دی گئیں،...... کئی جگہ قرآنِ مجید کی بھی بے حرمتی کی گئی۔[23]

....

۲۱: بنام ادیب تونسوی، ۷/۶/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۱۵ ۲۲: گفتارِ اقبال، ۱۴۴

۲۳: ایضاً، ۱۲۶-۱۲۷

میں غالباً یکم ستمبر کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور ۵ ستمبر کو بمبئی۔ ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کی بڑی آرزو ہے، مگر یہ سب کچھ روپیہ پر منحصر ہے۔ خطبات کے ترجمے کی اشاعت کا التوا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امید ہے، دسمبر کے آخر تک واپس آ جاؤں گا۔ جاوید نامہ ابھی تک شائع نہیں ہوا، کل اس کی کتابت ختم ہوگی، غالباً اکتوبر کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔[۲۴]

....

عرصہ دو تین سال کا ہوا، جب میں دردِ گردہ کی وجہ سے بیمار ہو گیا تھا اور زندگی کی امید منقطع ہو گئی تھی، لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے صحت عطا کی۔ اس بیماری کے بعد میرے خیالات میں بڑا تغیر ہوا اور چند روزہ زندگی کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔ صحت یابی کے بعد میں نے مبلغ دس ہزار روپیہ جاوید کے نام ہبہ کر کے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں اس کے نام جمع کرا دیا اور چند ماہ ہوئے، اس میں ہبہ پانچ ہزار کا اضافہ کر دیا، یعنی پانچ ہزار مزید ہبہ کر کے اس کے نام اسی بنک میں جمع کرا دیا۔ اس رقم کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ میں نے منیرا بیگم کے نام ہبہ کر کے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع کرا دیا۔ کُل پندرہ ہزار روپیہ جاوید کے نام اور پانچ ہزار منیرا بیگم کے نام بنک مذکور میں جمع ہے۔ مندرجہ بالا رقوم کے علاوہ میں نے دس ہزار روپیہ [سردار بیگم کے] نام ہبہ کر دیا تھا۔ یہ روپیہ سنٹرل کوآپریٹو بنک لاہور میں میرے اور [سردار بیگم کے] نام سے جمع ہے، لیکن میرا نام محض اس لیے درج کیا گیا تھا کہ اگر [سردار بیگم کے] لیے کوئی جائداد خریدنے کی ضرورت پڑے تو بنک سے اس کے نکالنے میں آسانی ہو۔ حقیقت میں یہ روپیہ [سردار بیگم کا] ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس دس ہزار کی رقم کے علاوہ مبلغ پندرہ سو روپیہ بھی اسی بنک میں میرے اور [سردار بیگم کے] نام سے جمع ہے۔ یہ روپیہ [سردار بیگم کے] بعض زیورات کی فروخت سے حاصل ہوا تھا، یہ بھی [سردار بیگم کی] ملکیت ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹/۸/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۲۹

میرا نام اس رقم کے سلسلے میں محض مذکورہ بالا سہولت کی غرض سے درج کیا گیا ہے۔ مبلغ آٹھ ہزار روپیہ خالصتاً میرے نام سنٹرل کوآپریٹو بنک لاہور میں جمع ہے، اس روپیہ میں سے کچھ روپیہ مَیں اپنے ساتھ [لندن] لے جاؤں گا۔ مبلغ دو ہزار روپیہ کے قریب منشی طاہر الدین کے پاس ہے۔ کچھ اور روپیہ آنے والا ہے، جس کو وہی وصول کریں گے۔ اس روپیہ سے انکم ٹیکس ادا کرنا ہے اور بعض اور اخراجات، جو میری عدم موجودگی میں لاحق ہوں، مثلاً کرایہ کوٹھی اور ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ۔ اس کے علاوہ گھر کے اخراجات کے لیے کچھ روپیہ [سردار بیگم کے] پاس بھی موجود ہے۔ جاوید نامہ مَیں نے چھپنے کے لیے دے دیا ہے اور اس کے متعلق ضروری ہدایات منشی طاہر الدین اور چودھری محمد حسین صاحب کو دے دی ہیں۔ چونکہ یہ کتاب جاوید کے نام پر لکھی گئی ہے، اس واسطے وہی اس کا مالک ہے۔ اس کی تمام آمدنی، اخراجات، اشاعت وطباعت نکال کر اسی کی ملکیت ہے۔ مَیں نے زبانی کہا تھا کہ [سردار بیگم کا] حق مہر مَیں نے پندرہ ہزار روپیہ باندھ دیا ہے۔ وقتِ نکاح کوئی رقم مقرر نہ کی گئی تھی، لیکن اب مَیں اپنی مرضی سے [سردار بیگم کا] حق مہر پندرہ ہزار روپیہ مقرر کرتا ہوں۔ شرعاً یہ روپیہ مجھ پر قرض ہے اور [سردار بیگم] اس رقم کو میری ہر قسم کی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ سے وصول کر سکتی [ہے]۔ شرعِ شریف کی رُو سے [سردار بیگم کو] میری ہر قسم کی جائداد پر قابض و متصرف رہنے کا حق ہے، جب تک مذکورہ بالا رقم [سردار بیگم کو] وصول نہ ہو جائے۔[25]

....

یکم [ستمبر] کو لاہور سے چلنے والا تھا، مگر روانگی سے دو گھنٹے قبل بخار ہو گیا۔ اب ۸/ستمبر کی شام کو فرنٹیر میل سے اِن شاء اللہ [بمبئی براستہ دہلی] لاہور سے روانگی ہے۔[26]

کوئی ایسا دستور اساسی، جو مسلمانوں کے لیے اجتماعی حیثیت سے موت کا پیغام ہو، ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی آزادی ہندوستان کی قوموں کے ہاتھ میں ہے اگرچہ ہندوستان کی آب و ہوا میں کوئی سمجھوتہ ہندی اقوام کے درمیان نہیں ہو سکا، حالانکہ کم

۲۵: بنام سردار بیگم، ۱۹۳۱/۸/۲۶ء، سوم، ۲۳۲-۲۳۴ ۲۶: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۱/۹/۴ء، سوم، ۲۳۵

ازکم مسلمانوں نے اپنے بعض ضروری اقتصادی اور اجتماعی مقاصد کو نظر انداز کر کے گذشتہ دس سال میں اس کے لیے کوشش بھی کی ہے، تاہم میرا خیال ہے کہ انگلستان کی فضا اور برطانوی مدبرین کا 'جینیس' شاید اس گتھی کو سلجھا سکے، جس کو ہندوستانی مدبرین نہیں سلجھا سکے۔[27]

نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے، جو میرے لیے ضروری مواد فراہم کرے؛ نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے، جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں؛ بلکہ میرے پاس حق وصداقت کی ایک جامع کتاب (قرآنِ مجید) ہے، جس کی روشنی میں مَیں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔ گذشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی و سیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگریس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس میں ہم کو برابر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لہٰذا اب اگر لندن میں بھی فرقہ وار اتحاد کی کوئی قابلِ اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل پراونشل اٹانومی نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ رکھا گیا تو مسلمانانِ ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی قربان کرنا پڑے گی اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستور اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا، مسلمانانِ ہند اس کے پرخچے اڑا دیں گے۔[28]

بمبئ پہنچتے ہی سردار صلاح الدین سلجوقی قونصل افغانستان مقیم بمبئ نے دعوت دی۔ ان کے ہاں پُرلطف صحبت رہی۔ سردار موصوف فارسی اور عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ عربی کی جدید شاعری سے بھی باخبر ہیں۔ فارسی میں خاقانی کے بڑے معترف ہیں۔ علومِ دینی میں بھی کافی دسترس رکھتے ہیں۔ ہرات کے قاضی رہ چکے ہیں۔ ان کے دولت کدے پر مرزا طلعت یزدی نے، جو بمبئ میں دس سال سے مقیم ہیں، ایرانی لہجے میں اپنے اشعار سنائے۔ اسی شام عطیہ کے ہاں سماع کی صحبت رہی، جہاں اہلِ ہوس بار نہیں پا سکتے۔[29]

۲۷: سفر نامۂ اقبال، ۲۰   ۲۸: ایضاً، ۲۲

۲۹: بنام طاہر الدین، ۲۱/۹/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۳۹-۲۴۱

بہ طوافِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم نہ دادند
کہ بروںِ درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

برائے جریدہ

ترسم کہ تو می رانی زورق بسراب اندر
زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر
بر کشت و خیاباں پیچ، بر کوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد، میرد بہ سحاب اندر
ایں صوتِ دل آویزے، از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جناں حورے نالد برباب اندر

پرائیویٹ

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے رَوا کیا کیا کچھ
کہیے، کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں[30]

۱۲ر ستمبر کو ایک بجے کے قریب بمبئی سے روانہ ہوئے۔[31]

....

عدن، یہ اسی سرزمین کا ٹکڑا ہے، جس کی نسبت حالی مرحوم فرما گئے ہیں..... 'عرب کچھ نہ تھا، اِک جزیرہ نما تھا'..... میرا مقصد ساحل پر جانے کا تھا، مگر ہمارے شہر کے ایک نوجوان شیخ عبداللہ نام یہاں وکالت کرتے ہیں۔ وہ جہاز پر آئے اور باصرار اپنے ساتھ لے گئے۔ کشتی پر سوار ہو کر ساحل پر اُترے اور وہاں سے موٹر پر سوار ہو کر شیخ صاحب موصوف کے مکان پر پہنچے۔ کباب، قورمہ سب کچھ حاضر تھا۔ کھانے کے بعد یمن کی سیاہ و تلخ و خوش گوار کافی کا دَور چلا۔ آغا فکری ایرانی اور ایک اَور ایرانی سوداگر سے ملاقات ہوئی۔ آغا فکری نہایت ہوشیار اور مستعد نوجوان ہیں۔ یمنی کافی کی تجارت کرتے ہیں، بے انتہا لسان ہیں۔

۳۰: سفرنامۂ اقبال، ۲۴

۳۱: بنام طاہر الدین، ۲۱/۹/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۴۱

رخصت کے وقت انھوں نے مجھے ایک دانہ عقیق یمنی کا بطور یادگار کے عنایت فرمایا۔ بائیس سال ہوئے، جب مَیں نے عدن دیکھا تھا۔ اُس وقت کچھ نہ تھا، اب ایک بارونق شہر ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ حضر موت کے عرب یہاں ساہوکار ہیں۔ پنجابی بھی بہت سے ہیں، خاص کر سندھ کے دُکاندار۔ مسلمانوں میں سمالی [صومالی؟] قوم نہایت ہوشیار اور محنتی ہے۔ شیخ عبداللہ سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض آٹھ آٹھ دس دس زبانیں بلا تکلف بولتے ہیں۔ عدن میں عرب نوجوانوں کا ایک لٹریری کلب بھی ہے، مگر چونکہ رات کا وقت تھا، کلب مذکور کے ممبروں سے ملاقات نہ ہوسکی۔ غرضیکہ رات کے ساڑھے دس بجے شیخ عبداللہ کے مکان سے رخصت ہو کر تقریباً گیارہ بجے اپنے جہاز پر پہنچے۔ جہاز ساڑھے گیارہ بجے رات روانہ ہوا۔[۳۲]

۲۰ ستمبر کو تقریباً تین بجے شب پورٹ سعید مقام ہوا۔ یہ جگہ بھی بے انتہا ترقی کر گئی ہے۔ مَیں تو سو چکا تھا، مگر ایک مصری ڈاکٹر سلیمان نے آ جگایا۔ مَیں اُٹھا اور اُن سے ملاقات کی۔ اتنے میں اَور مصری نوجوان، جو وہاں کے 'شبان المسلمین' کے ممبر ہیں، ملاقات کو آئے۔ ان نوجوانوں سے مل کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ ایک مصری کرنل کی لڑکی بھی ملنے کے لیے آئی۔ یہ ہمارے جہاز میں انگلستان جا رہی ہے، تاکہ علمِ نباتات کے مطالعے کی تکمیل کرے۔ پہلے، چار برس وہاں رہ آئی ہے، انگریزی خوب بولتی ہے۔ عام طور پر اہلِ مصر فرانسیسی لہجے میں انگریزی بولتے ہیں، اس لڑکی کا لہجہ بالکل انگریزی تھا۔ لطفی بے نے، جو قاہرہ کے نہایت مشہور بیرسٹر ہیں، ڈاکٹر سلیمان کی زبانی سلام بھیجا اور واپسی پر قاہرہ آنے کی دعوت دی۔ 'رنپورہ' جہاز پر، جس میں میرا سفر پہلے قرار پایا تھا، لطفی بے تشریف لائے تھے، مگر افسوس کہ مَیں حالات کی وجہ سے سفر نہ کر سکا۔ مصر کے مسلمان عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند ہندوستان کی آزادی کی راہ میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ یہ پراپیگنڈا دیگر ممالک میں بھی کیا گیا ہے۔ پورٹ سعید پر قریباً ہر مسلمان نوجوان نے مجھ سے یہ سوال کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کی آنکھوں سے رفتہ رفتہ حجاب اُٹھ رہا ہے۔ مَیں نے ان کو ایک طویل لیکچر دیا اور بتایا

۳۲: بنام طاہر الدین، ۲۱/۹/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۴۱-۲۴۲

کہ ہندوستان کا پولیٹکل پرابلم، کس طرح مسلمانانِ ہند پر مؤثر ہوتا ہے۔ میری گفتگو سننے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔[۳۳]

جالندھر کے ایک جوان (حکیم صدیق محمد) نے بحیثیت نمائندہ 'رائٹر' ملاقات کی۔ یہ یہاں کی 'رادل سوسائٹی' کے سیکرٹری ہیں۔ شادی بھی مصر ہی میں کر لی ہے، عربی خوب بولتے ہیں اور مصری بہت ہوشیار اور مستعد معلوم ہوتے ہیں۔ جہاز تقریباً ساڑھے چھ بجے صبح روانہ ہوا اور مصری جوان صبح تک میرے کیبن میں بیٹھے رہے۔ واپسی پر انھوں نے ساحل سے مصری سگرٹوں کے دو ڈبے ہدیۃً ارسال کیے۔[۳۴]

بمبئی سے لے کر اِس وقت تک جہاز 'ملوجا' بحیرۂ روم کی موجوں کو چیرتا ہوا چل رہا ہے۔ سمندر بالکل خاموش ہے، طوفان کا نام ونشان تک نہیں ہے، موسم بھی نہایت خوش گوار رہا، البتہ بحیرۂ احمر میں گرمی تھی۔ یہ سمندر عصائے کلیم کا ضرب خوردہ ہے، گرم مزاج کیوں نہ ہو۔ چاروں طرف، جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے، سمندر ہی سمندر ہے؛ گویا قدرتِ الٰہی نے آسمان کے نیلگوں خیمے کو اُلٹ کر زمین پر بچھا دیا ہے۔[۳۵]

شاید ۱۹ر ستمبر کو ہم سویز کینال میں داخل ہوئے۔ فراعنۂ مصر، قدیم ایرانیوں، مسلمانوں اور اہلِ فرنگ نے اپنے عروج وقوت کے زمانے میں اس نہر کے مٹے ہوئے نقوش کو اُبھار کر اس سے فائدہ اُٹھایا؛ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس حیرت انگیز کینال کی اہمیت، یعنی تجارتی اہمیت کا خاتمہ قریب ہے۔ سیاسی اعتبار سے صلح وجنگ کے زمانے میں ہر قوم کے جہاز اس میں سے گزر سکتے ہیں۔ سویز کینال کے بیشتر حصص انگریزی تصرف میں ہیں اور یہ غالباً اسماعیل پاشا خدیو مصر کی عیش پرستی کا نتیجہ ہے، کیونکہ اس نے اپنے تمام حصص انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیے تھے۔ قریباً ڈھائی کروڑ پونڈ کی لاگت سے ایشیا اور یورپ کے سمندروں کو ملانے والی یہ آبی سڑک تیار ہوئی تھی، لیکن اب شاید اس کی وہ

۳۳: بنام طاہر الدین، ۲۱/۹/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۴۲۔ ۲۴۳ ۳۴: ایضاً، ۲۴۳

۳۵: ایضاً

اہمیت نہ رہے، جو اسے پہلے حاصل تھی۔ پرواز کی وسعت و ترقی اور وسط ایشیا اور وسط یورپ میں ریلوے کی تعمیر سے دنیا کے دو بڑے حصوں میں جدید تجارتی رستوں کا کھل جانا، ایک نئی، مگر خشک سویز کینال کو معرضِ وجود میں لانے والا ہے، جس سے تجارتی اور غالباً سیاسی دنیا میں بھی ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گا۔ اگر آئندہ بیس پچیس سال میں ایسا ہو گیا تو طاقتور کمزور اور کمزور طاقتور ہو جائیں گے۔ تلک الایّام نداولها بين الناس [۳:۱۴۰]۔[۳۶]

مَیں اپنی عادت کے مطابق آفتاب نکلنے سے پہلے ہی تلاوت سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ اس کے بعد دیگر حوائج سے فراغت پاتے پاتے برک فاسٹ کا وقت آ جاتا ہے۔ برک فاسٹ کے بعد عرشۂ جہاز پر ہم سفروں سے گفتگو یا گول میز کانفرنس پر، جس کی خبریں لاسلکی کے ذریعے سے ہر روز جہاز پر پہنچ جاتی ہیں، بحث و مباحثہ، پر گذشتہ سال کی رپورٹوں کا مطالعہ۔ ہاں، کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہو جاتی ہے۔ سید علی امام کو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ الولد سرٌ لابیه، ان کے والد ماجد مولانا نواب امداد ادبیاتِ اردو میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے۔ جہاز پر گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ وطن میں بھی بہت کم کھاتا تھا، مگر یہاں تو صرف سبزی، ترکاری، مچھلی اور انڈے پر گزران ہے۔ ایک تو گوشت کی طرف رغبت بہت کم ہے، دوسرے ذبیحہ بھی مشتبہ ہے، البتہ غیر مشتبہ ذبیحہ بھی کبھی کبھی مل جاتا ہے، وہ اس طرح کہ سر علی امام کی بیگم صاحبہ کہ نیک نفسی اور شرافت کا مجسمہ ہیں، اپنے شوہر کے ہمراہ ہیں، ذبیحہ کے متعلق خاص طور پر محتاط ہیں [اور] اپنا باورچی ساتھ لائی ہیں۔ ان کی عنایت سے غیر مشتبہ ذبیحہ اور مغلی کھانا قریباً قریباً ہر روز ہماری میز تک پہنچ جاتا ہے، اگرچہ اس میں میرا حصہ بالعموم سبزی اور چاول تک محدود رہتا ہے۔[۳۷]

ہمارے جہاز میں کچھ زیادہ مسافر نہیں۔ گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلمان نمائندے شاید سات آٹھ ہیں۔ راجا نریندر ناتھ صاحب بھی اسی جہاز میں ہیں۔ چار مسلمان نمائندے ہیں اور چاروں مغرب زدہ۔ مغرب زدہ کی اصطلاح شاید معارف نے وضع کی

۳۶: بنام طاہر الدین، ۲۱/۹/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۴۳-۲۴۴ ۳۷: ایضاً، ۲۴۴-۲۴۵

تھی، نہایت پُر لطف ہے، لیکن مسلمانوں کے اس مغرب زدہ قافلے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں دو حافظِ قرآن ہیں، یعنی نواب صاحب چھتاری اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین۔ مقدم الذکر ہر روز [قرآن کا] دَورہ کرتے ہیں اور سنا ہے کہ ہر سال تراویح بھی پڑھاتے ہیں۔ سید علی امام صاحب کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشۂ جہاز پر کھڑے تھے۔ مَیں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے، 'دیکھو بھائی اقبال! اس وقت ہمارا جہاز ساحلِ مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے'۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی، ان کی آنکھ نمناک ہوگئی اور بے اختیار ہو کر بولے، بلغ سلامی روضة فیھا النبی المحترم۔ ان کے قلب کی کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ باقی رہا مَیں، مغرب زدہ بھی ہوں اور مشرق زدہ بھی؛ البتہ مشرقی ضرب میرے لیے زیادہ کاری ثابت ہوئی۔ باقی ہم سفروں میں مسٹر جسٹس سہروردی، شیخ مشیر حسین قدوائی اور اودھ کے دو نوجوان تعلقدار ہیں۔ قدوائی صاحب نہایت پُر جوش پین اسلامسٹ ہیں۔ تبلیغی فرائض سے کبھی غافل نہیں رہتے اور اودھ کے دو تعلقداروں میں ایک عربی خوب بولتے ہیں۔ دوسرے سمجھ لیتے ہیں، مگر بول نہیں سکتے۔ ان دونوں جوانوں کے والد مدتوں کربلائے معلیٰ میں مقیم رہے، یہی وجہ ہے کہ عربی بول اور سمجھ لیتے ہیں۔[۳۸]

....

ہندوؤں کو فکر لگی رہتی ہے کہ مسلمان افغان، بلوچ اور سرحد کے مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اگر مصر آزاد ہو جائے تو مصری اپنا ملک ترکوں کو اس وجہ سے حوالے کر دیں گے کہ ترک مسلمان ہیں؟ نیز کانگریس کا عدم تشدد محض انگریزی سنگینوں کے سامنے ہے، ورنہ مرزاپور، کانپور اور سری نگر وغیرہ کے حالات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تشدد ہے۔[۳۹]

۳۸: بنام طاہر الدین، ۲۱/۹/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۳۵-۲۳۶ ۳۹: گفتارِ اقبال، ۱۳۷

مَیں پنجاب، شمال مغربی صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ حکومت خود اختیاری، خواہ سلطنت برطانیہ کی حدود میں ہو یا اس سے باہر، شمال مغربی ہند میں ایک متحدہ و منظم ریاست کا قیام مسلمانوں یا کم از کم مسلمانانِ مغربی ہند کی منزلِ آخر معلوم ہوتا ہے۔ مَیں نے برطانوی سلطنت سے باہر ایک مسلم مملکت کا مطالبہ پیش نہیں کیا ہے، بلکہ دھندلے مستقبل میں ان زبردست قوتوں کی امکانی کارفرمائی کے متعلق یہ ایک تخمینہ ہے، جو برِصغیر ہند کے مقدر کی اس وقت صورت گری کر رہی ہیں۔ کوئی ہندوستانی مسلمان، جو عقل کا ادنیٰ سا شائبہ رکھتا ہے، عملی سیاست کے ایک منصوبے کی حیثیت سے برطانوی دولتِ عامہ سے باہر شمال مغربی ہند میں ایک مسلمان مملکت یا مملکتوں کے سلسلے کو قائم کرنے کا خیال نہیں کر رہا۔ وسط پنجاب کے متعلق ایک تجویز، جو جوشیلے حضرات نے پیش کی ہے، یہ فرقہ وارانہ کشاکش کا ایک اکھاڑا ہوگا اور مَیں اگرچہ اس کے خلاف ہوں، تاہم مَیں ہندوستان کی ایسے صوبوں میں ازسرِنو تقسیم کا حامی ہوں، جس میں کسی ایک فرقے کی مؤثر اکثریت ہو؛ جس کی وکالت نہرو رپورٹ اور سائمن رپورٹ نے بھی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم صوبوں کے متعلق میری تجویز اسی تخیل کو آگے بڑھاتی ہے۔ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر مطمئن اور منظم مسلم صوبوں کا ایک سلسلہ سطح مرتفع ایشیا کی بھوکی نسلوں کے خلاف ہندوستان کے لیے ایک برطانوی سلطنت کے لیے فصیل ثابت ہوگا۔[۴۰]

ہمارے نوجوان طلبہ نے، جو انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، میری تجویز کردہ ہندی اسلامی ریاست کے لیے پاکستان کا نام وضع کیا ہے۔ اس میں 'پ' سے مراد پنجاب، 'الف' سے افغانی (سرحدی) صوبہ، 'ک' سے کشمیر، 'س' سے سندھ اور 'تان' سے بلوچستان۔[۴۱]

ہندوستان سے اخبار آتے ہیں، عجیب خبریں اخبارات میں چھپتی ہیں، مثلاً پرتاب میں لکھا ہے کہ مہاتما گاندھی کو شاہی محل میں کمرہ مل گیا ہے اور جب وہ بازار سے گزرتے ہیں تو ہزاروں لوگوں کا ہجوم ان کے گرد ہوتا ہے؛ حالانکہ حال یہ ہے کہ اُن کے آنے کا یہاں اُلٹا

۴۰: بنام London Times، ۱۰/۱۰/۱۹۳۱ء ۴۱: اقبال کے حضور، ۱۳۲

اثر ہوا ہے۔ مسلمان ڈیپوٹیشن متحد ہے اور گفتگو مصالحت کے خاتمہ کا ہندوؤں کے یا سکھوں کے سر پر ہے۔ اخبار ٹائمز میں مفصل حالات چھپ گئے ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ ہندو مسلمانوں کو بدنام کرنے کی ہر کوشش کر رہے ہیں، مگر برٹش پبلک کو اب ان کے پراپیگنڈے کی اصل حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر ہمدردی ہے۔ نومبر میں مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات، یعنی عالمِ اسلام کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کے متعلق انگریزوں کی طرف سے ایک بہت بڑی میٹنگ ہوگی، جس کے پراپیگنڈے پر ایک ہزار پونڈ خرچ کیا جائے گا۔ فی الحال عام انتخابات پارلیمنٹ کی وجہ سے آفیشل میٹنگ کانفرنس کی نہیں ہو رہی۔ ۳ر نومبر کو نئی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوگا، اس کے بعد ہماری کانفرنس کی کارروائی کا آغاز ہوگا، اس سے پہلے مینارٹی کمیٹی کا اجلاس دو دفعہ ہوا اور دونوں دفعہ چند منٹ کے بعد اجلاس ملتوی ہوگیا۔[۴۲]

مینارٹی کمیٹی کے تین اجلاس ہوئے اور تینوں دفعہ کمیٹی پرائیویٹ گفتگو کے لیے ملتوی کر دی گئی، اس واسطے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ہوا [ملا؟]۔ ہندوؤں نے یہاں بھی میرے [الہ آباد] ایڈریس کے متعلق بعض انگریزوں سے پراپیگنڈا کیا، مَیں نے اس کا دندان شکن جواب اخبار ٹائمز میں شائع کرایا تھا۔[۴۳]

۴ر نومبر کو انڈیا سوسائٹی میں میرا لیکچر ہے، جس کا مضمون [موضوع؟] فلسفہ اور شعر ہے۔ ۹ر نومبر کو لی سی ایم کلب کی عورتوں نے دعوت دی ہے، وہاں مَیں ایک ظریفانہ تقریر کروں گا۔ ۷ر نومبر کو یہاں کے مسلمان طلبہ مجھے ایڈریس دینے والے ہیں۔ کانفرنس کا اجلاس شاید وسط نومبر میں ختم ہو جائے۔ ایسا ہوا تو مَیں پیرس، برلن، روم ہوتا پورٹ سعید پہنچوں گا۔ وہاں سے ایک ہفتے کے لیے مصر و فلسطین جاؤں گا۔ غالباً وسط دسمبر تک لاہور پہنچ جاؤں گا۔[۴۴]

۴۲: بنام شیخ عطا محمد، ۱۹۳۱/۱۰/۱۵ء، سوم، ۲۴۹
۴۳: بنام مختار احمد، ۱۹۳۱/۱۰/۲۲ء، سوم، ۲۵۳
۴۴: ایضاً

مینارٹی کمیٹی کی میٹنگ تین دفعہ ہوئی اور تینوں دفعہ پرائیویٹ گفتگوے مصالحت کے لیے ملتوی ہوگئی۔ پرائیویٹ گفتگوئیں بہت ہوئیں، مگر اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہندو اور سکھ، مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب مینارٹی کمیٹی کی میٹنگ، جس کا مَیں ممبر ہوں، شاید ۱۱رنومبر کو ہو، اس میں بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مینارٹی کا کام محض مصالحت کی کوشش ہے، یہ کوشش کی گئی، جس کا نتیجہ اس وقت تک کچھ نہیں ہوا۔ شاید ۲۰رنومبر تک ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ روما جانے کا بھی قصد ہے، اس کے بعد وقت ہوا تو مصر اور فلسطین بھی۔[۴۵]

ابتدا ہی سے مسلم وفد کی کارروائی کو بہ نظر غائر دیکھتا رہا ہوں۔ ان کی خفیہ رقابتوں اور بعض اراکین کی سازشوں، بلکہ بے وفائیوں سے مجھے بے انتہا تکلیف پہنچی۔ اس طرزِ عمل سے بیزار ہو کر مَیں نہایت افسوس کے ساتھ...... [آغا خاں] کو اطلاع دے رہا ہوں کہ آج کی تاریخ [۱۶رنومبر ۱۹۳۱ء] سے مجھے اس سے، جس کو مسلم وفد کی ظلّی کابینہ (Shadow Cabinet) کہنا چاہیے، کوئی سروکار نہیں رہے گا۔[۴۶]

ایک بات، جو میرے لیے اَب تک راز ہے اور غالباً ہمیشہ راز رہے گی، وہ ہمارے نمائندوں کا ۲۶رنومبر کا اعلان تھا، جو انھوں نے وفاقی ڈھانچا کمیٹی کے اجلاس میں کیا تھا، جس کی رُو سے وہ صوبائی خودمختاری اور مرکز کی ذِمہ داری کے بیک وقت نفاذ پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مَیں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آیا اس کی وجہ مفاہمت اور ملک کی سیاسی ترقی کے لیے ان کی بے چینی تھی یا کچھ متضاد اثرات ان پر اثر انداز ہوئے۔ ۱۵رنومبر کو جب مَیں نے مسلم وفد سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا تو مسلم مندوبین نے طے کیا کہ وہ وفاقی ڈھانچا کمیٹی کے مباحث میں شریک نہ ہوں، پھر انھوں نے اپنے فیصلے کے برخلاف ان مباحث میں کیوں حصہ لیا؟ آیا وفاقی ڈھانچا کمیٹی میں ہمارے نمائندے ۲۶رنومبر کے اعلان کا مجاز رکھتے تھے؟ مَیں ان سوالات کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مسلم قوم

۴۵: بنام عبداللہ چغتائی، سوم، ۲۵۴-۲۵۶ ۴۶: بنام آغا خاں، ۱۶/۱۱/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۵۶

اس اعلان کو زبردست غلطی تصور کرتی ہے۔ مَیں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبے میں کُل ہند وفاق کے تصور کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ یہ (کُل ہند وفاق) ہند کی سیاسی ترقی کے لیے رکاوٹ بن رہا ہے۔ اگر مرکزی ذمہ داری کا اطلاق کُل ہند وفاق کی تکمیل پر ہے، جو مجھے اندیشہ ہے کہ کافی وقت لے گا تو اس صورت میں حکومت کو چاہیے کہ فوراً ذمہ دار حکومت رائج کریں، تاکہ مرکزی ذمہ داری کے حصول تک ان بنیادوں کا تجربہ ہو جائے، جن کا خاکہ بن چکا ہے اور وہ وفاق کا بھاری بھرکم بوجھ سنبھالنے کے لائق ہو سکیں۔ حقیقی جدید وفاقی ریاست کے حصول سے قبل یہ اہم بنیادی کام بے حد ضروری ہے۔[۴۷]

وفد سے الگ ہونے سے چند روز پہلے مجھے یہ شبہ ہوا تھا اور مَیں چند وجوہ کی بنیاد پر یہ باور کرتا ہوں کہ ہمارے نمائندوں کو کچھ انگریز سیاست دانوں نے غلط مشورے دے کر برطانوی ہند کے صوبوں میں ذمہ دار حکومت کے فوری نفاذ سے روکا تھا۔[۴۸]

مَیں نے کانفرنس سے استعفا نہیں دیا، بلکہ صرف مسلم وفد سے علیحدگی اختیار کی تھی اور مَیں نے یہ بات آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے ماتحت کی تھی۔...... مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب، صوبہ سرحد اور سندھ کے مسائل پر عملی طور پر بحث و تمحیص ختم ہو چکی ہے۔ دارالعوام میں وزیرِ اعظم اور سر سیموئیل ہور نے ان کے متعلق واضح بیان دے دیا ہے۔ اب جس مسئلے کا تصفیہ باقی ہے، وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کا مسئلہ ہے۔[۴۹]

یہاں [لندن] آ کر میری صحت اچھی ہو گئی، البتہ گذشتہ رات سردی کی وجہ سے دانت کا درد ہوا، مگر تکلیف جلد رفع ہو گئی۔[۵۰]

کافی عرصہ لندن میں ٹھہرنا پڑے گا اور جب لندن کی گول میز کانفرنس ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد میرا ارادہ برلن کے رستے روم جانے کا ہے، جہاں مجھے کچھ روز ٹھہرنے اور

۴۷: سفرنامۂ اقبال، ۸۷-۸۸

۴۸: سفرنامۂ اقبال، ۸۸

۴۹: گفتارِ اقبال، ۱۴۶-۱۴۷

۵۰: بنام مختار احمد، ۱۹۳۱/۱۰/۲۲ء، سوم، ۲۵۳-۲۵۴

پرانے چند دوستوں سے ملاقات کرنے کا موقع ملے گا۔[۵۱]

....

مَیں ہائیڈل برگ میں اُن ایام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، جب ...... [ایما] نے مجھے گوئٹے کا فاؤسٹ پڑھایا تھا اور ہر طرح میری امداد کی تھی۔ وہ واقعی بڑے خوش گوار دِن تھے۔ مَیں پوری کوشش کروں گا کہ ہائیڈل برگ پہنچوں اور ...... [ایما] سے ایک بار پھر اُس جگہ ملوں۔ مجھے روم سے دعوت نامہ موصول ہوا ہے اور مَیں ہندوستان واپس جانے سے پیشتر وہاں پہنچنے کا خواہش مند ہوں۔ میرے دل میں اُن بیتے ہوئے خوش گوار ایام کی یاد تازہ کرنے کی کس قدر تمنا ہے، جو افسوس ہے، ہمیشہ کے لیے گزر گئے۔[۵۲]

[لیکن] میرے پروگرام میں اچانک ردّ و بدل کی مجبوری کے سبب اب میرے لیے جرمنی میں سے گزر کر جانا ممکن نہ ہو سکے گا، بلکہ سیدھا روم پہنچنا پڑے گا، جہاں سائینور مارکونی [Signor Marconi] نے مجھے مدعو کر رکھا ہے اور وہاں سے ۷/دسمبر کو بین الاقوامی مسلم کانفرنس میں شرکت کے لیے یروشلم جاؤں گا۔ مجھے زندگی میں ...... [ایما] سے ایک بار پھر مل کر اور پرانی وابستگیوں کی یاد تازہ کر کے بے حد مسرت ہوتی، مگر بد قسمتی سے فی الحال ایسا ممکن نہیں۔ بہر حال، امکان ہے کہ مَیں اگلے سال پھر یورپ آؤں۔[۵۳]

جرمنی میرے لیے ایک طرح سے دوسرا روحانی وطن تھا۔ مَیں نے اس ملک میں بہت کچھ سیکھا تھا اور بہت کچھ سوچا تھا۔ گوئٹے کے وطن نے میری روح کے اندر گھر کر لیا ہے۔[۵۴]

[لیکن] افسوس کہ مَیں جرمنی نہ آ سکا اور اُن سہانے دِنوں کی یادیں تازہ نہ کر سکا، جو مَیں نے ...... [ایما] اور دیگر احباب کے ساتھ ہائیڈل برگ میں گزارے تھے۔ میرے دل میں ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ مَیں دوبارہ ملوں۔ مَیں نے ایک کمی سی محسوس کی ہے اور خود کو اپنے ہی ملک میں تنہا پایا ہے۔ جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے، اس تنہائی کا احساس بھی بڑھتا جاتا ہے، لیکن سوائے تسلیم و رضا کے اَور کوئی چارۂ کار نہیں اور مَیں بھی پوری تسکین دل کے ساتھ اپنی

۵۱: بنام ایما، ۱۵/۱۰/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۵۰-۲۵۱
۵۲: بنام، ۲۰/۱۰/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۵۱-۲۵۲
۵۳: بنام ایما، ۱۹/۱۱/۱۹۳۱ء، سوم، ۲۵۷-۲۵۸
۵۴: بنام ایما، ۱۷/۱/۱۹۳۲ء، سوم، ۲۶۷-۲۶۸

قسمت پر شاکر ہوں۔[55]

....

[مسولینی]: میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

[مَیں]: آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے، جسے اسلام انسانی نظامِ حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے، لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہوگا۔

[مسولینی]: مَیں دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں؟

[مَیں]: مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان طلبہ کو اٹلی بلائیے۔

[مسولینی]: کوئی اور مشورہ بھی دیں

[مَیں]: ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے حد سے نہ بڑھنے دو، اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔

[مسولینی (حیران ہو کر)]: اس میں کیا مصلحت ہے؟

[مَیں]: شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے، اس کی تہذیبی اور اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکاتِ شر لے لیتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے، بلکہ میرے پیغمبرؐ نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی کہ جب مدینہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کے بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔

[مسولینی (کھڑا ہو کر اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مار کر)]: کتنا حسین تخیل ہے![56]

مسولینی

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ، ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ، ملت کا شباب

۵۵: بنام ایما، ۱۷/۱/۱۹۳۲ء، سوم، ۲۶۶-۲۶۷
۵۶: روزگارِ فقیر، ۴۳-۴۴

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب
رومۃ الکبریٰ! دِگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
ایں کہ می بینم بہ بیداریست یا رَب یا بہ خواب!
چشم پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت ، یہ تمنا ، یہ نمود
فصلِ گُل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے ، کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب[۵۷]

مسولینی کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے، جس کو شعاعِ آفتاب سے تعبیر کر سکتے ہیں، کم از کم مجھ کو اسی قسم کا احساس ہوا۔[۵۸]

[اٹلی میں میری ایک دوست کاؤنٹس کارنیوالے نے دریافت کیا کہ] اگر آپ کو یہاں کی کوئی خاص چیز دیکھنی ہے تو فرمایئے، تاکہ اس کا انتظام کیا جائے۔ [مَیں نے جواب دیا کہ] اطالیہ کا حسن مشہور ہے، مَیں اس شہر روما کی حسین خواتین دیکھنا چاہتا ہوں۔ [اور پھر ان خواتین کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ] اطالیہ کا حسن یورپ میں بہترین ہے، [کیونکہ] اس ضیافت میں حسن کے بعض نہایت لطیف نمونے تھے۔[۵۹]

جب مَیں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کیتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ

۵۷: کلیاتِ اقبال اردو، ۴۸۰-۴۸۱
۵۸: بنام آلِ احمد سرور، ۱۲/۳/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۳۷
۵۹: بحوالہ سفر نامۂ اقبال، ۱۳۱

ہے۔ اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ صرف کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کرسکتی۔ اس نے لاکھوں روپیہ صَرف کر کے تاریخی مواد جمع کیا ہے۔ جب مَیں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے دلچسپی کیوں ہے تو انھوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔[٦٠]

....

[۲/دسمبر ۱۹۳۱ء کو قاہرہ میں مصر کے مشہور صاحب طریقت بزرگ سید محمد ماضی ابوالعزام اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ تشریف لائے تو مَیں نے عرض کی] 'حضرت! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی، مَیں خود زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا'۔ کہنے لگے، 'حضور خواجہ دو جہاںؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو، اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی، لہٰذا مَیں اس ارشاد کے اتباع میں آیا ہوں، تا کہ میرے آقا مجھ سے خوش ہوں'۔ [یہ سن کر مَیں بے تاب ہو گیا اور سید صاحب کے جانے کے بعد اشک ریز ہو گیا، سوچنے لگا کہ] ایسا زمانہ بھی آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گناہ گار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دو جہاںؐ کے ارشاد میں بغرضِ خوشنودیِ آنحضرتؐ ملنے آتے ہیں۔[٦١]

مجھے علم ہوا کہ [القدس میں] بیت اللحم کے گرجا کا آلٹر تین حصوں میں منقسم تھا اور یہ حصے ارمنی، یونانی اور کیتھولک کلیسا کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔ یہ فرقے آپس میں جھگڑتے رہتے تھے اور کبھی کبھار آپس میں خون خرابہ ہو جاتا اور ایک دوسرے کے آلٹر کی بے حرمتی کی جاتی۔ ہندوستان کے حالات کے برخلاف یہاں دو مسلمان سپاہی قیامِ امن کے لیے متعین تھے۔[٦٢]

افسوس کہ مَیں مؤتمر کے اختتام تک نہیں ٹھہر سکا اور مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ عربی زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کے سبب مباحث میں بھی زیادہ حصہ نہ لے سکا۔ میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر مقاماتِ مقدسہ اسلامیہ فلسطین کی زیارت کروں، جو انبیا کی سرزمین ہے۔[٦٣]

٦٠: سفرنامۂ اقبال، ۱۳۴ ٦١: ایضاً، ۱۴۸-۱۴۹

٦٢: ایضاً، ۱۸۹ ٦٣: ایضاً، ۲۰۹

سفرِ فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ فلسطین کے زمانہ قیام میں متعدد اسلامی ممالک، مثلاً مراکش، مصر، یمن، شام، عراق، فرانس اور جاوا کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر مَیں خاص طور پر متاثر ہوا اُن نوجوانانِ اسلام میں اس قسم کے خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی، جیسی مَیں نے اطالیہ میں فاشسٹ نوجوانوں کے علاوہ کسی میں نہیں دیکھی۔ مَیں نے اسلام، عیسائیت اور صیہونیت کے بعض مشترکہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی، خصوصاً حضرت عیسیٰ کے مقامِ ولادت سے مَیں بہت متاثر ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی اسکیم بالآخر ناکام رہے گی۔ مؤتمر شاندار طریق سے کامیاب رہی۔ اس عظیم الشان اجتماع میں اکثر اسلامی ممالک کے نمائندے شریک ہوئے اور اسلامی اخوت اور ممالک اسلامی کہ آزادی کے مسائل پر مندوبین نے بے حد جوش وخروش کا اظہار کیا۔ مَیں بہت سی سب کمیٹیوں کا رُکن تھا، جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھیں۔ ایک سب کمیٹی میں مَیں نے یروشلم میں قدیم جامع ازہر کی طرز پر ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل جدید طرز پر قائم کی جائے۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوگئی کہ مَیں یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کے قیام کا حامی نہیں ہوں۔ رائٹر نے ایک تار بھیج دیا تھا، جس کا مفہوم یہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری یہ پُرزور خواہش ہے کہ عربی زبان بولنے والے لوگ صرف ایک ہی نہیں، بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علومِ جدیدہ کو زبانِ عربی میں تبدیل کر لیں۔[۶۴]

میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل عرب کے اتحاد پر موقوف ہے۔ جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام کامیاب ہو جائے گا۔[۶۵]

....

مدینۃ النبی کی زیارت کا قصد تھا، مگر میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ دُنیوی

۶۴: گفتارِ اقبال، ۱۴۵-۱۴۶ ۶۵: سفرنامۂ اقبال، ۲۱۰

مقاصد کے لیے سفر کرنے کے ضمن میں حرمِ نبوی کی زیارت کی جرأت کرنا سوءِ ادب ہے۔ اس کے علاوہ، بعض مقامی احباب سے وعدہ تھا کہ جب حرمِ نبوی کی زیارت کے لیے جاؤں گا تو وہ میرے ہم عناں ہوں گے۔ ان دونوں خیالوں نے مجھے باز رکھا، ورنہ کچھ مشکل امر نہ تھا۔ یروشلم سے سفر کرنا آسان ہے۔ اس وقت ابنِ سعود کے بعض قبائل دیگر قبائلِ عرب سے، جو یروشلم اور مدینۃ النبی کے درمیان راہ میں ہیں، برسرِ پیکار تھے، مگر یہ کوئی [ایسی] مشکل نہ تھی، جس کا تدارک نہ ہو سکے۔[۶۶]

[یورپ و فلسطین سے واپسی پر] مَیں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔[۶۷] یہ احساس سدِ راہ ہوا کہ حضورؐ کے در پر حاضری کے لیے گھر سے صرف اسی نیت سے اور اپنے خرچ پر سفر کرنا چاہیے۔ دنیوی مقصد کے سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لگے ہاتھوں حضورؐ کے روضے پر حاضری کے لیے جانا مجھے آدابِ محبت کے خلاف محسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے توج کی نیت بھی ہے اور زیارتِ روضۂ رسولؐ کی بھی۔[۶۸]

....

لندن سے واپسی پر ہمارا جہاز عدن پہنچا تو مولوی شفیع داؤدی عرشۂ جہاز پر کھڑے گرد و پیش کے مناظر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب بھی تھی، جو اتفاقاً سمندر میں گر گئی۔ مولوی صاحب پریشان ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں کہ دفعتہً ان کی نگاہیں اُن صومالی لڑکوں پر پڑیں، جو چھوٹی چھوٹی کشتیاں لے کر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، تاکہ مسافر چاہیں تو انھیں اپنی غوطہ خوری کے کرتب دِکھائیں۔ مولوی صاحب نے جو انھیں دیکھا تو سمجھے کہ مشکل حل ہو گئی۔ چلّائے اور کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکوں سے کہنے لگے، 'یا شیخ! یا شیخ! ذالک الکتاب'۔ بے چارے عربی تو جانتے نہیں تھے، 'یا شیخ!' اور 'ذالک الکتاب' سے کام نکل گیا۔ لڑکے ان کے اشاروں سے سمجھ گئے کہ مطلب اس

۶۶: بنام ادیب تونسوی، ۱۹۳۲/۲/۱۱ء، سوم، ۲۷۰

۶۷: روزگارِ فقیر، ۳۴

۶۸: سفرنامۂ اقبال، ۲۲۲

کتاب سے ہے، جو سطح سمندر پر تیر رہی ہے اور قریب تھا کہ موجوں میں غائب ہو جائے، اس پر ایک نے کشتی سے پانی میں چھلانگ لگائی اور کتاب لے کر عرشئہ جہاز پر چڑھ آیا۔ مولوی [شفیع] صاحب نے اطمینان کا سانس لیا کہ کتاب مل گئی۔[۶۹]

۶۹: اقبال کے حضور، ۵۰-۵۱

۱۹۳۲ء

مَیں آج [۷؍جنوری کی] شام دہلی آ رہا ہوں، ۸؍جنوری کی صبح کو آٹھ بجے دہلی پہنچوں گا اور اسٹیشن پر ہی ٹھہروں گا۔ اسی شام، یعنی ۸؍کی شام کو ہی واپس آنا ہوگا۔[1]

....

انگلستان میں مسلمانوں کے مطالبات سے مَیں حد درجہ مایوس ہوا اور وہ کیفیت اَب تک باقی ہے۔ تجربے نے مجھے سکھایا ہے کہ بہت ہی کم لوگوں پر اعتبار کرنا چاہیے۔ جہاں تک...... [عبداللہ ہارون] کے مجوزہ وفد کا تعلق ہے، مَیں فی الحال اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مَیں لاہور میں منعقد ہونے والی اگلی کانفرنس کی صدارت کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ابھی اپنے خیالات کو اس بارے میں محفوظ رکھنا چاہیے کہ مسلمانانِ ہند اَب کیا راستہ اختیار کریں، جب کہ [انگلستان کے] وزیرِ اعظم نے عملی طور پر ان خیالات کو قطعاً لائقِ التفات نہیں سمجھا۔[2]

یہاں کے حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری کی وجہ سے کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔ جس قسم کی قوت خدا تعالیٰ نے مجھے دی ہے، مَیں اس قوت سے کام لے سکتا ہوں، لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ اخلاص و دیانت کے لوگ بہت دشمن ہیں۔ ولایت کا تجربہ میرے لیے بڑا تلخ ثابت ہوا۔[3]

....

مَیں دہلی کے لیے تیار تھا اور علی بخش بستر وغیرہ بھی باندھ چکا تھا۔ خیال تھا کہ گوٹ

۱: بنام نذیر نیازی، ۷/۱/۱۹۳۲ء، سوم، ۲۶۱
۲: بنام عبداللہ ہارون، ۱۶/۱/۱۹۳۲ء، سوم، ۲۶۱-۲۶۳
۳: بنام عبدالرحیم، ۱۷/۱/۱۹۳۲ء، سوم، ۲۶۴-۲۶۶

[gout] کی تکلیف، جو مجھے گذشتہ رات ہوگئی تھی، آج شام تک رفع ہوجائے گی۔ مَیں نے اس کا علاج بھی کیا، مگر گرگابی پہنی تو تکلیف بڑھ گئی، اس واسطے مَیں [آل انڈیا مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت کے لیے] دہلی نہ جاسکوں گا۔[4]

مَیں آج دہلی جانے کے لیے تیار ہوگیا تھا، مگر جاوید کا بخار بدستور ہے۔ رات بھی ایک سو پانچ ہوگیا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب نے دیکھا ہے، ان کو شبہ ہے کہ بخار میعادی ہے۔ پختہ پتا کل صبح کے معائنے سے ہوگا۔ اس تشویش کی حالت میں میرے لیے سفر مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔[5]

....

[صوبہ سرحد میں حکومت کی سخت گیری اور کشمیری مسلمانوں پر تشدد] یہ سب مظاہر آنے والے اُس طوفان کا پیش خیمہ ہیں، جو ممکن ہے، تمام ہندوستان، بلکہ پورے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ یہ اس سیاسی تہذیب کا ناگزیر نتیجہ ہے، جس نے انسان کو ایک ایسی شے سمجھ رکھا ہے، جو صرف استحصال کے قابل ہو اور جسے ایک شخصیت تصور کر کے تہذیبی طاقتوں کے ذریعے نشوونما کے مواقع فراہم نہ کیے جائیں۔ ایشیا کی اقوام مغرب کی مروجہ استحصالی معیشت کے خلاف، جسے مشرق پر مسلط کیا گیا ہے، یقیناً اٹھ کھڑی ہوں گی۔ مسولینی کا قول تھا کہ جس کے پاس لوہا ہے، اس کے پاس روٹی ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ جو خود لوہا ہے، اس کے پاس سب کچھ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی اصل راز ہے۔ ہمارا واضح نصب العین یہ ہے کہ آنے والے دستور میں اسلام کے لیے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کریں کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے۔ اس نصب العین کی روشنی میں لازم ہے کہ قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو بیدار کیا جائے اور اس کی خوابیدہ قوتوں کو منظم کیا جائے۔ شعلۂ حیات دوسرے سے مستعار نہیں لیا جاسکتا، وہ صرف اپنی روح کے آتش کدے میں روشن کیا جاسکتا ہے۔[6]

۴: بنام مہر، ۱۹۳۲/۱/۳۰ء، سوم، ۲۶۸

۵: بنام مہر، ۱۹۳۲/۲/۱۹ء، سوم، ۲۷۲

۶: *Speeches*, p-44 (ترجمہ جاوید اقبال)

۷: ایضاً

وہ لوگ، جنھیں مسلمانوں کی سیاسی قیادت حاصل ہے اور جو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش میں ان کی رہنمائی کر رہے ہیں، ابھی تک ان کے ذہنوں میں انتشار ہے۔ گو مسلم عوام میں قربانی کے جذبے کا فقدان نہیں ہے، پچھلے چند سالوں کے واقعات شاہد ہیں کہ قوم کی رہنمائی کسی قابلِ قبول اصول کے ماتحت نہیں کی جاتی، جس کا نتیجہ خود ہماری سیاسی جماعتوں کے اندر اختلاف اور تضاد کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔[۸]

....

مَیں آج کل یونیورسٹی کے امتحانوں کے کاغذات دیکھنے میں مصروف ہوں۔[۹]

نکلسن اور سٹر ڈینی سن داس نے بہت اچھے خطوط جاوید نامہ کے متعلق لکھے ہیں۔ پروفیسر ہیل اس کا جرمنی ترجمہ کریں گے۔[۱۰]

مَیں نے آج ہوائی ڈاک سے برطانوی فیلسوف میک ٹیگرف پر ایک مقالہ بھیجا ہے۔ وہ کیمبرج میں میرے ماسٹر تھے اور قریباً دو سال ہوئے، رحلت کر گئے۔ ان سے متعلق یہ مقالہ مَیں نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کی فرمائش پر لکھا ہے اور Indian Society میں شائع ہوگا۔[۱۱]

....

جس حالت میں ہندو اور سکھ مسلمانوں سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ چھ صوبہ جات اور مرکز میں اپنے آپ کو عظیم ہندو اکثریت کے حوالے کر دیں، وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی شدید مخالفت کر کے ہندوستان بھر کی ہندو اکثریت کی نیک نیتی کا نقش کس حد تک بٹھا سکیں گے اور مسلمانوں کے قلوب میں ان کی طرف سے کس حد تک اعتماد پیدا ہوگا۔[۱۲]

ذاتی طور پر مَیں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں خاصا مایوس ہوں۔ بمبئی کے [مسلمان پٹھانوں کے خلاف] فسادات ابھی جاری ہیں، اس صورتِ حال نے مجھے خاصا

۸: Speeches, 45-46
۹: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۲/۵/۶ء، سوم، ۲۷۸
۱۰: ایضاً
۱۱: بنام فارقوہرسن، ۱۹۳۲/۵/۲۲ء، سوم، ۲۸۶
۱۲: گفتارِ اقبال، ۱۴۹

پریشان کیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا نتیجہ خوں ریزی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا اور اس سے ایک طرح کی بے اطمینانی کے لیے میدان ہموار ہوگا، مگر کوئی شخص بھی نہیں چاہے گا کہ ملک کے اندر ایسی بے اطمینانی بڑھتی رہے۔ کچھ لوگوں نے تو اب اس انداز میں سوچنا شروع کر دیا ہے کہ ہندوستان کو بھی [۱۹۱۷ء کی] سوویت طرز کی خوں ریزی سے گزرنا چاہیے۔[۱۳]

ایک ہندو بزرگ مسٹر للت کا خط میرے پاس آیا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ [ڈاکٹر] مونجے [شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں کے ادغام سے متعلق] تمھاری اسکیم کو، جو تم نے [الہ آباد میں] لیگ کے صدارتی ایڈریس میں پیش کی تھی، تسلیم کرتے ہیں۔ پنڈت [مدن موہن] مالوی سے بھی مشورہ کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ وہ بھی ہندو مسلمانوں کی صلح کی خاطر اس کو تسلیم کر لیں گے، گو اس وقت علانیہ طور پر اس اسکیم کو تسلیم کرنا مصلحت نہیں ہے۔[۱۴]

اگر فرقہ وارانہ فیصلہ مسلمانوں کے موافق نہ ہو تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ حکومت سے لڑیں، لیکن مَیں یہ مشورہ انھیں نہ دوں گا کہ وہ کسی قسم کا راست قدم محض اس لیے شروع کر دیں کہ حکومت ایک مقررہ مدت کے اندر فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان نہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔ واقعات کے اس کھلم کھلا اظہار کے بعد مسلمان یہ اندازہ کریں گے کہ ایگزیکٹو بورڈ کے جلسے کے ملتوی کرنے کا جو مشورہ مَیں نے دیا تھا، وہ کہاں تک شملہ کے چشم و ابرو کے اشاروں سے متاثر تھا۔ اپنی خانگی اور پبلک زندگی میں مَیں نے دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی کبھی نہیں کی۔ ایسے وقت، جب کہ جماعت کے بہت ہی اہم مفادات کی بازی لگی ہوئی ہے، اس آدمی کو، جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے، مَیں اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں۔ مَیں اس امر کو اچھی طرح واضح کر دوں کہ جن لوگوں نے التوا کی خواہش کی تھی، ان کے رویے کی یہ تعبیر نہ کی جائے کہ وہ قرار دادِ لاہور پر عمل کرنے کے

۱۳: بنام فارقوہرسن، ۲۲/۵/۱۹۳۲ء، سوم ۲۸۴
۱۴: بنام محمد عرفان، ۵/۷/۱۹۳۲ء، سوم ۲۸۹-۲۹۰

لیے (اگر اس پر عمل کرنے کی ضرورت لاحق ہو) تو دوسروں سے پیچھے رہیں گے۔ جب تک یہ ضرورت لاحق نہ ہو، جماعت کو چاہیے کہ اپنی طاقتوں کو محفوظ رکھے۔ دانائی یہ نہیں [کہ] اپنی توانائی کو غیر اہم مسائل پر صرف کیا جائے، بلکہ اس کو اُن معاملات پر خرچ کرنے کے لیے محفوظ رکھا جائے، جو واقعتاً اہمیت رکھتے ہیں۔[15]

مسلمانانِ ہند جس قدر اپنی جماعت کے مفادات کو ملحوظ رکھنے کے لیے مضطرب ہیں، اتنے ہی وہ ملک کی دستوری ترقی کے لیے بے چین ہیں۔ مرکز میں اور اُن صوبوں میں، جہاں وہ نہایت ہی حقیر اقلیت میں ہیں، اکثریتی حکومت کے اصولوں کو وہ تسلیم کرتے ہیں، بشرطیکہ ان کو اس جائز اور متوازی فائدے سے محروم نہ کر دیا جائے، جو انھیں بعض دیگر صوبوں کے اندر اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔[16]

گذشتہ رات پنڈت موتی لال نہرو کا ایک تار میرے نام آیا تھا، جس کا مقصود یہ تھا کہ مَیں اس بیان پر دستخط کر دوں، جو دہلی سے شائع ہوا ہے اور جو آج کے انقلاب میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس کے جواب میں مندرجہ ذیل تار دیا گیا ہے:

Commited to joint statement already heard from Lahore sorry cannot sign another statement another unity Conference essential.[17]

میرے لیے یہ چیز کوئی تعجب انگیز نہیں کہ ہندوستان کی قومیت متحدہ کے تخیل کے علم بردار اور ہندوستانی اقلیتوں میں فرقہ وارانہ بیداری (جو سیاسی طاقت کے انتقال کا لازمی نتیجہ ہے) کے اشدترین مخالف [مسٹر گاندھی] نے نہایت دلیری سے بالخصوص ہندو قومیت کے تحفظ کے مسئلے کی حمایت کو نہایت ضروری خیال کیا۔ یہ صورتِ حالات مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ مہاتما، جو ملک کی تمام اکثریتوں کو قومیت متحدہ ہند میں جذب ہو جانے کی تلقین کیا کرتا تھا، آج اسے ایک ایسے فرقہ وارا اعلان میں ہندو قوم

15: اقبال کا سیاسی کارنامہ، ۳۵۱ 16: ایضاً، ۳۵۳

17: بنام مہر، ۱۹۳۲/۸/۱۷، سوم، ۲۹۱

کا انتشار نظر آ رہا ہے، جس کے ذریعے سے مجالس وضع آئین میں ان لوگوں کو محدود نمائندگی حاصل ہونے کا امکان ہے، جو خود مہاتما گاندھی کے نزدیک صدیوں تک ہندوؤں کی اونچی جاتیوں کے تختۂ مشق بنے رہے ہیں۔ اگر اچھوتوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے یہ معنی ہیں کہ ہندو قوم کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے تو مخلوط انتخاب کا یہ مطلب ہوگا کہ جو اقلیتیں اسے اختیار کریں گی، وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائیں گی۔ میرے خیال میں مہاتما گاندھی کی روش سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ جس اقلیت کو اپنے جداگانہ وجود کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہو گی، اسے جداگانہ انتخاب سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔[18]

اس وقت بنی نوع انسان کی سب سے بڑی خدمت ہی احیائے اسلام ہے، اس لیے کہ اسلام کی نعمت سے خود مسلمان محروم ہے۔ جمہوریت اور سوشلزم کا کوئی نہ کوئی شکل اختیار کرنا ہندوازم کے لیے موت ہے۔ اسلام کے لیے یہی چیز اس کی حیاتِ ثانیہ کا سامان ہے۔ جدید دنیا کے حالات اور مقتضیات خود بخود اسلام کی حقیقی اساس کو نمایاں کرتے جائیں گے۔ اسلام کی خدمت خود فطرت کا کارنامہ ہوگی، نہ [کہ] مسلمانوں کا۔[19]

....

میرے یورپ جانے کا ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا۔ اگر گیا تو اِسی اکتوبر میں ہی جاؤں گا اور [ورنہ؟] اِن شاء اللہ آئندہ سال۔[20]

لندن کی Arestotelian Society نے مجھ سے کسی فلسفیانہ مضمون پر لیکچر دینے کی درخواست کی تھی، جو آج ختم کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ?Is Religion Possible۔ اگر خود گیا تو یہ لیکچر زبانی دیا جائے گا، ورنہ ڈاک میں بھیج دیا جائے گا۔ لیکچر لکھنے میں قریباً ایک ماہ صرف ہوا۔ Arestotelian Society لندن کی ایک مشہور اور پرانی سوسائٹی ہے اور بہت سے مغربی حکما کی آنکھیں دیکھ چکی ہے۔[21]

۱۸: گفتارِ اقبال، ۱۵۵-۱۵۶

۱۹: بنام راغب احسن، ۱۹۳۲/۱۰/۴ء، سوم، ۲۹۹

۲۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۲/۹/۲۹ء، سوم، ۲۹۶

۲۱: ایضاً، ۲۹۸

مَیں آج رات الور وفد کے سلسلے میں شملہ جا رہا ہوں، غالباً ۷ر کی صبح لاہور واپس آ جاؤں گا۔[۲۲]

....

سیاسیات سے علیحدگی تیسری گول میز کانفرنس کے بعد ہی ہوگی، اس سے پہلے نہیں۔ اگر اس دفعہ گیا تو بعض ممالکِ اسلامیہ کو بھی دیکھوں گا۔ یہ بات بعض حالات پر منحصر ہے۔ خدمتِ اسلام کی ایک تجویز اس وقت ذہن میں ہے، اس میں اَور بھی دو چار حضرات شریک ہیں۔ سب سے بڑی دِقت فنڈ کی ہے، اگر یہ مرحلہ طے ہوگیا تو امیدِ کامل ہے کہ کوئی اچھی صورت نکل سکے۔ حضرت زین العابدین فرماتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کسی قوم سے ناراض ہوتا ہے تو اس قوم کا مال بخیلوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔[۲۳]

باہمی سمجھوتے کی کوشش قابلِ ستائش ہے، لیکن ہندوؤں کی طرف سے قطعی تجاویز پیش ہوئے بغیر مسلمان رہنماؤں کی کانفرنس منعقد کرنا نقصان رساں ہے[۲۴]۔ مسلمانانِ ہند نے دوسرے فرقوں سے مفاہمت کے لیے ہمیشہ اپنی آمادگی کا اظہار کیا ہے، لیکن جو طریقہ اس وقت اختیار کیا جا رہا ہے، وہ ہندوؤں سے معاملات کرنے کا طریقہ تو نہیں ہے، بلکہ اس سے ہماری اپنی صفوں میں افتراق پیدا ہوگا، جسے ہم نے بڑی مشکلوں سے دُور کیا ہے۔ طریقہ انتخاب کے سوال کو معمولی قرار دینا اور اس کو دوبارہ چھیڑنا، باوجودیکہ مسلم جماعت نے اس بارے میں اپنا واضح فیصلہ دے دیا ہے، جیسا کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں سے ظاہر ہوتا ہے، ایک بہت ہی غیر دانش مندانہ طریقہ ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ مجوزہ کانفرنس اسلام اور ہندوستان کے مفاد کے لیے مضر اور بالکلیہ تضیع اوقات کا باعث ہے[۲۵]۔ میرا عقیدہ [خیال؟] یہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے مطالبات میں از خود ترمیم کر دیں اور بالخصوص اصولِ انتخاب میں۔[۲۶]

۲۲: بنام راغب احسن، ۴/۱۰/۱۹۳۲ء، سوم، ۲۹۸
۲۳: ایضاً، ۲۹۹
۲۴: اقبال کا سیاسی کارنامہ، ۳۷۰
۲۵: ایضاً، ۳۷۰-۳۷۱
۲۶: بنام ہمدم، ۳/۱۰/۱۹۳۲ء، سوم، ۳۰۰-۳۰۱

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے تصفیے میں اَور کچھ ہو نہ ہو، پنجاب کے اندر مسلمانوں کی اکثریت پانچ سات کی زیادتی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ صوبہ سرحد کو آئندہ نظام میں مساوات کا درجہ ملتا ہے، سندھ کی علیحدگی کے امکانات بھی قریب تر آ گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی جداگانہ انتخاب بھی قائم رہا ہے، جو میری ناقص رائے میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کی اساس ہے۔ جداگانہ انتخابات کو غیر مشروط طور پر قائم رکھ کر حکومت نے مسلمانوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنا مستقبل آپ منتخب کر لیں۔ چاہیں تو اکثریت میں جذب ہو جائیں اور چاہیں تو کم از کم بعض حصص ملک میں اپنی جداگانہ ملی ہستی کو برقرار رکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ اگر آج مسلمانوں نے قبل از وقت جداگانہ انتخاب سے دست برداری کر لی تو آئندہ مؤرخ ان کے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے مٹ جانے کے لیے حکومتِ برطانیہ کو ہرگز مطعون نہ کرے گا، بلکہ خود مسلمانوں کو اس بات کا مجرم قرار دے گا کہ جمہوری نظام میں بحیثیت اقلیت انھوں نے اپنی بربادی اپنے ہاتھوں مول لی۔ تاسف کا مقام ہے کہ ہمارے بعض لیڈر، جن میں بعض علمائے دین بھی شامل ہیں، مسئلہ انتخاب کو محض نمائندگی کا طریقہ کار تصور کرتے ہیں اور بس! جہاں تک مَیں نے مسلمانانِ ہند کی گذشتہ تاریخ اور ایشیائی اقوام کے موجودہ امیال و عواطف اور مغربی اقوام کی ریشہ دوانیوں پر غور کیا ہے، جن کا اثر اِس وقت مشرقی اقوام کے سیاسیات پر ہو رہا ہے، مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ ابھی ایک عرصے تک مسلمانانِ ہند کا مستقبل جداگانہ انتخاب سے وابستہ ہے۔[۲۷]

....

اسلام اور تمدنِ اسلامی اس وقت دنیا کے ہر نزدیک و بعید خطے میں ایک عظیم انقلابی کیفیت سے دوچار ہے۔ ترکی کا اجتہادی اقدام، ایران کا دَورِ تجدد، مصر کا جوشِ اصلاح، افغانستان کا مغربی توغل؛ غرض عالمِ اسلام کے جس نقطہ مدنیت پر نظر ڈالیے، حیات کا ایک ہنگامہ زار برپا ہے۔ ممالک اسلامیہ کے یہ تمام تر تغیرات خفی اور جلی، ہندوستانی مسلمانوں

۲۷: بنام ہمدم، ؟/۱۰/۱۹۳۲ء، سوم، ۳۰۱-۳۰۲

کے لیے جہاں ایک نویدِ زندگی کی شادابیوں سے لبریز ہیں، وہاں درحقیقت ایک پیامِ بیداری کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔[۲۸]

فلسطین کی صورتِ حال نے مسلمانانِ ہند میں زبردست ہیجان واضطراب پیدا کردیا ہے۔ نائب وزیرِ نوآبادیات کی تقریر نے مسلمانوں کے شبہات کو زیادہ عمیق بنادیا ہے کہ برطانیہ کی یہ پالیسی ہے کہ عربوں کے مفادات کے خلاف عمل پیرا ہوکر فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت قائم کردی جائے۔ نائب وزیرِ نوآبادیات نے برطانیہ کی جو پالیسی بیان کی ہے، وہ صریحاً مخالفانہ ہے۔ فلسطین میں حال ہی میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں، وہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ فوراً تحقیقات کی جائے اور فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ جلد از جلد روک دیا جائے۔ برطانیہ کے بہترین مفاد کا اقتضا یہ ہے کہ 'اعلانِ بالفور' کو واپس لے لیا جائے۔[۲۹]

....

جس طرح ایران کے دانشور، نیازمند [اقبال] کے دیدار کے خواہش مند ہیں، اسی طرح مجھے بھی ان سے ملنے اور ایران پہنچنے کی آرزو ہے، لیکن کمزوری اور پریشانی سدِ راہ ہیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد افغانستان کا سفر درپیش ہے، آرزو ہے کہ ایران کو بھی دیکھوں۔[۳۰]

....

چار پانچ سال ہوئے، بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ مَیں نے فرقہ وارانہ مسئلے کے ممکنہ حل کے طور پر مغربی ہند میں ایک وسیع مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ اگرچہ یہ تجویز مسلمانانِ ہند کے مطالبات میں شامل نہ تھی، لیکن میری ذاتی رائے اب بھی یہی ہے کہ صرف یہی ایک ممکنہ حل اس مسئلے کا ہے۔ مَیں اتنی دیر انتظار کرنے کو تیار ہوں، جب تک تجربہ اس تجویز کی معقولیت یا غیر معقولیت ثابت کرکے نہیں دِکھا دیتا۔[۳۱]

۲۸: گفتارِ اقبال، فٹ نوٹ، ۱۶۹-۱۷۰
۲۹: بنام وائسرائے، ۶/۱۱/۱۹۳۲ء (گفتارِ اقبال، ۱۷۹)
۳۰: بنام سعید نفیسی، ۴/۱۱/۱۹۳۲ء، سوم، ۳۰۴
۳۱: بحوالہ زندہ رُود، ۴۸۱

مسلمانانِ ہند کے مطالبات کے پیچھے جو اصول کارفرما ہے، وہ اتنا سادہ ہے کہ برطانوی عوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ سے اوپر ہے۔ اس آبادی کا نصف حصہ پورے ملک میں بکھرا ہوا ہے، تاہم اس کا بڑا حصہ نسبتاً گھنا ہوا ہے، بالخصوص ان صوبوں میں، جو مغربی ہند کے علاقے میں واقع ہیں۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ستاون فیصد ہے، سندھ میں تقریباً تہتر فیصد اور صوبہ سرحد میں پچانوے فیصد ہے۔ مسلمانوں کا مؤقف یہ ہے کہ بحیثیت ان لوگوں کے، جو ایک مخصوص تاریخی روایت اور یک جہتی کی نمائندگی کرتے ہیں، جو ہندوستان کی کسی دوسری جماعت میں نہیں پائی جاتیں، وہ اپنی زندگی آپ گزارنا چاہتے ہیں اور اپنے تمدنی خطوط پر ترقی کرنا چاہتے ہیں۔[۳۲]

....

۳۰ر دسمبر کو لندن سے چل کر سیدھا ہسپانیہ جاؤں گا، وہاں سے واپس پیرس آ کر ہائیڈل برگ، برلن، بوڈاپسٹ سے ہوتا جنیوا (اٹلی) سے جہاز وکٹوریہ پر سوار ہوں گا۔ یہ جہاز ۲۶ر جنوری ۳۳ء کو جنیوا سے چلے گا اور ۶ر فروری کو بمبئی پہنچے گا۔...... میں ایک آدھ روز کے لیے خلافت ہاؤس میں ٹھہروں گا یا افغانستان قونصل خانہ میں، ...... غرض کہ پچیس روز یورپ کی سیر کے لیے ہیں۔[۳۳]

جہازوں کی روانگی کی موزوں تاریخیں نہ ملیں، اس واسطے اب میں ہسپانیہ، جرمنی اور آسٹریا ہوتا ہوا، ۱۰ر فروری کو وینس سے بمبئی کے لیے جہاز لوں گا، اس جہاز کا نام 'کانٹے وردی' [کونتے وردی] ہے اور یہ بمبئی ۲۲ر فروری کو صبح کو پہنچے گا۔[۳۴]

۳۲: بحوالہ زندہ رُود، ۵۴۸
۳۳: بنام چودھری محمد حسین، ۱۹۳۲/۱۲/۲۴ء، چہارم، ۱۰۳۶، ۱۰۳۸
۳۴: بنام مختار احمد، ۱۹۳۲/۱۲/۲۹ء، سوم، ۳۰۶

۱۹۳۳ء

مَیں اِن دِنوں جنوبی اسپین میں سیاحت کر رہا ہوں۔ یہاں عربوں کے بنائے ہوئے محل اور مسجدیں فنِ تعمیر کا نادر اور تمام و کمال نمونہ ہیں۔[1]

قید خانے میں معتمد کی فریاد

اِک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا، جاتی رہی تاثیر بھی
مردِ حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
مَیں پشیماں ہوں، پشیماں ہے مِری تدبیر بھی
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دِل
تھی اسی فولاد سے شاید مِری شمشیر بھی
جو مِری تیغِ دو دم تھی، اب مِری زنجیر ہے
شوخ و بے پروا ہے کتنا خالق تقدیر بھی[2]

مَیں خدا کا شکر گزار ہوں کہ مَیں اس مسجد [قرطبہ] کے دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔[3]

میری رائے میں اس [مسجد قرطبہ] سے زیادہ خوب صورت اور شاندار مسجد رُوے زمین پر تعمیر نہیں ہوئی۔ عیسائیوں نے بعد فتح قرطبہ اس مسجد میں جا بجا چھوٹے

۱: بنام روتھین، ۲۰/۱/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۰۹
۲: کلیاتِ اقبال اردو، ۴۲۸-۴۲۹
۳: بنام جاوید اقبال، ؟/۱/۱۹۳۳ء، ۳۱۳-۳۱۴

گرجے بنادیے تھے، جنھیں اب صاف کر کے مسجد کو اصل حالت میں لانے کی تجویزیں کی جا رہی ہیں۔ مَیں نے ناظمِ آثارِ قدیمہ کی معیت میں جا کر بہ اجازتِ خاص اس مسجد میں نماز ادا کی۔ قرطبہ پر عیسائیوں کے تسلط کے بعد، جسے کم و بیش ساڑھے چار سو برس گزر چکے ہیں، اس اسلامی عبادت گاہ میں یہ پہلی اسلامی نماز تھی[4]

مَیں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے تاریخی مقامات کا معائنہ کیا۔ مسجد قرطبہ کی فضا صدیوں سے بے اذاں پڑی ہے۔ خدا کے حضور گڑگڑایا کہ اللہ! یہ وہ سرزمین ہے، جہاں مسلمانوں نے سیکڑوں برس حکومت کی، یونیورسٹیاں قائم کیں اور یورپ کو علم و فضل سکھایا؛ جن کے دبدبے سے شیروں کے دل دہلتے تھے اور جن کے احسان کے نیچے آج تمام فرنگستان دبا ہوا ہے۔ آج مَیں اُسی قوم کا ایک فرد انھی کی تعمیر کردہ مسجد میں اغیار کی اجازت لے کر نماز پڑھ رہا ہوں۔[5]

ہے یہی میری نماز ، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
صحبتِ اہلِ صفا ، نُور و حضور و سرور
سرخوش و پُرسوز ہے لالہ لبِ آبجو
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مِرے رہ گئی ایک مِری آرزو
میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تُو ، شاخِ نشیمن بھی تُو
تجھ سے گریباں مِرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مِرے سینے میں آتشِ 'اللہ ھُو'
تجھ سے مِری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تُو ہی مِری آرزو ، تُو ہی مِری جستجو[6]

۴: آئینۂ اقبال، ۱۸۰-۱۹ ۵: ملفوظاتِ اقبال، ۲۷۴

۶: کلیاتِ اقبال اردو، ۴۱۷-۴۱۸

مَیں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم 'مسجد قرطبہ' پر لکھی، جو کسی وقت شائع ہوگی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا، لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا، جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ [۷]

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود
کافرِ ہندی ہوں مَیں، دیکھ مِرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و دُرود، لب پہ صلوٰۃ و دُرود

....

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تُو بھی جلیل و جمیل
تیری بِنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نُور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل

....

تجھ سے ہوا آشکار، بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

....

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

۷: بنام محمد اکرام، ۱۹۳۳/۳/۲۷ء، سوم، ۳۳۲

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے، اور نہیں ہے کہیں

....

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں[8]

مَیں جنوبی ہسپانیہ کے سفر کے بعد آج میڈرڈ واپس پہنچا ہوں۔ افسوس کہ میرے لیے اس مرتبہ [بھی] ہائیڈل برگ آنا ناممکن ہوگا۔ مجھے وہ تمام ٹکٹ منسوخ کرنے پڑے، جو مَیں نے لندن میں خریدے تھے، کیونکہ میرے لیے لازمی ہے کہ مَیں وینس سے ۱۰رفروری کو روانہ ہونے والے جہاز کونتے وردی پکڑوں[9]

جب مَیں (اسپین میں) پرادا[Parada] میوزیم (مجریط) دیکھنے گیا تھا تو مَیں نے بار بار...... [روتھین] کے مصورانہ کمالات کو مشعلِ راہ بنا کر یورپ کے عظیم مصوروں کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ ان اساتذۂ فن کی بنائی ہوئی تصویریں کیسی خوب صورتی کے ساتھ اس میوزیم میں سجی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ میوزیم مجھے لوور[Louvre] (پیرس) کے مقابلے میں کہیں زیادہ دلچسپ معلوم ہوا[10]

امید ہے کہ چند ہی دِنوں میں وینس (Conte Verde) پہنچ جاؤں گا، تا کہ ۱۰رفروری کو Conte Verde جہاز میں ہندوستان کے لیے روانہ ہوسکوں[11]

کل مع الخیر میڈرڈ پہنچے۔ یہاں سے قرطبہ غرناطہ وغیرہ جائیں گے۔ ۶رفروری تک وینس پہنچنا ہے۔ آج یہاں کے وزیرِ تعلیم سے ملاقات ہوئی اور پروفیسر آسن سے، جنھوں نے دانتے کی ڈوائن کامیڈی اور اسلام [*Divine Comedy & Islam*] پر کتاب لکھی ہے۔ صدرِ جمہوریہ [اسپین] سے غالباً ملاقات ہوگی[12]

۸: کلیاتِ اقبال اردو، ۴۲۱-۴۲۶
۹: بنام ایما، ۳۱/۱/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۱۰
۱۰: بنام روتھین، ۲۸/۲/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۱۹
۱۱: بنام روتھین، ۲۰/۱/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۰۹
۱۲: بنام مہر، ۱۵؟/۱/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۱۱-۳۱۲

مَیں آج [۲۶/جنوری] شام ہسپانیہ سے مع الخیر واپس آ گیا۔ خدا کے فضل و کرم سے وہاں ہر طرح خیریت رہی اور اپنی خواہش کے مطابق مسجد قرطبہ میں نماز پڑھی۔[13]

ہسپانیہ! تُو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تُو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی؟
باقی ہے ابھی رنگ مِرے خونِ جگر میں![14]

ہسپانیہ پر نظم یوں تو تمام تر پُر سوز ہے، لیکن طارق سے متعلق اشعار بالخصوص دل گداز ہیں۔ کوشش کروں گا کہ یہ اشعار اردو میں منتقل ہو سکیں۔[15]

یہ غازی ، یہ تیرے پُراَسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دِل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی[16]

۱۳: بنام طاہر الدین، ۲۶/۱/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۱۲
۱۴: کلیاتِ اقبال اردو، ۴۳۰-۴۳۱
۱۵: بنام محمد اکرام، ۲۷/۳/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۳۳
۱۶: کلیاتِ اقبال اردو، ۴۳۲

مَیں نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ کی سیاحت کی اور قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کے قصر الحمرا کے علاوہ مَیں نے مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے۔ یہ مشہور عالم قصر، عبدالرحمٰن اول نے اپنی چہیتی بیوی زہرا کے لیے ایک پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا۔[17]

ہسپانیہ میں قیام کے دَوران میں عربی کے بہت سے پروفیسروں سے میرا رابطہ قائم ہوا، جو اسلام کے کلچر کے بارے میں بہت پُرجوش نظر آتے تھے۔ میڈرڈ یونیورسٹی نے [۲۴ر جنوری کی شام کو[18]] Spane and the Intellectual World of Islam کے موضوع پر مجھ سے یونیورسٹی میں خطاب کرنے کی درخواست کی۔ میرے خطاب کو بے حد سراہا گیا۔ صدارت [وہاں کے وزیرِ تعلیم] پروفیسر آسن [Prof. Asin Palacio] نے کی، جو *Divine Comedy and Islam* کے معروف مصنف ہیں۔ ہسپانیہ کی نئی حکومت غرناطہ کو دنیائے اسلام کے لیے ایک طرح کا تہذیبی مکہ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔[19] پروفیسر آسن نے بحیثیت صدر اپنی افتتاحی تقریر میں میری تعریف وتوصیف میں خوب مبالغہ کیا۔[20]

ہسپانیہ میں میری پرائیویٹ سیکرٹری، برطانوی لڑکی، نے میرے متعلق اپنا رویہ دفعتہ تبدیل کرلیا اور پرائیویٹ سیکرٹری کے بجائے ایک مرید کی طرح میری خدمت کرنے لگی۔ مَیں نے اس کی روِش میں واضح تبدیلی کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ وہ مجھے فرشتہ محسوس کرنے لگی ہے اور اعتراف کیا کہ مَیں اپنے محسوسات کی وضاحت تو نہیں کرسکتی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مَیں بے وقوف نہیں ہوں۔[21]

پیرس میں قیام کے دَوران میں برگساں سے ملاقات ہوئی۔ جدید فلسفے اور تمدن (civilization) پر ہماری گفتگو تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ کچھ وقت ہم نے برکلے پر تبادلہ خیال کیا، جس کے فلسفے پر بعض فرانسیسی فلاسفروں نے نہایت دلچسپ مشاہدات پیش کیے ہیں۔[22] ...... [برگساں] نے کہا کہ بُرکلے کے فلسفے کا حاصل یہ ہے کہ ادراک حس میں

۱۷: *Speeches*, p-271 (ترجمہ جاوید اقبال)
۱۸: بنام طاہر الدین، ۱۹۳۳/۱/۲۶ء، سوم، ۳۱۲
۱۹: بنام لوتھین، ۱۹۳۳/۳/۱۷ء، سوم، ۳۲۹
۲۰: بنام محمد اکرام، ۱۹۳۳/۳/۲۷ء، سوم، ۳۳۳
۲۱: بنام عطیہ، ۱۹۳۳/۵/۲۹ء، سوم، ۳۴۹-۳۵۰ (ترجمہ اصلاح شدہ)
۲۲: بنام لوتھین، ۱۹۳۳/۳/۱۷ء

مادّہ ماندگی کے بغیر بہ تمام و کمال منکشف ہو جاتا ہے، مگر عقل کے ساتھ یہ صورت نہیں'۔ برکلے کے فلسفے کی یہ تخلیص کیسی دلچسپ ہے! برگساں سے میری گفتگو دو گھنٹے جاری رہی ہے۔ برگساں اِن دِنوں بہت نحیف اور علیل ہیں اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر رکھا ہے، لیکن انھوں نے از راہِ عنایت مجھے اس قدغن سے مستثنیٰ رکھا۔[۲۳]

مَیں نے اپنے لیکچر 'کیا مذہب ضروری ہے؟' میں جدید نفسیات کی زبان میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا تصوف کیا ہے۔ پروفیسر برگساں، جنھوں نے میرا لیکچر پڑھا تھا، میرے سامنے اعتراف کیا کہ خود ان کا اپنا فلسفہ بھی اس رُخ پر جا رہا ہے۔[۲۴]

میرا ارادہ تھا کہ برگساں سے اپنی بات چیت کو شائع کروں، لیکن بدقسمتی سے جو صاحب میرے ہمراہ تھے،[۲۵] یعنی امراؤ سنگھ، گفتگو بھی انھیں کے توسط سے ہوتی رہی اور انھیں نے اسے قلم بند بھی کیا، مگر اس بُرے طریق سے کہ بعد میں انھیں خود بھی اپنی تحریر کا پڑھنا مشکل ہو گیا۔[۲۶]

اب یہاں [پیرس میں] چند روز قیام کر کے وینس جاؤں گا، وہاں سے جہاز ۱۰رفروری کو چلتا ہے۔ اِن شاءاللہ ۲۲رفروری کی صبح بمبئی پہنچ جاؤں گا۔[۲۷]

....

مَیں ۲۵رفروری کو لاہور پہنچا اور اِس وقت اُن کاموں کو نمٹا رہا ہوں، جو میری غیر حاضری میں جمع ہو گئے تھے۔[۲۸]

....

میری زندگی کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں، وہ دُور ہو جائیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا، مَیں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا، جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔[۲۹]

۲۳: بنام روتھین، ۱۹۳۳/۲/۲۸ء، سوم، ۳۲۰
۲۴: بنام تھامپسن، ۱۹۳۳/۷/۲۹ء، سوم، ۳۶۶-۳۶۷
۲۵: بنام روتھین، ۱۹۳۴/۱/۲۹ء، سوم، ۴۵۸
۲۶: اقبال کے حضور، ۲۰۵
۲۷: بنام طاہر الدین، ۱۹۳۳/۱/۲۶ء، سوم، ۳۱۲
۲۸: بنام فارقوہرسن، ۱۹۳۳/۲/۲۷ء، سوم، ۳۱۸
۲۹: گفتارِ اقبال، ۱۶۶، ۱۶۷

مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ آنے والے انتخابات کے لیے اپنے آپ کو منظم کریں اور ایسے تمام اسباب کا سدِ باب کریں، جن سے ان کے اندر فرقہ وارانہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مجوزہ دستور واضح طور پر اقلیتوں کے اصول کو تسلیم کرتا ہے۔[30]

....

ڈاکٹر انصاری کا تار ابھی آیا ہے کہ دہلی آ کر رؤف پاشا کے لیکچر کی صدارت کروں۔ یہ لیکچر ۴، ۶، ۸/ مارچ کو ہوں گے۔ مَیں ان کے لیکچر کی صدارت کے لیے جاؤں گا۔[31]

....

لارڈ لوتھین کو [انگریزی خطبات پر مشتمل] میری کتاب پسند آئی۔ مَیں اپنے خطبات کا ایک نسخہ ارسال کر رہا ہوں۔ اگر ان کو آکسفرڈ یونیورسٹی شائع کرے تو یہ میرے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔[32] مَیں خطبات میں کہیں کہیں تھوڑا بہت ردّ و بدل کروں گا اور اپنے اس خطبے بعنوان 'کیا مذہب کا امکان ہے؟' کا اضافہ بھی کروں گا، جو مَیں نے لندن کی ارسطالین سوسائٹی کے سامنے دیا تھا۔[33] لارڈ لوتھین ان خطبات کے متعلق بڑی گرم جوشی کا اظہار فرما رہے ہیں اور انگلستان میں ان کی طباعت و اشاعت کے آرزومند ہیں۔[34]

....

میرا [لندن] آنا یقینی نہیں، کیونکہ جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے رُوبرو پیش ہونے والے ہندوستانی مندوبین کی تعداد غالباً کم کر دی جائے گی اور مَیں خواہ مخواہ دوسروں کے پیچھے بھاگے پھرنے کا عادی نہیں۔[35]

مَیں ۴/ اپریل کی شب کو یہاں [لاہور] سے روانہ ہو کر ۵/ اپریل کی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔ ۶/ اپریل کو مسئلہ ایجوکیشن پر وائسرائے کے ہاں کانفرنس ہے۔ اس کانفرنس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا ہے، کیونکہ لندن میں جو سب کمیٹی اس کے لیے بنی تھی، اس کا مَیں بھی ممبر

۳۰: Speeches, p-270 (ترجمہ جاوید اقبال)

۳۱: بنام عبدالوحید، ؟/۲/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۲۱

۳۲: بنام تھامسن، ۶/۳/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۲۴

۳۳: بنام لوتھین، ۱۷/۳/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۲۹

۳۴: بنام محمد اکرام، ۲۷/۳/۱۹۳۳ء، سوم، ۲۳۴

۳۵: بنام فارقوہرسن، ۱۶/۳/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۲۷

تھا۔ غالباً دو تین روز یا ممکن ہے، ایک ہی روز یہ کانفرنس رہے۔ ۵/اپریل کی شام کو میرا لیکچر، جس کا عنوان یہ ہوگا: From London to Granada[۳۶]

....

بانگِ درا کی بیشتر نظمیں میری طالب علمی کے زمانے کی ہیں، زیادہ پختہ کلام افسوس کہ فارسی زبان میں ہوا۔ جاوید نامہ ایک قسم کی *Divine Comedy* ہے۔ مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔ اگر وہ ترجمے میں کامیاب ہو جائے اور اگر اس ترجمے کو کوئی عمدہ مصور Illustrate بھی کر دے تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہوگا۔ اس کتاب میں بعض بالکل نئے تخیلات ہیں اور مصور کے لیے بہت عمدہ مسالہ ہے۔ پیامِ مشرق کا ترجمہ جرمن زبان میں ہو رہا ہے، آرلانگن یونیورسٹی کے پروفیسر ہیل کر رہے ہیں[۳۷]

....

میری رائے میں [چینی ترکستان میں] اس یورش کا اصل سبب مذہبی تعصب نہیں۔ گو ایسی تحریک کے دَوران میں قائدین ہر قسم کے انسانی جذبات کو اپنی اغراض کے حصول کی خاطر اکسا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کے اسباب زیادہ تر اقتصادی ہیں۔ بہر حال، اگر چینی ترکستان کا انقلاب کامیاب ہوا تو اس کا اثر یقیناً افغانی اور روسی ترکستان پر بھی پڑے گا۔ انقلاب کی کامیابی کا یہ مطلب بھی ہوگا کہ چینی ترکستان میں صدیوں پرانے استعمار سے نجات حاصل کر کے یہاں ایک ایسی خوش حال اور مضبوط مسلم مملکت وجود میں آ جائے گی، جس کی ننانوے فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔ پس ہندوستان اور روس کے درمیان ایک اَور مسلم مملکت کا قیام بالشوزم کی ملحدانہ مادّیت کو ہمارے ملک کی حدود سے اَور بھی پرے دھکیل دے گا۔[۳۸]

....

جولائی کے آخر تک [Rhodes lectures کے سلسلے میں] میرے یورپ جانے کا

۳۶: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۳/۳/۳۰ء، سوم، ۳۳۶ ۳۷: بنام غلام محی الدین، ۱۹۳۳/۳/۳۱ء، سوم، ۳۳۸

۳۸: *Speeches*, p-275 (ترجمہ جاوید اقبال)

امکان ہے[۳۹]۔ اگر امسال نہ گیا تو آئندہ سال ان شاءاللہ العزیز[۴۰]

اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر تاثیر نے بھی چند رباعیات کا ترجمہ کیا ہے[۴۱]۔ ان کو رباعیات کہنا غلط نہیں، بابا طاہر عریاں کی رباعیات، جو اس بحر میں ہیں، رباعیات ہی کہلاتی ہیں۔ ان میں قطعات بھی داخل ہیں۔ ہاں، یہ صحیح ہے کہ یہ رباعیات رباعی کے مقررہ اَوزان میں نہیں ہیں، مگر اس کا کچھ مضائقہ نہیں[۴۲]۔

....

مجھے سیاست سے فی نفسہ کوئی دلچسپی نہیں، مجھے اسلام کے اخلاقی نظامِ حکومت میں جو دلچسپی ہے، اس نے مجھے سیاست کی طرف مائل کیا ہے۔ مَیں نے سوچا کہ ہندو قوم پرستی آخرکار الحاد کی طرف لے جائے گی۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ اسلامی نصب العین سے سراسر ناواقفیت کے باعث مسلمان اس قوم پرستی کے طوفان میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں میرا فرض تھا کہ آگے بڑھوں اور نوجوان نسل کے سامنے اسلامی نصب العین کا صحیح اور واضح مطلب پیش کروں۔ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے میری صدا سنی اور انگریزوں نے کسی حد تک اندازہ لگا لیا کہ مسلمانانِ ہند ایک جداگانہ قوم ہیں اور ان کے افکار و اطوار کے مطابق ان کو اپنی نشو و نما کے لیے مواقع فراہم ہونا چاہییں۔ اس کا مجھے یہ انعام reward ملا ہے، گو اس کے حصول میں مجھے زبردست نقصان اُٹھانا پڑا ہے اور جو تھوڑی بہت وکالت تھی، وہ ہندوستان سے میری دو سال کی مسلسل عدم موجودگی نے تقریباً برباد کر دی۔ سوچتا ہوں کہ مَیں نے اپنی اولاد کے ساتھ ناانصافی کی ہے، لیکن ایک مسلمان کا اسلام کی خدمت کا فریضہ اپنی اَولاد کی خدمت سے افضل ہے۔ مستقبل میں اسلام اور انگلستان کو دُشواریاں پیش آنے والی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ اسلام کا کوئی رہنما نہیں اور برطانوی سیاست دان معاملات فہمی میں سست رَو ہیں۔ سیاست میں میری دلچسپی ان حدود کو عبور نہ کرے گی، جو مَیں نے اپنے لیے متعین کی ہیں۔ نئے دستور کے تحت کسی کونسل یا اسمبلی کی

۳۹: بنام عطیہ فیضی، ۱۹۳۳/۵/۲۹ء، سوم، ۳۵۰
۴۰: بنام راغب احسن، ۱۹۳۳/۵/۳۰ء، سوم، ۳۵۱
۴۱: بنام غلام محی الدین، ۱۹۳۳/۵/۲۴ء، سوم، ۳۴۵
۴۲: بنام غلام محی الدین، ۱۹۳۳/۶/۵ء، سوم، ۳۵۱-۳۵۲

ممبری کے لیے میرا کھڑا ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔[۴۳]

....

بدقسمتی سے [کشمیر] کمیٹی میں بعض [قادیانی] ارکان کسی وفاداری کے پابند نہیں، سوائے اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے ساتھ وفاداری کے۔ اس کی وضاحت حال ہی میں ایک احمدی وکیل نے اپنے پبلک بیان میں بھی کر دی ہے، جو میرپور کے لوگوں کے کیس کر رہا تھا۔ اس نے صاف اعتراف کیا ہے کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو تسلیم نہیں کرتا اور وہ یا اس کے ساتھی جو کچھ بھی کرتے ہیں، صرف اپنے امیر کے حکم پر کرتے ہیں۔ بہرحال، اگر مسلمانانِ ہند اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد اور رہنمائی کرنا چاہتے ہیں تو ایک اَور کشمیر کمیٹی بنا سکتے ہیں۔[۴۴]

موجودہ زمانے میں ہندوستان کے اندر تحریک خلافت کے بعد تحریک کشمیر ایک ایسی تحریک ہے، جس سے خالص اسلامی جذبات کو عملی مظاہرے کا موقع ملا اور جس نے قوم کے تنِ مردہ میں حیاتِ تازہ کی لہر ایک دفعہ پھر دَوڑا دی۔ اہلِ خطہ [کشمیر] ملت اسلامیہ ہند کا جزوِ لاینفک ہیں اور ان کی تقدیر کو اپنی تقدیر نہ سمجھنا تمام ملت کو تباہی و بربادی کے حوالے کر دینا ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں فی الحقیقت ایک مضبوط و مستحکم قوم بننا ہے تو ان [مذکورہ] بالا نقطوں کو ہر وقت ذہن میں رکھنا ہوگا۔ بہرحال، اہل خطہ قومیت اسلامیہ ہند کے جسم کا بہترین حصہ ہیں اور اگر وہ حصہ درد و مصیبت میں مبتلا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ باقی افرادِ ملت فراغت کی نیند سوئیں۔[۴۵]

پنجاب پریس میں شائع شدہ خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر میں حالات ہرگز اطمینان بخش نہیں ہیں۔ ہجرت کی تحریک پہلے سے چل رہی ہے اور سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ کافی وحشت ناک صورتِ حال ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ بقیہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نقص امن کا باعث ہو۔ کشمیر کمیٹی کو محض یہ تردّد ہے کہ کسی طرح کشمیر میں حالات معمول پر رہیں۔ بہرکیف، اگر حالات اس حد تک خراب ہوئے، جن

۴۳: بنام تھامپسن ۱۹۳۳/۶/۲۰ء، سوم، ۳۵۶-۳۵۷

۴۴: Speeches, p-275 (ترجمہ جاوید اقبال)

۴۵: گفتارِ اقبال، ۱۷۴-۱۷۵

سے کشمیر کے باہر رہنے والے مسلمانوں میں نقصِ امن ہو جائے تو مَیں پیش بینی نہیں کر سکتا کہ کشمیر کمیٹی کیا اقدام کرے گی۔[۴۶]

[پنجاب کمیونل] فارمولا پنجاب کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ اس کے برعکس مختلف فرقوں کے مابین اَن دیکھے تنازعات کے سلسلے کا یہ ایک سرچشمہ بن جائے گا۔ یہ اسکیم (فارمولا) شہری اور دیہاتی آبادیوں کے نقطہ نظر سے نہایت قابلِ اعتراض ہے۔ جب اس کو رُوبعمل لایا جائے گا تو اس سے وہ دیہاتی طبقے بھی واجبی نمائندگی سے محروم ہو جائیں گے، جن کی اپنے حلقہ ہائے انتخاب میں اکثریت ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے اور اُن تمام ممکنہ تنازعات کو، جو اس کی وجہ سے پیدا ہوں گے، اندازہ لگانے کے بعد، میرا یہ پختہ خیال ہے کہ یہ اسکیم ہر فرقے کے بہترین مفادات کے لیے نقصان رساں ہے۔[۴۷]

....

...... [عبدالماجد دریابادی نے] 'وطنیت' کے اصول پر اسلام کے اصولِ اجتماعی کو ترجیح دینے میں مجھے امام العصر کہا ہے، [جب کہ] ایک نیشنلسٹ اخبار، جس کے چار ایڈیٹر ہیں اور چاروں مسلمان ہیں اور جس کا پہلا نمبر لاہور سے آج ہی نکلا ہے، لکھتا ہے کہ اقبال نے 'وطنیت' کا عذرِ لنگ تراشا ہے۔ دیکھا، مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے کتنے فرومایہ ہیں! ان کو معلوم نہیں کہ اسلامیت کیا ہے اور وطنیت کیا چیز ہے۔ 'وطنیت' ان کے نزدیک لفظ 'وطن' کا محض ایک مشتق ہے اور بس![۴۸]

افسوس کہ Lagacy of India کے لیے اسلامی ادب پر باب لکھنے کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ میرے پاس پہلے ہی کام بہت ہے۔ اردو کلام کا ایک مجموعہ مرتب کرنا ہے اور فکرِ اسلامی کی تاریخ میں تصورِ زمان و مکاں و حرکت کے موضوع پر ایک خطبہ لکھنا ہے۔ مؤخر الذکر موضوع پر کافی عرصے تک مجھے اپنی فرصت کے اوقات صرف کرنا ہوں گے۔[۴۹]

مَیں نے گذشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تقریر کی تھی، جو وہاں

۴۶: بنام گاربیٹ، ۱۳/۷/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۶۴
۴۷: Speeches, p-282-283 (ترجمہ جاوید اقبال)
۴۸: بنام دریابادی، ۲۷/۷/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۶۵-۳۶۶
۴۹: بنام تھامپسن، ۲۹/۷/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۶۶

کے اداشناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اب پھر اُدھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابنِ عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے۔[50]

[خطبات کا] اردو ترجمہ نیازی صاحب نے ختم کر لیا ہے، اس کی طباعت بھی عنقریب شروع ہوگی۔[51]

کتاب کی طباعت آکسفرڈ یونیورسٹی نے شروع کر دی ہے اور مَیں نصف کے قریب پروف دیکھ چکا ہوں۔ یہ پہلا پروف ہے۔ مسٹر ملفورڈ، مہتمم یونیورسٹی پریس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ کتاب فروری میں چھپ کر تیار ہو جائے گی۔ پروف دیکھتے وقت بعض جزوی تبدیلیاں ہوگئی ہیں، جن میں سے کچھ ضروری ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ترجمے کی طباعت فروری میں شروع ہو جائے، کتابت فی الحال شروع ہو سکتی ہے۔[52]

....

مَیں دو چار روز سے علیل ہوں اور مضمحل۔ وجہ شاید دردِ دنداں۔ فلاحِ دنداں، اخراجِ دنداں، مگر اخراج سے گھبراتا ہوں، اگرچہ اس کا تجربہ بھی پہلے کر چکا ہوں۔[53]

....

مجھ کو ایک مدت سے اس کا احساس ہے اور اب تو گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھ کو اپنے تمام لیڈروں سے مایوس کر دیا ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمانِ کار ہے، ان سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ ان کے تخیلات مریض اور تاریک ہیں۔ مَیں نے بہت سوچا ہے اور اکثر احباب نے مشورہ دیا ہے کہ آپ سلسلہ بیعت شروع کریں۔ کم از کم پنجاب کے ......کو اپنے تخیلات کی روشنی میں تربیت کیجیے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ امارت سے، جس کی بنا بیعت پر ہو، گھبراتا ہوں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہیں ہماری پوری جماعت ہی ایک فرقہ بن کر نہ رہ جائے۔ اس کے علاوہ اس لیڈر گردی میں جماعت کا تیار کرنا بھی مشکل

۵۰: بنام مہر علی شاہ، ۱۹۳۳/۸/۸ء، سوم، ۳۶۸-۳۶۹ ۵۱: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۳۳/۸/۲۲ء، سوم، ۳۷۳

۵۲: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۳/۹/۱۱ء، سوم، ۳۸۶ ۵۳: بنام راغب احسن، ۱۹۳۳/۸/۳۱ء، سوم، ۳۷۸

ہے اور دیگر حضرات اس کی راہ میں مخل ہوں گے۔ غرض کہ فی الحال کوئی راہ اس تاریکی میں نظر نہیں آتی اور ملت پست اور مضمحل ہو رہی ہے۔ خدا ے تعالیٰ فضل کرے، کوئی مناسب فضا پیدا کرے اور کچھ نہیں تو میری پریشانی ہی رفع کر دے۔[54]

مسلمانوں کے ہاں کوئی جماعت ایسی نہیں کہ نومسلموں کے لیے کوئی انتظام معاش کر سکے۔ ابھی چند روز ہوئے، مجھے پنجاب کے ایک مقام سے خبر آئی کہ کئی ہزار مذہبی سکھ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ ان کے لیے زمین کا انتظام کر دیا جائے: علیٰ ھذا القیاس، تین چار معزز سکھ اور ہندو میرے پاس آئے کہ اگر ان کے لیے ملازمت کا انتظام ہو جائے تو وہ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ غرض یہ کہ بالعموم اس قسم کے حالات میں دُنیوی محرکات عمل کرتے ہیں۔ عام طور پر اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ تبدیلیِ مذہب سے کسی کا مقصود محض منفعت مادی ہے تو وہ اسے نہایت مکروہ جانتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ان کے سیاسی زوال کے اوقات میں ہوا ہے۔ حکومت کے عروج کے زمانے میں اسلام نہیں پھیلا، مگر اس بات کا کیا علاج کیا جائے کہ اس ملک میں مسلمان نہایت افلاس زدہ ہیں۔ خود موجودہ مسلمان قوموں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان کے لیے مشکل ہو رہا ہے، تاہم جوشِ تبلیغ کسی حد تک مسلمانوں میں موجود ہے۔ یہی حال مَیں نے یورپ میں دیکھا ہے۔ اسلام کے متعلق ان کی راز جوئی روز بروز ترقی کر رہی ہے، مگر مسلمانوں میں استطاعت اس قدر نہیں ہے کہ وہ یورپ میں کلچرل اور مذہبی مشن بھیج سکیں۔ جو مشن وہاں موجود ہیں، ان میں کوئی آدمی اس قابل نہیں کہ وہ یورپ کی موجودہ مشکلات کو سمجھ سکے اور ان مشکلات کی روشنی میں اسلام کی مذہبی اور کلچرل حیثیت ان کے سامنے پیش کر سکے۔[55]

اس وقت حکومت کی طرف سے ان [مظلوم کشمیریوں] پر متعدد مقدمات چل رہے ہیں، جن کے اخراجات کی وجہ سے فنڈ کی نہایت ضرورت ہے۔ یہ طباع اور ذہین قوم ایک

۵۴: بنام راغب احسن، ۱۹۳۳/۸/۳۱ء، سوم، ۳۷۸   ۵۵: بنام شیخ اعجاز احمد، ۱۹۳۳/۹/۱۳ء، سوم، ۳۸۸-۳۸۹

مدت سے استبداد و ظلم کا شکار ہے۔ اس وقت مسلمانانِ ہند کا فرض ہے کہ ان کی موجودہ مشکلات میں ان کی مدد کی جائے۔[۵۶]

مَیں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ کانفرنس کی صدارت سے مجھے سبک دوشی ہوئی۔ اس کے اندرونی حالات افسوس ناک ہیں اور مجھے ان کا پہلے علم ہوتا تو مَیں اس کی صدارت قبول نہ کرتا۔ بہرحال، خدا کا شکر ہے کہ زمانۂ صدارت ختم ہوا۔ جمعیت العلما کا بھی حال ایسا ہی ہے۔ انھوں نے مجھ سے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے کہا، لیکن مَیں نے انکار کر دیا، اصرار پر بھی انکار ہی رہا۔ رہا علما کے اختلاف کی وجہ سے محکمہ قضا اور علما کی اسمبلی کا خیال، مجھے اندیشہ ہے کہ محض خیال ہی رہے گا۔ ایک وقت تھا (سردا ایکٹ Sarda Act کے ایجی ٹیشن کے زمانے میں) کہ گورنمنٹ ہند خود اس تجویز کے لیے تیار تھی۔ مَیں نے مولوی کفایت اللہ صاحب کو لکھا بھی، مگر انھوں نے توجہ نہ فرمائی۔ جو کچھ میرے خیال میں ہے، وہ توفی الحال اسی قدر ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کے لیے علما کی ایک اسمبلی بنائی جائے، جس کا فرض یہ ہو کہ کوئی قانون، جس کا تعلق مسلمانوں کے پرسنل لا سے ہو، مرکزی اسمبلی میں وضع نہ کیا جائے، جب تک علما کی اسمبلی اس پر غور نہ کر لے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ بعض امورِ شرعیہ ایسے ہیں کہ ان کا فیصلہ صرف مسلمان قاضی ہی کر سکتا ہے، اس واسطے مسلمان سب جج خاص اس مطلب کے لیے مقرر کیے جائیں اور ہائی کورٹوں میں سابق کی طرح صدر الصدور ہوا کریں۔ میرے خیال میں موجودہ حالات میں صرف اس قدر ممکن ہے، اگر مسلمان جدوجہد کریں۔ سب سے بڑا ضروری امر یہ ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک اصلاحی ریاست پیدا کی جائے یا پاکستان اسکیم بروے کار آئے۔ ان سکیموں کے ہوتے ہوئے بھی کامل شرعی آزادی حاصل کرنے کے لیے مزید جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ بہت حد تک ان تمام باتوں کا دارومدار علما کے اتحاد پہ ہے، مگر ان کا اختلاف عامۃ المسلمین سے بھی زیادہ ہے اور ان کا وجود اس وقت (خاص کر ان کا، جو پالیٹیشن ہو گئے ہیں) منصب

۵۶: بنام نواب یار جنگ، ۱۴/۹/۱۹۳۳ء، سوم، ۳۸۹

پرست مسلمانوں سے زیادہ مضر ہے۔ بہرحال، مَیں نے شفیع داؤدی اور سید ذاکر علی صاحب کو لکھا ہے کہ وہ علما کی ایک عالمگیر کانفرنس کے لیے کوشش کریں، ابھی وقت ہے۔ اس کانفرنس کا کام ہوگا کہ اُوروں کے مشورے سے ایک خاص سکیم تیار کرے۔ ابھی تک خاص سکیم کسی کے ذہن میں نہیں ہے۔ اکثر علما کو بھی معلوم نہیں، کیونکہ یہ کام ہر عالم کا نہیں ہے۔ مَیں نے کوئی میمورنڈم نہیں لکھا، ہاں جس امر میں مشورہ طلب کیا گیا، اس میں مَیں نے مشورہ ضرور دیا۔[۵۷]

مسلمانوں کے انتشار اور ان کے معززین کی خودغرضیوں کا مظاہرہ بہت دل شکن ہے اور مَیں نے تو اَب قصد مصمم کرلیا ہے کہ اپنے گذشتہ دستورالعمل پر پھر قائم ہو جاؤں اور اپنے مخصوص طریقِ کار پر خدمت مسلمانوں کی کرتا رہوں، جس کو چھوڑ کر مَیں نے عملی سیاست کا کام اختیار کیا تھا۔[۵۸]

[مسلمانانِ ہند] اپنے آپ کو من جملہ دیگر ہندوستانی اقوام کے ایک علیحدہ قوم خیال کرتے ہیں اور ایسا رہنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ اپنے آپ کو علیحدہ معاشرتی جماعت کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ایک علیحدہ اقلیت کی حیثیت سے اپنے حقوق کی حفاظت چاہتے ہیں۔ جو مسلمان قوم پرست کہلاتے ہیں، انھوں نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ مسلمانوں کو اپنی علیحدہ تمدنی حیثیت چھوڑ دینا چاہیے اور اپنی قسمت کو ایسی طاقتوں کے رحم پر چھوڑ دینا چاہیے، جو ان کی علیحدہ ہستی مٹادیں۔[۵۹]

پنجاب میں اکثر اوقات لوگ مجھ سے پوچھے بغیر اپنے جلسوں میں میری آمد یا شمولیت کا اعلان کر دیتے ہیں، جن کا مقصد محض لوگوں کو جلسوں میں کھینچنا ہوتا ہے۔ اگر تردید کر دی تو جلسے والے ناراض ہوتے ہیں، نہ تردید کروں تو خود وعدہ شکنی کا ملزم سمجھا جاتا ہوں، بغیر اس کے کہ مَیں نے کبھی کوئی وعدہ کیا ہو۔ غنیمت ہے کہ اِدھر کے لوگوں کو اب اس کا علم ہوگیا ہے کہ لوگ بغیر پوچھے میرا نام شائع کر دیتے ہیں۔[۶۰] گذشتہ پانچ چار سال کے

۵۷: بنام راغب احسن، ۱۹۳۳/۹/۱۵ء، سوم، ۳۹۱-۳۹۲ ۵۸: بنام راغب احسن، ۱۹۳۳/۹/۱۷ء، سوم، ۳۹۳

۵۹: گفتارِ اقبال، ۱۷۸-۱۷۹ ۶۰: بنام راغب احسن، ۱۹۳۳/۹/۱۷ء، سوم، ۳۹۴

تجربے نے مجھے بہت دردمند کر دیا ہے، اس لیے جلسوں میں میرے واسطے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ مَیں کہیں نہیں جا رہا، نہ پٹنہ، نہ کانپور۔[۶۱]

کانفرنس کا اجلاس پٹنہ ملتوی ہو گیا ہے۔ میرا کوئی ارادہ اجلاسِ مذکور کے یا یوتھ لیگ کے اجلاس کے لیے پٹنہ جانے کا نہ تھا۔ علیٰ ھٰذا القیاس، کوئی پیغام بھیجنے کا قصد بھی نہ تھا۔ مَیں جلد ہر چیز سے علیحدہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ کانفرنس کی صدارت تو اَب ختم ہے، ممکن ہے، قواعد کی رُو سے مجھے سالانہ جلسے تک اَور یہ کام نبھانا پڑے۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت ابھی میرے ذِمے ہے۔ جب یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو اس سے بھی علیحدہ ہو جانے کا قصد رکھتا ہوں۔[۶۲]

....

قادیانی ہیڈکوارٹرز کی طرف سے ابھی تک ایسا واضح اعلان جاری نہیں ہوا کہ اگر قادیانی حضرات مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں منقسم نہیں ہوں گی۔ دوسری طرف واقعاتی طور پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ جسے قادیانی پریس 'تحریک کشمیر' کے نام سے پکارتا ہے اور جس میں بقول قادیانی اخبار الفضل، مسلمانوں کو محض اخلاقی طور پر شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے، ایک ایسی تنظیم ہے، جس کے مقاصد اور محرکات آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں۔[۶۳]

....

کلیرینڈن پریس نے [خطبات کی] طباعت کا کام بڑی تیزی سے کیا اور اَب یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ مسٹر ملفورڈ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ جنوری ۱۹۳۴ء میں اس کتاب کے تیار ہو جانے کی توقع ہے۔[۶۴]

....

شاہ افغانستان نے مجھے کابل مدعو کیا ہے کہ وزیرِ تعلیم کو کابل میں ایک یونیورسٹی کے

۶۱: بنام دریابادی، ۱۹۳۳/۹/۲۴ء، سوم، ۳۹۷

۶۲: بنام راغب احسن، ۱۹۳۳/۹/۲۸ء، سوم، ۳۹۸

۶۳: Speeches, p-281 (ترجمہ جاوید اقبال)

۶۴: بنام تھامپسن، ۱۹۳۳/۱۰/۱۰ء، سوم، ۴۰۸-۴۰۹

قیام کی تجویز کے متعلق مشورہ دوں۔ مَیں اس مہینے میں کابل جاؤں گا اور نومبر کے دوسرے ہفتے میں واپس آؤں گا۔[۶۵] ہم، یعنی سید راس مسعود اور مَیں ۲۰ر کی صبح کو لاہور سے روانہ ہوں گے، رات پشاور میں قیام ہوگا اور وہاں سے ۲۱ر کی صبح کابل روانہ ہوں گے۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔[۶۶]

تعلیم یافتہ افغانستان ہندوستان کا بہترین دوست ہو سکتا ہے۔ کابل میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کی مغربی سرحد پر اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں منتقل کرنے کی اسکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیان علاقے میں آباد ہشیار افغان قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی۔ شاہِ افغانستان نے ہمیں اس لیے دعوت دی ہے کہ ہم وہاں وزیرِ تعلیم کو کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیں۔ کابل میں شائع ہونے والے مختلف رسالوں سے پتا چلتا ہے کہ افغانوں کی نئی نسل نئے علوم کی تحصیل اور انھیں اپنے دین و تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کی بے حد خواہش مند ہے اور ہندوستانیوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ افغانوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربے کی روشنی میں ہم انھیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورے دے سکیں گے۔ میرے ذاتی خیال میں خالص سیکولر تعلیم سے خصوصاً مسلم ممالک میں اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ بہرحال، کسی نظامِ تعلیم کو قطعی نہیں کہا جا سکتا، ہر ملک کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں اور ان ضروریات کی روشنی ہی میں اس کے نظامِ تعلیم کا تعین کیا جا سکتا ہے۔[۶۷]

مَیں نے اپنی عمر کسی شاہِ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزار دی ہے۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیے ہیں تو کیا [نادر خاں] مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے؟ آج مَیں [اس کی] اقتدا میں نماز پڑھوں گا،

۶۵: بنام تھامپسن، ۱۰/۱۰/۱۹۳۳ء، سوم، ۴۰۹
۶۶: بنام سلیمان ندوی، ۱۸/۱۰/۱۹۳۳ء، سوم، ۴۱۶
۶۷: *Speeches*, p-284-285 (ترجمہ جاوید اقبال)

امامت [اسی] کو کرنی ہوگی۔[68]

حضورِ حق سے چلا لے کے لُولوے لالا
وہ ابر، جس سے رگِ گُل ہے مثلِ تارِ نفس
بہشت راہ میں دیکھا تو ہو گیا بے تاب
عجب مقام ہے، جی چاہتا ہے جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے ترا
ہرات و کابل و غزنی کا سبزۂ نورس
سرشکِ دیدۂ نادر بہ داغِ لالہ فشاں
چناں کہ آتشِ او را دگر فرو نہ نشاں![69]

یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمدورفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انھی جہازوں کے ذریعے سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا، لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی۔ اب آئندہ مشرق وسطیٰ (سنٹرل ایشیا) کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کی بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا۔ تجارتی قافلے اب موٹروں اور لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعے مشرق و مغرب میں آئیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا، اس لیے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا اور اُس وقت پہلے کی طرح پھر افغانستان کو دنیا کی شاہراہ بننے کا موقع ملے گا، اس لیے ابھی سے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔[70]

مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے، جو اس ملک کے گریبان کو اینگلو سیکسن اقوام کے قرضے

۶۸: اقبال کی کہانی، ۵۵
۶۹: کلیاتِ اقبال اردو، ۴۸۳
۷۰: بحوالہ زندہ رُود، ۵۷۸

سے نجات دِلا سکے یا کسی دوسرے دانتے کو پیدا کرے، جو نئی جنت پیش کرے یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے، جو ایک نئے برِ اعظم کا پتا لگائے۔ اگر مجھ سے دریافت کریں تو مَیں کہوں گا کہ افغانستان کو ایسے مرد کی ضرورت ہے، جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملی کی زندگی سے آشنا کرے۔[۷۱]

حکومت افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمہ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سرِ نَو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان والی سڑکوں کی مرمت کی جائے۔ نئی یونیورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے اور اس کے لیے پہلے ہی ایک خوب صورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے میڈیکل شعبہ قائم کیا گیا اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہوگئی ہے۔ دوسرا شعبہ، جس کا قیام زیرِ غور ہے، وہ سول انجینئر نگ کا ہوگا۔ افغانستان آج ایک متحد ملک ہے، جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں اور حکام کافی سوچ بچار کے بعد نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔ افغانستان سے ہم اس یقین کے ساتھ واپس ہوئے ہیں کہ اگر موجودہ حکام کو دس سال تک اپنا کام جاری رکھنے کا موقع مل جائے تو بلا شک وشبہ افغانستان کا مستقبل روشن ہے۔[۷۲]

....

مَیں گذشتہ اتوار کابل سے براہِ غزنی وقندھار واپس آیا۔ سوموار سے بخار میں مبتلا ہوں۔ امیر نادر شاہ کی شہادت کی خبر ایک ناقابلِ برداشت صدمہ میرے لیے ہے اور یقیناً ساری دنیائے اسلام کے لیے۔ یہ بڑا دیندار اور خدا پرست بادشاہ تھا۔ کابل میں اس کے متعلق ایسی حکایات مشہور ہیں کہ ان کو سن کر صدیقؓ اور فاروقؓ یاد آتے ہیں۔ جمعے کی نماز مَیں نے ان کے ساتھ کابل کی جامع مسجد میں ادا کی، ان کے محل میں ایک روز عصر کی نماز ان کی امامت میں ادا کی۔ دَورانِ قیامِ افغانستان میں وہاں کے نوجوانوں میں اسلامی خیالات و افکار کی اچھی تخم ریزی ہوئی۔[۷۳]

۷۱: مضامینِ اقبال، ۲۰۳
۷۲: Speeches, p-287 (ترجمہ جاوید اقبال)
۷۳: بنام راغب احسن، ۱۲/۱۱/۱۹۳۳ء، سوم، ۴۲۱

میں نے [نئے افغان حکمران] شاہ ظاہر کو تار دے دیا تھا، جس کا جواب پرسوں موصول ہوا۔ صدرِ اعظم صاحب کا تار بھی آیا تھا۔[۷۴] شہزادہ ظاہر شاہ کو مَیں ذاتی طور پر جانتا ہوں، نوجوان ہیں اور اپنے والد بزرگوار کے خیالات اور طرزِ زندگی سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ شاید یونیورسٹی کے سلسلے میں مجھے پھر ایک بار جانا پڑے۔ میڈیکل فیکلٹی وہاں قائم ہے، اب دوسری فیکلٹی، جس کا آغاز کرنا ہے، سول انجینئرنگ کی ہوگی۔ گذشتہ چار سال میں جو ترقی ہوئی ہے، وہ ایک ایسا ہی معجزہ ہے، جیسے نادر شاہ کی فتح کابل۔[۷۵]

....

لارڈ لوتھین کا خط موصول ہوا، جس میں انھوں نے مجھے آکسفرڈ یونیورسٹی میں رھوڈز لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک بڑا اعزاز ہے، جس کے لیے مَیں یونیورسٹی اور ان تمام دوستوں کا ممنون ہوں، جنھوں نے اس دعوت نامے کو بھجوانے میں دلچسپی لی۔ مَیں لارڈ لوتھین کو جلد ہی اس پیش کش کو قبول کرنے کی اطلاع دوں گا، نیز چانسلر کو بھی شکریے کا خط لکھوں گا۔ جس موضوع پر مَیں لکھنا چاہتا ہوں، وہ 'مسلم فکر میں تصورِ مکان و زمان' ہے۔ یہ بڑا ادق مضمون ہے اور ابھی تک مسلم فلسفے کے کسی طالب علم نے اس پر کام نہیں کیا ہے۔ ان تین لیکچروں کے لکھنے کے لیے میرے پاس محض تین ماہ کا وقت ہے، اپریل کے آخر تک مجھے آکسفرڈ پہنچنا ہے کہ موسمِ گرما کی میقات اُس وقت شروع ہوتی ہے، جب مجھے وہاں قیام کرنا ہے۔ اَب مَیں نہیں سمجھتا کہ ایسے موضوع پر تین لیکچر لکھنا میرے لیے ممکن ہوگا، جس کے ہر عنوان پر تین ماہ کی قلیل مدت میں بہت زیادہ ریسرچ کرنا ہوگی۔[۷۶]

مَیں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔[۷۷]

....

۷۴: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۳۳/۱۱/۱۸ء، سوم، ۴۲۳ ۷۵: بنام تھامپسن، ۱۹۳۳/۱۱/۱۸ء، سوم، ۴۲۲

۷۶: بنام تھامپسن، ۱۹۳۳/۱۲/۵ء، سوم، ۴۲۹-۴۳۰ ۷۷: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۳۳/۱۲/۱۵ء، سوم، ۴۳۴

ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہوسکتا ہے، جب کہ اکثریتی فرقہ نہ تو آٹھ کروڑ انسانوں پر مشتمل اقلیتی فرقے کے حقوق کے لیے کم سے کم تحفظات دینے کو تیار ہے اور نہ اس معاملے میں تیسرے فریق کا فیصلہ قبول کرتا ہے، لیکن لگاتار ایک ایسے نیشنلزم کی رٹ لگائے جا رہا ہے، جو صرف اسی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت سے نپٹنے کے لیے تو صرف دو ہی رستے ہیں؛ یا تو ہندوستان میں اکثریتی فرقہ مشرق میں برطانوی استعمار کے ایجنٹ کی حیثیت سے دائمی طور پر کام انجام دیتا رہے یا ملک کو مذہبی، تاریخی اور تمدنی وابستگیوں کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جائے، تاکہ جدید شکل میں فرقہ وارانہ یا انتخاب کے مسئلے کا خاتمہ ہوسکے۔[۷۸]

گاندھی سیاسیات سے کنارہ کش ہوگئے ہیں اور اب بقولِ خود 'ہریجن سدھار' میں مصروف ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو اَب کشتی کے ناخدا ہیں۔ اغلب ہے کہ ہندوستان کی سیاست اپنا رُخ بدل لے اور شاید کمیونزم کے راستے پر چل پڑے۔[۷۹]

۷۸: Speeches, p-290 (ترجمہ جاوید اقبال)
۷۹: بنام فارقو ہرسن، ۱۹۳۳/۱۲/۲۵ء، سوم، ۴۴۳

۱۹۳۴ء

جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا۔ سویاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ بہدانہ پینے پر زکام بند ہوا تو گلا بیٹھ گیا۔[۱]

....

ادب ہندوستان میں نہ اِس وقت کوئی پیشہ ہے اور نہ کبھی پیشہ رہا ہے۔ کسی حد تک مصوری اور موسیقی تو پیشے ہیں، لیکن ادب بہر حال کسی کا ذریعہ معاش نہیں۔ یہ بات مجھے ذاتی تجربے سے معلوم ہے۔ ادب کے نام پر تھوڑا بہت مَیں نے بھی لکھا ہے، لیکن روزی مجھے وکالت سے کمانی پڑتی ہے۔ اگرچہ میرے مخالفین اور مفاد پرست حلقوں نے ہمیشہ میرے خلاف ایک پروپیگنڈا جاری رکھا ہے اور طرح طرح کے حربوں سے حکام کو بھڑکانے کی کوشش کی ہے، تاکہ میری پیشہ ورانہ زندگی برباد ہو جائے۔ یہ کوششیں اَب تک کامیاب رہی ہیں۔[۲]

مَیں نے لارڈ لوتھین کو تار دے دیا ہے کہ اِس سال میرا انگلستان آنا ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرا منتخب کردہ موضوع ...... [مسلم فکر میں تصورِ مکان و زمان] ...... بہت زیادہ عالمانہ ہے۔ اب مَیں کوئی اَور موضوع منتخب کروں گا۔[۳] امید ہے، آئندہ سال (۱۹۳۵ء) اپریل یا مئی میں دے سکوں گا۔ اپریل ۱۹۳۵ء تک ہندوستان سے روانگی کا کوئی ارادہ نہیں۔[۴]

میرے لیے یہ بڑا اعزاز ہوگا، اگر ...... [تھامپسن] Observer کے لیے میرے چھ خطبات پر تبصرہ لکھیں۔[۵]

۱: بنام الیاس برنی، ۱۹۳۶/۶/۱۳ء، چہارم، ۳۲۲
۲: بنام روتھین، ۱۹۳۴/۱/۲۹ء، سوم، ۴۵۸
۳: بنام تھامپسن، ۱۹۳۴/۲/۵ء، سوم، ۴۶۴
۴: بنام محمد اکرام، ۱۹۳۴/۲/۱۸ء، سوم، ۴۶۷
۵: بنام تھامپسن، ۱۹۳۴/۲/۵ء، سوم، ۴۶۳-۴۶۴

میری طبیعت کئی دِنوں سے علیل ہے، اس لیے دہلی ڈاکٹر وہبی کے لیکچر کی صدارت کے لیے نہیں جا سکوں گا[6]۔ ڈاکٹر بہجت وہبی صاحب سے نہ مل سکنے کا بہت افسوس ہے۔ انفلوانزا ہو گیا تھا، اب صرف گلے کی شکایت باقی ہے، جو ابھی تک صاف نہیں ہوا[7]

....

کشمیر سے نہایت خوفناک اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ بلا امتیاز بیدزنی کی جا رہی ہے اور گولی چلائی جاتی ہے۔[8]

مسلم کانفرنس کی حالت، میرے خیال میں، مخدوش ہے۔ مَیں شاید وائس پریزیڈنٹ سے استعفا دے دوں گا[9]

یہ ایک سنجیدہ غلطی ہے [کہ تھامپسن] مجھے 'نظریہ پاکستان' کا حامی قرار دیتے ہیں، مگر اب پاکستان میرا منصوبہ نہیں ہے۔ مَیں نے اپنے خطبہ صدارت میں جو تجویز پیش کی تھی، وہ صرف ایک مسلم صوبے کی تشکیل ہے، یعنی ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک ایسا صوبہ، جس میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہو۔ یہ نیا صوبہ میرے منصوبے کے مطابق مجوزہ ہندوستانی وفاق (فیڈریشن) کا ایک حصہ ہوگا، جب کہ نظریہ پاکستان میں مسلمانوں کے ایک جداگانہ وفاق کی تجویز رکھی گئی ہے، جو براہِ راست انگلستان سے مربوط ایک علیحدہ ریاست ہو۔ یہ منصوبہ کیمبرج میں پیدا ہوا اور اس کے خالق یہ سمجھتے ہیں کہ گول میز [کانفرنس] میں شریک ہونے والے ہم مسلمانوں نے مسلم قوم کو ہندوؤں کی یا نام نہاد ہندوستانی قومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے[10]

....

میرا خیال ہے، ایک ادارہ قائم کیا جائے، جس کا مقصد مفید کتابوں کی اشاعت ہو[11]، خواہ شراکت کے اصول پر، خواہ کمپنی کی صورت میں[12]...... [راغب احسن] اور [سید نذیر]

۶: بنام نذیر نیازی، ۱۲/۲/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۶۸

۷: بنام نذیر نیازی، ۲۷/۲/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۷۰

۸: وائسرائے، ۲۲/۲/۱۹۳۴ء (گفتارِ اقبال، ۱۸۲)

۹: بنام راغب احسن، ۲۵/۲/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۷۰

۱۰: بنام تھامپسن، ۴/۳/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۷۲

۱۱: بنام نذیر نیازی، ۲۷/۲/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۷۰

۱۲: بنام یامین ہاشمی، ۹/۳/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۷۶

نیازی صاحب دونوں شریک یا ملازمت کی حیثیت سے تصنیف و تالیف کا کام کریں۔ مَیں خود بھی اس میں شریک ہوں گا، مگر اس کے لیے سرمایے کی ضرورت ہے۔ بہر حال، مَیں اس پر غور کر رہا ہوں کہ تجویز کسی طرح عملی صورت اختیار کر لے۔[۱۳]

....

گلے کی شکایت تو ابھی باقی ہے، مگر اب رفتہ رفتہ صحت کی طرف ترقی ہے اور یہ ترقی نمایاں طور پر کل سے ہی شروع ہے۔ علاج ڈاکٹر یار محمد خاں صاحب کا ہے۔ مَیں نے سنا ہے کہ ہندوستانی دواخانہ دہلی میں کوئی شربت ہے، جو گلے کی سب بیماریوں کے لیے بہت مفید ہے۔[۱۴]

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گلے کے نیچے جو آلۂ صوت (larynx) ہے، اس کا تار ڈھیلا ہو گیا ہے، اس وجہ سے آواز بیٹھ گئی ہے۔ چار ماہ تک علاج ہوا، مگر کچھ خاص فائدہ اِس سے نہیں ہوا، جسم کی کمزوری بڑھ رہی ہے۔ دردِ گردہ کا پھر دَورہ نہیں ہوا، جب سے ان کا علاج کیا ہے۔ آج چھ سال ہو گئے، اس درد نے پھر تکلیف نہیں دی؛ البتہ نقرس کی شکایت کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔ بعض ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ نقرس کا اثر بھی گلے پر پڑ سکتا ہے۔[۱۵]

ڈاکٹروں نے مزید معائنہ کیا ہے اور چھاتی وغیرہ کے ایکس ریز فوٹو لیے گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ دل کی اوپر کی طرف ایک نئی growth ہو رہی ہے، جس کے دباؤ سے ووکل کارڈ vocal chord متاثر ہوتی ہے۔ اُن کے نزدیک اس بیماری کا علاج الیکٹرک ہے اور بہترین الیکٹرک علاج یورپ میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس گروتھ کا اثر پھیپھڑوں پر نہ پڑے۔ اس وقت تک پھیپھڑے اور دل اور دیگر اعضائے اندرونی بالکل صحیح اور تندرست حالت میں ہیں۔ ان امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، ظاہر ہے کہ معاملہ پیچیدہ ہے، لیکن مَیں اس سے پہلے مغربی اطبا کا امتحان کر چکا ہوں۔ حکیم صاحب سے مشورہ کیے بغیر یورپ نہ جاؤں گا اور یورپ کے علاج پر روپیہ خرچ بھی نہیں کر سکتا۔ پہلے حکیم صاحب کی عنایت سے ہی مَیں اچھا ہو گیا تھا، اب پھر میرا بھروسا انھی پر ہے۔[۱۶]

۱۳: بنام راغب احسن، ۲۱/۳/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۷۹-۴۸۰
۱۴: بنام نذیر نیازی، ۲۲/۵/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۸۶
۱۵: بنام نذیر نیازی، ۲۹/۵/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۸۹
۱۶: بنام نذیر نیازی، ۲/۶/۱۹۳۴ء، سوم، ۴۹۱

دو دفعہ ڈاکٹروں نے خون کا معائنہ کیا ہے، پہلی دفعہ خون باسلیق سے لیا گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خون میں زہریلے جراثیم ہیں اور دوسری دفعہ پھر انگلی سے خون لیا گیا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خون کی حالت بالکل نارمل ہے۔ ایکس ریز سے جو تصویر لی گئی ہے، تصویر کی رُو سے دل کی اوپر کی طرف ایک گروتھ دِکھائی دیتا ہے، جس نے اس نرو nerve پر دباؤ ڈالا ہے، جو دل کی طرف اور حلق کی طرف جاتی ہے۔ اس دباؤ کی وجہ سے ووکل کارڈ کے فنکشن میں خلل آ گیا ہے۔ آج شام کو معلوم ہوگا کہ علاج کُلی طور پر الیکٹرک ہوگا یا انجکشن یا دونوں سے[17]

میرا معمولی کھانا...... صبح مکھن توس اور ایک انڈا نیم برشت یا نیم بائیل مع چاء؛ بارہ بجے دوپہر کھانا، گوشت سبزی اور کبھی کبھی پلاؤ، کبھی اس کے بعد آم بھی کھاتا ہوں؛ چار بجے کے قریب بادام مقشر کی کھیر؛ شام کو صرف نمکین چائے یا کھیر دلیا مع دودھ۔ شربتِ صدر مَیں نے ابھی تک استعمال نہیں کیا[18]

بلغم زیادہ تر کچی نکلتی ہے، کبھی کبھی منجمد آتی ہے، مگر کم۔ شام کے قریب بالعموم بہت بھاری ہوجاتی ہے۔ بات آہستہ کرسکتا ہوں، اونچی آواز بالکل نہیں نکل سکتی؛ نہ صبح، نہ شام۔ کہتے ہیں کہ ایکس ریز ایکسپوژر سے یہ گروتھ یا تو تحلیل ہوجائے گی یا اس کا نشوونما رُک جائے گا[19]

میرے تمام احباب کو تشویش ہے اور میرے معالجوں کو بھی، مگر مَیں خود حکیم صاحب قبلہ پر کامل اعتماد رکھتا ہوں اور موت و حیات کو اللہ کے ہاتھ میں سمجھتا ہوں۔ کرنل ڈک صاحب کے نزدیک دِل کے اوپر کی طرف ایک نئی گروتھ پیدا ہوگئی ہے، جس نے نرو پر دباؤ ڈال رکھا ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے آلۂ صوت کا بایاں تار بیکار ہوگیا ہے۔ اس کا علاج، ان کے نزدیک، یا تو ریڈیم سے ہوگا یا ایکس ریز سے اور یہ دونوں علاج یورپ میں ہی بہتر ہو سکتے ہیں۔ بہرحال، ڈک صاحب اور دوسرے ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ یا تو فوراً ویانا (آسٹریا) جانا چاہیے، تاکہ علاجِ مذکور سے اس گروتھ کا مزید نشوونما رُک جائے یا کل ایکس ریز یا

۱۷: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۶/۳ء، سوم، ۴۹۵
۱۸: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۶/۵ء، سوم، ۴۹۷
۱۹: ایضاً، ۴۹۷-۵۰۰

ریڈیم سے تحلیل ہو جائے۔ ان کے نزدیک، اگر اس گروتھ کی طرف توجہ نہ کی گئی تو زندگی خطرے میں ہے، کیونکہ ممکن ہے، گروتھ بڑھ کر پھیپھڑوں پر بھی اپنا دباؤ ڈالے یا کسی اور طرح ان کے عمل پر مؤثر ہو۔ گروتھ ایکس ریز کی تصویر لینے سے معلوم ہوئی، اس سے پہلے معلوم نہ تھی اور ڈاکٹر صاحبان و وکل کارڈ کے ضعف کے اصل سبب کے متعلق اندھیرے میں تھے؛ ممکن ہے، اب تک وہ اندھیرے ہی میں ہوں اور اس گروتھ کا بھی اس سے کوئی تعلق نہ ہو؛ لیکن چونکہ تصویر سے ایسا ہی معلوم ہوا ہے اور یہ لوگ تصویر پر ایمان رکھتے ہیں، اس واسطے ان کے نزدیک اصلی علت بیماری کی سی ہے۔ کل شام ڈاکٹر [ڈک] صاحب نے کہا کہ اگر حکیم [نابینا] صاحب کامیاب ہو گئے تو یہ ان کا دوسرا معجزہ ہوگا۔[20]

آج معلوم ہوا کہ بعد بحث مباحثہ خود ان [ڈاکٹروں] میں بھی اختلافِ رائے ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ خود حاضر ہو کر حکیم صاحب کی خدمت میں جملہ حالات عرض کر دوں، اس واسطے دو چار روز حکیم صاحب قبلہ کی دوا استعمال کر کے خود حاضر ہوں گا۔ میرا ارادہ صرف ایک روز آنے کا ہے۔ صبح وہاں پہنچوں گا اور اسی وقت حکیم صاحب سے مل لوں گا، شام کی گاڑی یا اس سے پہلے کسی گاڑی میں واپس آ جاؤں گا۔ وہاں قیام کا ارادہ نہیں ہے، ہاں اگر حکیم صاحب فرمائیں کہ علاج کے لیے قیام ضروری ہے تو قیام کا بندوبست کر لوں گا۔ مجھے صرف تشویش اس گروتھ کی وجہ سے ہے۔ باقی میری تمام صحت اِس وقت خدا کے فضل سے اچھی ہے، صرف آواز اونچی نہیں نکل سکتی۔ اگر دہلی میں قیام ضروری نہ ہوا تو اسٹیشن پر ہی چند گھنٹے قیام کروں گا۔[21]

....

آج دوائی کا چوتھا روز ہے۔ آواز میں کچھ فرق ضرور ہے، مگر گلا مقابلتاً خشک ہے اور بلغم کسی قدر دِقت سے نکلتی ہے۔ منجمد بلغم کم نکلتی ہے، کچی بلغم زیادہ نکلتی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ شاید اندر منجمد بلغم ہے۔ اگر وہ آسانی سے نکل جائے تو آواز میں نمایاں فرق آئے گا۔ اس

۲۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۶/۵ء، سوم، ۵۰۰-۵۰۲ ۲۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۶/۸ء، سوم، ۵۰۴

کے علاوہ ریح کا اخراج تو ہوتا ہے، مگر کسی قدر قبض ہے، پاخانہ کھل کر نہیں آتا۔[۲۲]

بلغم کچی نکلتی ہے، اب تو ناک کی راہ سے بھی کچھ کچھ نکلتی ہے۔ مجھے ایسے احساس ہے کہ اندر بلغم ہے، اگر آسانی کے ساتھ اندر منجمد ہو کر نکل جائے تو یقیناً فائدہ ہوگا۔ ان دِنوں میں آواز میں فرق ضرور آیا ہے، مگر ایسا نہیں، جس کو سب لوگ نوٹ کر سکیں۔ گلے کے اندر خارش سی، خصوصاً دائیں طرف معلوم ہوتی ہے، اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا۔ کہتے ہیں، خارش صحت کی علامت ہے، واللہ اعلم۔ قبض کی کسی قدر شکایت ہے۔ گلابی رنگ کی گولی حکیم صاحب نے ریح کے لیے دی تھی، جو کھانے کے بعد کھائی جاتی ہے۔ اُس وقت مَیں نے شکایت کی تھی، ریح جمع ہو کر تکلیف دیتی ہے۔ دو چار روز کے استعمال سے ریح کی شکایت، جو اُس وقت تھی، دُور ہو گئی تھی، اب وہ شکایت باقی نہیں۔[۲۳]

[حکیم صاحب کے مشورے پر بطور دوا استعمال کرنے کے لیے] سمرنا کی انجیر بہت تلاش سے ایک پنساری کی دُکان سے ملی ہے، جو دیکھنے میں نہایت مکروہ ہے اور پچھلے سال کی ہے۔[۲۴]

عجب معاملہ ہے، جس سے انسانی ضمیر کے اندر جو کچھ گزر رہا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ لوگ میری بیماری میں محض اس واسطے دلچسپی لے رہے ہیں کہ دیکھیں ڈاکٹروں کو کب شکست ہوتی ہے۔[۲۵]

[حکیم نابینا] انصار ہیں، مَیں مہاجرین سے ہوں، کیونکہ مَیں نے زمانۂ حال سے خیر القرون کی طرف ہجرت کی ہے۔ روحانی نہیں تو دِماغی اعتبار سے ہی سہی، اس واسطے میرا ان پر حق ہے اور مَیں ان سے اُسی سلوک کا متوقع ہوں، جو انصار نے مہاجرین سے کیا تھا۔[۲۶]

میری مجموعی صحت بہت اچھی ہے، دِن میں تین چار دفعہ چھینک بھی آتی ہے، بعض دفعہ ناک سے بھی بلغم نکلتی ہے، گلے میں خارش بھی ہے، نیند بھی رات کو خوب آتی ہے، البتہ آواز کے کھلنے کی رفتار کسی قدر سست ہے۔ آج چلغوزہ کھایا ہے، تازہ انجیر کی تلاش جاری

۲۲: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۶/۱۳ء، سوم، ۵۰۸
۲۳: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۶/۱۶ء، سوم، ۵۱۰
۲۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۶/۱۷ء، سوم، ۵۱۱
۲۵: ایضاً
۲۶: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۶/۲۰ء، سوم، ۵۱۴

ہے، سردہ کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا، لیکن تُرشی کو ترس گیا ہوں۔ لیموں کو تو ہاتھ لگاتا نہیں، کیونکہ حکیم صاحب نے منع فرما دیا ہے۔ دہی کی اجازت حکیم صاحب نے دی تھی، لیکن اس میں بھی تُرشی ہے، اس واسطے ڈرتا ہوں۔ ایک روز دہی کا آرائتہ کھایا تھا، مگر وہ دہی اس قدر میٹھا تھا کہ آرائتہ میں کوئی لطف نہ تھا۔ بٹیر بھی مارکیٹ میں نہیں ملتے، چوزے کا گوشت کھایا ہے، مگر گرمی اس قدر ہے کہ بھوک نہیں لگتی۔[۲۷]

حکیم صاحب فرماتے تھے کہ اوّل خوراک کا ۱/۴ حصہ دیا جاتا ہے۔ مَیں خود اسے محسوس کرتا تھا، اسی واسطے مَیں نے لکھا تھا کہ دوائی کی طاقت ذرا زیادہ کر دی جائے تو شاید فائدہ زیادہ ہو، مگر وہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کا ارشاد مقدم ہے، جیسا کہ انھوں نے فرمایا تھا، دوائی کا استعمال تو دیر تک رہے گا، آواز جلد بہتر ہو جائے گی۔ مَیں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آواز میں جلد تبدیلی ہو، تاکہ آئندہ پروگرام وضع کر سکوں۔ کل جنوبی افریقہ سے دعوت آئی ہے اور وہاں کے مسلمان مُصر ہیں کہ یہاں کا دَورہ ضروری ہے۔ گذشتہ ہفتے ایک خط جرمنی سے آیا، جس سے معلوم ہوا ہے کہ ترکی کی طرف سے بھی تم کو دعوت دی جانے والی ہے۔ بہرحال میری خواہش ہے کہ اس جہان سے رخصت ہونے سے پہلے:

سرودے نالۂ آہے فغانے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ برآور ہرچہ اندر سینہ داری[۲۸]

فالودہ پینے کو کبھی کبھی دل چاہتا ہے، سردہ ابھی لاہور میں نہیں آیا، کابل میں سردے کا موسم تو اگست میں شروع ہوگا؛ البتہ کوئٹہ (مستونگ) کا سردہ شاید مل جائے، مَیں نے وہاں لکھوایا ہے۔ انجیر تازہ تلاش کراؤں گا۔[۲۹]

بالعموم طلوع و غروبِ آفتاب کے وقت آواز کی حالت اچھی نہیں معلوم ہوتی، باقی اوقات میں اچھی خاصی معلوم ہوتی ہے۔ خون کے زہریلے مادّوں کا ذکر مَیں نے حکیم صاحب کی خدمت میں خاص طور پر کیا تھا اور ان سے استدعا کی تھی کہ وہ دوا تجویز کرنے

۲۷: بنام نذیر نیازی، ۲۰/۶/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۱۴ ‏ ‏ ‏ ۲۸: بنام نذیر نیازی، ۲۰/۶/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۱۶

۲۹: ایضاً

میں اس امر کا خاص خیال رکھیں۔ اس مواد کی تحلیل کے لیے، جس کو ڈاکٹر new growth بتاتے ہیں، حکیم صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ تحلیل ہو جائے گا۔[30]

دوائی تو دہلی ہی میں شروع کر دی تھی، کل پورے پندرہ سولہ روز ہو جائیں گے۔ پچھلے ہفتے میں جو کسی قدر ترقی آواز میں ہوئی تھی، دوسرے ہفتے میں اس پر کوئی اضافہ معلوم نہیں ہوا۔ حالت وہی ہے، جو پچھلے ہفتے کے آخر میں تھی۔ بالعموم دِن اور رات میں آواز کی حالت بہتر ہوتی ہے، طلوعِ آفتاب وغروبِ آفتاب کے وقت حالت کچھ بہتر نہیں ہوتی؛ معلوم نہیں، اس کا کیا سبب ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ گلے کے دونوں اطراف جونک لگوانی چاہیے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ دہی اور لسی کا اچھا اثر نہیں ہوتا، علیٰ ھذا القیاس فالودہ پی کے بھی مَیں نے دیکھا ہے، اس کا اثر بھی اچھا نہیں ہوا۔[31]

دوسرے ہفتے کی دوا نے پہلے ہفتے سے ترقی میں، جو آواز میں ہوئی تھی، کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ ترقی معکوس میں ہوئی۔ اُن کے وجوہ تین ہو سکتے ہیں: مَیں نے دہی کھایا اور لسی بھی پی، فالودہ پیا (برف ڈال کر)، دوا کی مقدار دگنی کر دی گئی ہے، شاید ڈوز [dose] کے بڑھ جانے کی وجہ سے آواز نے ترقی معکوس کی۔[32]

نئی دوا کل سے شروع کر دی ہے، امید ہے کہ فائدہ ہوگا۔ صحت مجموعی بہت اچھی ہے، بلکہ اس سے چار ماہ پیشتر جو حالت صحت کی تھی، وہ عود کر آئی ہے، البتہ آواز پر ابھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ مجھے کسی قدر قبض کی شکایت بھی رہتی ہے، مَیں سمجھتا ہوں کہ قبض کا اثر بھی آواز پر ہوتا ہے۔[33]

....

آج شام کی گاڑی میں سرہند شریف جا رہا ہوں۔ چند روز ہوئے، صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے پیغام دیا، 'ہم نے جو خواب تمھارے اور شکیب ارسلان کے متعلق دیکھا ہے، وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا

۳۰: بنام نذیر نیازی، ۲۲/۶/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۲۱-۵۲۳
۳۱: بنام نذیر نیازی، ۲۳/۶/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۲۳-۵۲۵
۳۲: بنام نذیر نیازی، ۲۴/۶/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۲۷
۳۳: بنام نذیر نیازی، ۲۹/۶/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۳۴-۵۳۵

فضل کرنے والا ہے۔ پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا، کون ہے۔ اس خواب کی بِنا پر وہاں کی حاضری ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جاوید جب پیدا ہوا تھا تو مَیں نے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ ذرا بڑا ہوگا تو اسے حضرت [محبوبِ الٰہیؒ] کے مزار لے جاؤں گا۔ وہ بھی ساتھ جائے گا، تا کہ یہ عہد پورا ہو جائے۔[34]

سرہند خوب جگہ ہے، مزار نے میرے دل پر بڑا اثر کیا ہے۔ بڑی پاکیزہ جگہ ہے۔ پانی اس کا سرد اور شیریں ہے۔ شہر کے کھنڈرات دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آ گیا، جس کی بِنا حضرت عمروؓ بن العاص نے رکھی تھی۔ اگر سرہند کی کھدائی ہو تو معلوم نہیں، اُس زمانے کی تہذیب وتمدن کے کیا کیا انکشافات ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانے میں بحال تھا اور موجودہ لاہور سے آبادی وسعت کے لحاظ سے دُگنا۔[35]

مَیں ہفتے کی شام کو سرہند سے واپس آ گیا تھا، نہایت عمدہ اور پُر فضا اور پاکیزہ جگہ ہے۔ اِن شاءاللہ پھر [دوبارہ] بھی جاؤں گا۔[36]

....

مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مَیں صوفی نہیں ہوں اور جدید ہندوستانی تصوف کا قائل نہیں ہوں اور مَیں اس کو ہندوستان میں اسلام کے اخلاقی زوال کے نمایاں اسباب میں شمار کرتا ہوں؛ لیکن میرے خیال میں مثنوی روم جدید دَور کے تشکیک اور دہریت کے زہر کے لیے ایک قسم کے تریاق کا اثر رکھتی ہے، اس باعث مَیں سمجھتا ہوں کہ اس تصنیف سے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو رُوشناس کرانا چاہیے؛ لیکن [مجھ جیسے] ایک مصروف شخص کے بس کی بات نہیں کہ چھبیس ہزار اشعار پر مشتمل کوئی کتاب پڑھ سکے۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس سے انتخاب کرنا ہوں گے اور جدید فکر اور اہم نظریات و عوامل کی روشنی میں حواشی کا اضافہ کرنا ہوگا۔ ہر عہد میں مثنوی کے انتخابات ہوتے رہے ہیں، لیکن ہم جدید زمانے والوں کے لیے بہت کم مفید یا بالکل غیر مفید ہیں۔ ہمیں اپنے لیے

۳۴: بنام نذیر نیازی، ۲۹/۶/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۳۵
۳۵: بنام نذیر نیازی، ۳/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۴۰
۳۶: بنام سید نذیر نیازی، ۲/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۳۸

انتخابات خود کرنا ہوں گے۔ کسی حد تک یہ کام قاضی تلمذ حسین ایم اے، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد نے کیا ہے اور حال ہی میں ایک کتاب المعروف مرآۃ المثنوی شائع کی ہے، البتہ یہ تصنیف صرف اُس شخص کے لیے مفید ہے، جو رومی سے، پہلے سے واقف ہو۔ ایک ایسا انتخاب مرتب کرنے کی میری دیرینہ خواہش رہی ہے، لیکن اس سال میری صحت بہت گر گئی ہے، جس کی وجہ سے اب مجھے اپنے متعدد منصوبوں سے دست کش ہونا پڑے گا۔[۳۷]

عام صحت خوب ترقی کر رہی ہے، مگر آواز میں ابھی کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا۔ نئی دوا کے استعمال سے بھی کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ حکیم صاحب کی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ سردوں کے متعلق خاص انتظام کیا ہے، مگر جولائی کے آخر میں آئیں گے، کابل سے آیا کریں گے۔ سفیر صاحب کابل نے ان کے آنے کا انتظام کر دیا ہے۔[۳۸]

آج [۵/جولائی کی] صبح دس بجے ایکس ریز کے لیے وقت مقرر تھا، مگر میو ہسپتال کے ڈاکٹر کرم کی دفعتہً تبدیلی ہو گئی ہے۔ جو اس کی جگہ مقرر ہو کر آئے ہیں، انھوں نے ابھی آلات کا معائنہ نہیں کیا؛ اس واسطے سوموار کے روز ایکس ریز فوٹو لیا جائے گا، مگر ڈاکٹر یار محمد خاں کل کہتے تھے کہ فریش گروتھ یا ٹیومر کی تھیوری غلط معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ آپ کی صحت و دیگر حالات سے مطابقت نہیں کھاتی۔ یہ ممکن ہے کہ شاہ رَگ اس مقام پر آ کر ذرا پھیل گئی ہو، جہاں وہ گروتھ نظر آتی ہے۔ اس دفعہ جو ایکس ریز ہو گا، اس سے یہ بات متحقق ہو جائے گی۔ اُن کے نزدیک اگر شاہ رَگ کا پھیلاؤ ہو تو پھر جیسا کہ اغلب ہے، کوئی دوا اس کو اپنی اصلی حالت پر نہیں لا سکتی، ہاں دوا اس کے مزید پھیلاؤ کو روک سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آواز بھی اصل نارمل حالت کی طرف عود نہیں کر سکتی، واللہ اعلم۔ فریش گروتھ یا ٹیومر کے لیے ریڈیم یا ڈیپ ایکس ریز کا علاج ضروری ہے، لیکن چونکہ غالباً فریش گروتھ نہیں ہے، صرف شاہ رَگ کا پھیلاؤ ہے، اس واسطے گروتھ وغیرہ کے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی ڈاکٹر اب یہ کہتے ہیں کہ اگر ٹیومر ہوتا تو عام صحت اس قدر جلد ترقی نہ کر سکتی، بلکہ

۳۷: بنام بی بی آمنہ، ۳/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۴۲۔ ۵۴۳　　۳۸: بنام نذیر نیازی، ۳/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۴۰

روز بروز بدتر ہوتی جاتی۔[۳۹]

نئی دوا، جسے پان میں رکھ کر چبانے کی ہدایت ہے اور جو آواز کے لیے مخصوص ہے، کچھ ایسی مفید ثابت نہیں ہوئی۔ آج اسے کھاتے ہوئے چار روز ہوئے ہیں، کوئی خاص اثر اس کا آواز پر نہیں ہوا۔ آواز کی حالت وہی ہے، جو اس دوا کے استعمال سے پہلے تھی۔ قبض کی شکایت ابھی رفع نہیں ہوئی۔[۴۰]

دوبارہ ایکس ریز سے سینہ دِکھا کے آیا ہوں۔ یہ بات اب یقین ہوگئی کہ ٹیومر یا گروتھ نہیں، صرف شاہ رَگ کا پھیلاؤ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ شاہ رَگ کا پھیلاؤ یا تو خون کے کمی مادّوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یا بعض پہلوانوں اور گویوں کو بھی ہو جاتی ہے نفس کے زیادہ استعمال کی وجہ سے۔ عام صحت تو بہت اچھی ہے، مگر آواز پر اب تک کسی دوا کا اثر نہیں ہوا۔ یہ آخری دوا، جو پان میں رکھ کر چبائی جاتی ہے، اس کا اثر بھی نہیں ہوا۔ آج اُسے کھاتے ہوئے پانچ روز ہوگئے ہیں؛ آواز جہاں تھی، وہیں ہے اور اب تک اس پر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔[۴۱]

ڈاکٹر کہتے ہیں، گو ٹیومر نہیں ہے، تاہم شاہ رَگ کا پھیلاؤ ہے اور یہ ایک قسم کی سویلنگ [swelling] ہے۔ ان کی رائے میں یہ مرض خطرناک نہیں ہے، لیکن آواز کا نارمل حالت کی طرف عود کر آنا، ان کے نزدیک، بہت مشتبہ ہے۔ ان کے علم میں، اب اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ آواز پر اکتفا کی جائے اور شاہ رَگ کے مزید پھیلاؤ کو دواؤں کے ذریعے روکنے کی کوشش کی جائے اور بس! جسٹس آغا حیدر صاحب مجھے بتاتے تھے کہ یہ بیماری، یعنی شاہ رَگ کا پھیلاؤ ان لوگوں کو بعض دفعہ ہو جاتی ہے، جو نفس سے زیادہ کام لینے والے ہوں، مثلاً پہلوان اور گویے۔ میری آواز میں آج تک کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ عام صحت بہت اچھی ہے، بلکہ کئی سال سے ایسی صحت نہ تھی۔ میرے لیے اب کسی ایسے نسخے کی ضرورت ہے، جس کا فوری اثر آواز پر ہو، تاکہ مجھے اطمینان ہو اور ڈاکٹروں کو بھی پوری شکست ہو،

۳۹: بنام نذیر نیازی، ۵/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۴۳-۵۴۴ ۴۰: بنام نذیر نیازی، ۱۰/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۴۹

۴۱: بنام نذیر نیازی، ۱۱/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۴۹-۵۵۱

کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ آواز کا نارمل ہو جانا مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔[۴۲]

دوا کا باقاعدہ استعمال ہو رہا ہے اور جیسا حکیم صاحب فرماتے جائیں گے، عمل ہوتا جائے گا، اس میں تساہل نہ ہوگا۔ صبح کو ناشتہ سات آٹھ کے درمیان کرتا ہوں، گیارہ بجے کھانا کھاتا ہوں، مگر تیتر کا ملنا اس موسم میں ناممکن ہے، سردا اگست میں شروع ہوگا، مَیں نے اس کا انتظام سفیر صاحب افغانستان کی معرفت کر لیا ہے۔ پستہ کی مٹھائی بھی وہیں سے آئے گی۔ باقی رہا پھیپھڑا، سو وہ مَیں کھا نہ سکوں گا، کیونکہ مجھے اس سے کراہت آتی ہے، بلکہ مَیں اسے پکا ہوا دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہواخوری کی کوشش کروں گا، مگر اس کی عادت پڑنا مشکل ہے، کیونکہ تمام عمر میں کبھی ایسا نہیں کیا۔ رات کو دلیا مع دودھ کھاتا ہوں، اگر ایسا نہ کروں تو قبض رفع نہیں ہوتی۔ نزلہ ایک مدت سے ہے، اس بیماری سے پہلے بھی میرا گلا اکثر خراب رہتا تھا اور اس میں خراش رہتی تھی۔ صحت بالکل اچھی ہے، اب صرف آواز کی وجہ سے بے اطمینانی ہے۔ تھوڑا سا فرق بھی ہو جائے تو سب کو اطمینان ہو جائے گا۔[۴۳]

جراحوں کا ایک پرانا خاندان لاہور میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس ایک لیپ ہے، جو اس مرض کے مریضوں کے گلے پر لگایا جاتا ہے۔ مَیں نے ان سب لیپ کے اجزا دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ چار قسم کے گوندوں سے بنا ہے، جن کے اثر سے بلغم جل کر کافور ہو جاتی ہے۔ جراح کا بھی یہی خیال ہے کہ آواز کی خرابی نزلے کی وجہ سے ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ پانچ روز تک متواتر لگانے سے آواز میں بے حد ترقی ہوگی، بلکہ ممکن ہے کہ بالکل اچھی ہو جائے اور پھر کسی دوا لگانے یا کھانے کی ضرورت نہ رہے۔ غرض کہ اس کو بہت دعویٰ اس پر ہے۔ شہر کے لوگ، جو ہمارے ہمدرد ہیں، مجبور کر رہے ہیں۔ مَیں نے سب کو یہی جواب دیا ہے کہ حکیم صاحب کے مشورے کے بغیر کچھ نہ ہوگا۔[۴۴]

دوائیاں تمام پہنچ گئی ہیں۔ مَیں نے ایک روز مسہل لے لیا تھا، اس واسطے اُس روز اور

۴۲: بنام نذیر نیازی، ۱۳/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۵۱-۵۵۳ ۴۳: بنام نذیر نیازی، ۱۶/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۵۳-۵۵۴

۴۴: بنام نذیر نیازی، ۱۶/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۵۸

اس کے دوسرے روز دوا نہیں کھائی۔ آج صبح سے پھر شروع کی ہے۔ میری صحت بہت اچھی ہوگئی ہے، صرف آواز کی کسر ہے۔ تازہ انجیر کا انتظام ہوگیا ہے، ہر روز ملتان سے آجاتی ہے اور انجیر بھی نہایت عمدہ، کابل اور قندھار کی انجیروں سے بھی بہتر۔ سردے کا انتظام بھی ہوگیا ہے، مگر وہ اگست میں کابل سے آنا شروع ہوگا اور ان شاءاللہ ہر ہفتے آیا کرے گا۔[۴۵]

اگر میری آواز اپنی اصلی حالت پر عود کر آئی تو مَیں اپنی اس بیماری کو خدا کی رحمت تصور کروں گا، کیونکہ اس بیماری نے حکیم صاحب سے وہ ادویہ استعمال کرنے کا موقع پیدا کیا، جنھوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا ہے۔ تمام عمر میں میری صحت ایسی اچھی نہ تھی، جیسی اب ہے۔ مجھ کو اب صرف آواز کی وجہ سے بے اطمینانی ہے اور بس![۴۶]

....

مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے سندھ کی علیحدگی کی حمایت میرا فرض تھا۔ ذاتی طور پر میرا ہمیشہ یہ یقین رہا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے تین صوبوں کا متحد ہونا انگلستان، ہندوستان اور اسلام کے لیے بے انتہا سودمند ہوگا۔[۴۷]

مَیں جمہوریت کا قائل نہیں، بہرحال جمہوریت کی جانب قدم بڑھایا جاچکا ہے، جو میری رائے میں مہلک ہے۔ اب ہمیں اپنے آپ کو معاشی بربادی، سیاسی انتشار اور ہندومت کے زوال کے لیے تیار کرلینا چاہیے، جو اس طویل و عریض غیر منظم اور ننگے بھوکے ملک میں جمہوری نظام کے قیام کے نتائج ہوں گے۔ کوئی قرطاسِ ابیض ہمیں ہندوستان میں ہوسِ اقتدار میں گرفتار سیاست دانوں کے ہتھکنڈوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا، جن کی پیش کردہ ہندوستان کی تصویر نے ملک کے اندر اور باہر بہتیرے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ [تھامپسن] کہتے ہیں کہ مغرب کے حالات میں آتش فشاں پھٹنے کے آثار ہیں۔ مَیں اُسے اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ ہندوستان میں آتش فشاں کا لاوا حال ہی میں اُبل چکا ہے، اس سے کسی کو ضرر نہیں پہنچا۔ موجودہ حالات کی نوعیت یہ ہے کہ شہری ہندو آپس میں دست و

۴۵: بنام نذیر نیازی، ۲۲/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۶۰ ۴۶: بنام نذیر نیازی، ۲۳/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۶۳

۴۷: بنام تھامپسن، ۲۶/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۶۶

گریباں ہیں۔ غریب دیہاتی باشندوں کو معلوم نہیں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کا اتحاد مقابلتاً بہتر ہے، لیکن ان کے بیشتر رہنما اوسط درجے کے لوگ ہیں، جن کو مستقبل میں مشرق و مغرب کے تعلقات کا دانش مندانہ ایقان نہیں ہے۔ ان کا رویہ محض ذاتی اور نجی فوائد کی بنا پر بنتا ہے اور ان کا فوری مقصد صرف انگلستان کی موجودہ مشکلات کا استحصال کرنا ہے۔ اگر مَیں دونوں گول میز کانفرنسوں کے بارے میں اپنے تاثرات رقم کروں، جن میں مَیں نے شرکت کی تھی تو مجھ کو اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں، نیز [برطانوی لوگوں] سے متعلق نہایت ناخوش گوار باتیں کہنا پڑیں گی، جن میں سے بعض حضرات نے تخیل اور ہمت کے غیر معمولی فقدان کا مظاہرہ کیا۔ میرا یقین محکم ہے کہ انگلستان میں موجودہ برسرِ اقتدار پارٹی ہندوستان کے حالات سے نبرد آزما ہونے میں ناکام رہی ہے۔[۴۸]

مَیں آئندہ ہونے والے انتخابات میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا ہوں۔ ہز ہائینس آغا خاں نے اصرار کیا کہ مَیں کانفرنس کا صدر رہوں، لیکن اپنے بعض بہترین لوگوں کی کارگزاریوں کو دیکھنے کے بعد مَیں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ تو اس احساسِ بغاوت کی وجہ سے، جو میرے دِماغ میں اُبھرا اور کچھ اس لیے کہ میرے گلے کی تکلیف میں گذشتہ پانچ ماہ کے طبی علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ یہاں کے ڈاکٹر ویانا میں معالجہ کرانے کی رائے دیتے ہیں، لیکن مجھ ایسے آدمی کے لیے اس کے اخراجات کا متحمل ہونا دُشوار ہے۔[۴۹]

....

مَیں نہیں سمجھتا کہ ۱۹۳۵ء میں رھوڈز لیکچر دینا میرے لیے ممکن ہو سکے گا، لیکن مَیں چندے اَور انتظار کروں گا۔[۵۰]

ایک مختصر فارسی نظم 'مسافر' زیرِ طباعت ہے، اس میں میرے سفرِ افغانستان کا حال درج ہے اور اُس ملک کے نوجوان بادشاہ کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔[۵۱]

....

۴۸: بنام تھامپسن، ۲۶/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۶۶-۵۶۷ ۴۹: ایضاً، ۵۶۷-۵۶۸
۵۰: ایضاً، ۵۶۸ ۵۱: ایضاً

صحت بے شک بہت اچھی ہے، مگر افسوس ہے کہ آواز میں مطلق کشائش نہیں ہوئی۔ دوا اتوار کے روز شروع کی تھی، آج جمعہ ہے، یعنی چھ روز ہو گئے۔[۵۲] چھینک دو چار دفعہ دِن میں آتی ہے اور اس سے ریلیف بھی ہوتا ہے، بلغم بھی کچھ خارج ہوتا رہتا ہے، مگر آواز پر اثر نہیں ہوتا۔ لیپ کی دوا استعمال کر رہا ہوں، اس سے تو کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوا۔ ممکن ہے، کوئی اَور قوی تر لیپ ہو، جس کا اثر ہو اور جس کی وجہ سے کسی قسم کے دانے یا پھنسی گلے پر نہ نکلے۔ اس لیپ سے بھی کوئی دانہ وغیرہ نہیں نکلا، تاہم مؤثر بھی نہیں ہے۔[۵۳]

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوئی صدری پیچیدگی ہے اور ویانا میں علاج کا مشورہ دیتے ہیں۔ اگر میرے ذرائع اس کے متحمل ہوئے تو ویانا میں چار پانچ ماہ قیام رہے گا۔ اِس وقت ایک تجربہ کار دہلوی حکیم [نابینا] کے زیرِ علاج ہوں۔ اگر ان کا علاج ناکام رہا تو لارڈ لوتھین کو خطبات کے التوا کے لیے لکھوں گا۔ بول تو سکتا ہوں، لیکن نہایت مدھم آواز میں۔ مقدمات کی پیروی اور جلسوں کی تقریر دونوں سے قاصر ہوں۔ میری بیوی اور بچوں کو اس صورتِ حال سے شدید پریشانی لاحق ہے۔[۵۴]

میری صحت اچھی نہیں، نقرس کی شکایت ہے، اس واسطے بہت کم خط و کتابت کرتا ہوں اور اَوروں کی اصلاح سے اصولاً اجتناب کرتا ہوں۔[۵۵]

میرے لیے سفر کرنا مشکل ہے، تاہم اگر مجھے (علی گڑھ آنے سے) مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے امیدواروں کے نام، ان کی تعلیمی استعداد اور ان کی ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات سے آگاہ کر دیں تو مَیں اپنی رائے لکھ بھیجوں گا۔ امید ہے، اختتامِ اگست تک میری طبیعت بحال ہو جائے گی۔[۵۶]

ناسازیِ طبع کے باعث [جشن فردوسی میں شرکت کے لیے ایران کے] سفر کا ارادہ ملتوی کر چکا ہوں۔[۵۷]

۵۲: بنام نذیر نیازی، ۲۷/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۶۹
۵۳: بنام نذیر نیازی، ۲۸/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۷۱
۵۴: بنام فارقوہرسن، ۲۸/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۷۴
۵۵: بنام یامین ہاشمی، ۳۰/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۷۶
۵۶: بنام عظمت الٰہی، ۳۱/۷/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۸۱-۵۸۳
۵۷: بنام طاہر فاروقی، ؟/۷-۸/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۸۳

کل پرسوں سے آواز پھر کچھ رُو بصحت معلوم ہوتی ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ جواہرِ مہرہ ضرور مفید ثابت ہوگا۔[58]

آج صبح سے دوا شروع کی ہے، مگر اس وقت چار بجے شام ہے، میرا بدن ٹوٹ رہا ہے، بخار کی آمد آمد ہے۔ چونکہ سردی محسوس ہوتی ہے، اس واسطے معلوم ہوتا ہے، ملیریا ہے۔ آج صبح مجھے پیشاب بہت سرخ رنگ کا آیا تھا، معلوم ہوتا ہے، حکیم صاحب کی دوائیں بھی گرم مزاج ہیں۔[59]

صبح کی دوائی کھالی تھی، رات کی دوا نہیں کھائی۔ آج بھی کوئی دوا حکیم صاحب کی نہیں کھائی، کونین کھائی تھی۔ بخار مجھے نہیں ہوا، الحمد للہ۔ آواز کچھ رُو بصحت معلوم ہوتی ہے، مگر اس کی ترقی نہایت خفیف ہے۔ خدا جانے، کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مَیں نے پھیپھڑوں اور دل کا دوبارہ معائنہ کرالیا ہے، سب کچھ درست ہے۔[60]

....

میرا انگلینڈ جانا ابھی یقینی نہیں ہوا، غالباً نہ جاؤں گا۔[61]

'مسافر' (سیاحتِ افغانستان) کاتب کو دے دی ہے، اس کے بعد اردو کا مجموعہ دے دیا جائے گا۔[62]

[اشاعتی وطباعتی] ادارے کے متعلق رائے قائم ہے، مگر اس کی عملی صورت کے لیے ابھی تک کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اِن شاءاللہ تندرست ہو جاؤں تو فکر کروں گا۔[63]

....

[علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں] ریڈر شپ کے لیے مَیں بلا تامل رشید احمد صدیقی کے حق میں اپنی رائے دیتا ہوں۔ (فہرست میں ان کا نمبر چونتیس ہے) ایک ہونہار نثر نگار اور نقاد کی حیثیت سے انھوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ ان کی نثر میں ایک خاموش مزاح اور

۵۸: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۸/۲ء، سوم، ۵۸۶
۵۹: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۸/۵ء، سوم، ۵۹۰
۶۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۸/۶ء، سوم، ۵۹۱-۵۹۲
۶۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۸/۲ء، سوم، ۵۸۶
۶۲: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۸/۶ء، سوم، ۵۹۳
۶۳: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۸/۱۰ء، سوم، ۵۹۵

تازگی کا احساس ہوتا ہے، جو اِن کے ہم عصر نئے لکھنے والوں میں خال ہے۔ یہ فیصلہ رشید احمد صدیقی کے بارے میں مَیں ذاتی معلومات کی بِنا پر اور ان کی تحریروں کی روشنی میں دے رہا ہوں۔ میرے خیال میں کوئی اَور امیدوار رشید احمد کا ہم سر نہیں ہے۔ لیکچرر شپ کے لیے صرف چار نام قابلِ غور ہیں (فہرست میں نمبر ۶، ۱۶، ۲۰، ۲۶)۔ ذاتی طور پر مَیں سید علی احسن (نمبر ۱۶) کو منتخب کرنے کے حق میں ہوں۔ ان کی عمر ۵۷ برس ہے اور انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اردو کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ اردو کے ایک لیکچرر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی کامیابی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ افسوس کہ وہ انگریزی کے علم سے محروم ہیں۔ اس بِنا پر مجھے خدشہ ہے کہ کمیٹی کے دوسرے ممبر مجھ سے متفق نہیں ہوں گے۔ اگر ممبران کسی صورت مجھ سے اتفاق نہ کر سکیں تو پھر تین امیدواروں جلیل احمد قدوائی، محمد یحیٰی تنہا اور آغا محمد اشرف (فہرست میں نمبرِ ۶، ۲۰ اور ۲۶) میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ آغا محمد اشرف ہونہار معلوم ہوتے ہے، مگر اس نوع کی اسامی کے لیے ان کی عمر بہت ہی کم معلوم ہوتی ہے۔ باقی رہے دو امیدوار، مَیں ان میں سے جلیل احمد قدوائی کو ترجیح دیتا ہوں۔[۶۴]

....

الحمد للہ کہ بخار جاتا رہا۔ پرسوں سے مَیں حکیم صاحب کی دوا کھا رہا ہوں۔ امید ہے، اس دوا سے آواز کی کشائش ہوگی۔ بخار سے جو ترقی معکوس ہوگئی تھی، وہ جاتی رہی۔ اب آواز اُس حالت پر آگئی ہے،، جو بخار سے پہلے تھی، مگر یہ دوا، جو اَب آئی ہے، زیادہ موٴثر معلوم ہوتی ہے۔[۶۵]

دوا کی خوراک وہی استعمال میں آتی ہے، جو حکیم صاحب نے مقرر کی ہے۔ پہلے کسی قدر قبض تھی، اب صبح پاخانہ تو کھل کر آتا ہے، مگر بہت نرم تر، قریباً دست۔ شاید جو دوا رات کو کھائی جاتی ہے، وہ دست آور ہے۔ دن کے وقت انجیر بھی ہر روز ملتان سے منگوا کر کھاتا ہوں، وہ بھی قبض کشا ہوتی ہے۔ لیپ دوا بہت تھوڑی ہے، صرف ایک گولی، جو پانی میں گھلا

۶۴: بنام عظمت الٰہی، ۱۹۳۴/۸/۷ء، سوم، ۵۹۳-۵۹۴ ۶۵: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۸/۱۰ء، سوم، ۵۹۵

کر لگائی جاتی ہے۔ اگر اس کی مقدار دُگنی کر دی جائے تو شاید مزید فائدہ ہو۔ آواز میں خفیف سی تبدیلی ہے۔ دوا بدھ کو شروع کی تھی، آج ہفتہ ہے؛ گویا آج دوا کھاتے ہوئے چوتھا روز ہے۔ آواز میں hoarseness معلوم ہوتی ہے۔ بلغم کل سے کم نکلتا ہے۔ شام کو مَیں مرغ کے چوزے کا شوربا پیتا ہوں۔[۶۶]

دوا کا استعمال جاری ہے۔ مجھے اس دوا کے استعمال سے کوئی گرمی محسوس نہیں ہوئی، گو پیشاب کا رنگ کسی قدر زردی مائل ہے، اس واسطے خوراک نصف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آواز میں بھی خفیف تبدیلی ہے، مگر یہ کئی دِن سے ہے اور کشائش آواز میں مزید ترقی نہیں ہوئی۔ لیپ کی دوا دُگنی کر دی گئی ہے۔ ایک شخص نے مشک کے استعمال کا مشورہ دیا ہے، شاید موجودہ دوا میں یہ جزو پہلے سے ہی موجود ہے۔[۶۷]

....

کتاب کا نام 'نشانِ منزل' کی جگہ بالِ جبریل تجویز ہوا ہے۔ جہاں تک مَیں اندازہ کر سکتا ہوں، یہ کتاب جلد ختم ہو جائے گی۔ لوگ یہاں اس کی اشاعت کے لیے بہت منتظر ہیں۔[۶۸]

فی الحال 'مسافر' (سیاحتِ چندروزہ افغانستان) کی کتابت شروع ہے، جو غالباً کل یا پرسوں ختم ہو جائے گی، اس کے بعد بالِ جبریل کی کتابت شروع ہوگی۔[۶۹]

....

چونکہ دو ماہ میں کوئی زیادہ محسوس ترقی آواز میں نہیں ہوئی، اس واسطے اَب ڈاکٹر صاحبان بغلیں بجاتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آواز درست نہ ہوگی۔ مَیں بھی کبھی کبھی مایوس ہو جاتا ہوں، مگر حکیم صاحب کی توجہ اور اُن کی روحانیت پر بھروسا رکھتا ہوں۔ دوا اَب تین چار روز کی باقی ہے۔[۷۰]

۶۶: بنام نذیر نیازی، ۱۱/۸/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۹۷
۶۷: بنام نذیر نیازی، ۱۲/۸/۱۹۳۴ء، سوم، ۵۹۹
۶۸: ایضاً
۶۹: ایضاً، ۵۹۹-۶۰۱
۷۰: بنام نذیر نیازی، ؟/۸/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۰۱

مجھے ابتدائے علالت میں بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے آنکھ کے سامنے اندھیرا ہو جائے اور سر چکرائے۔ جوں جوں صحت ترقی کرتی گئی، یہ بات رفع ہوتی گئی، چنانچہ اس سے تین چار روز پہلے تک اس کا نشان تک باقی نہ تھا۔ اب تین چار روز سے پھر ایسا ہوتا ہے، حالانکہ میری صحت بہت اچھی ہے۔[۷۱]

....

بالِ جبریل کی پہلی ایڈیشن پانچ ہزار کی ہوگی، قیمت غالباً پانچ یا زیادہ سے زیادہ آٹھ روپے ہوگی۔ عبدالمجید [پرویں رقم] صاحب کاتب لکھے گا اور مطبع گیلانی لاہور میں چھپے گی۔[۷۲]

'مسافر' صرف ایک ہزار یا زیادہ سے زیادہ پندرہ سو کاپی چھاپنے کا ارادہ ہے۔ قریباً ایک سو کاپی کابل جائیں گی۔ چند کاپیاں، جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی، خاص کاغذ پر چھپیں گی۔[۷۳]

....

آواز میں کوئی نمایاں تبدیلی آج تک نہیں ہوئی۔ صحت بہت اچھی ہے اور جو شکایت کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا ہو جاتا ہے، وہ خود بخود رفع ہوگئی ہے۔ رات کے سوتے وقت جو دوا کھائی جاتی ہے، اگر اس میں پوری مقدار لی جائے تو رات کے چار بجے ہی دست آ جاتے ہیں، اگر تھوڑی مقدار میں کھائی جائے تو بھی دست ہی آتا ہے، گو جلاب نہیں ہوتا۔[۷۴]

....

جاوید کی والدہ مدت سے علیل ہے۔ اُس کا جگر اور تلی دونوں بڑھے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب قبلہ نے ایک دفعہ پہلے بھی ان کے لیے ایک دوا تجویز کی تھی، جس کا استعمال کیا گیا، مگر فائدہ نہ ہوا۔ اس پر حکیم صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ ان کی نبض دیکھ لیں تو بہتر ہو۔ اُس وقت دہلی جانے کے لیے حالات سازگار نہ تھے، اب اِن شاءاللہ تعالیٰ اکتوبر میں وہ دہلی آئیں گی اور نبض حکیم صاحب کو دِکھائیں گی۔[۷۵]

۷۱: بنام نذیر نیازی، ۲۲/۸/۱۹۳۴ء، سوم، ۲۰۵
۷۲: ایضاً
۷۳: ایضاً
۷۴: بنام نذیر نیازی، ۲۸/۸/۱۹۳۴ء، سوم، ۲۰۹
۷۵: ایضاً

[والدۂ جاوید کے] ہاتھوں اور بانہوں کے پٹھے کمزور ہیں، چیزوں کے اٹھانے میں دِقت ہوتی ہے۔ شام کو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ خفیف سی حرارت ہوگئی ہے، نفس گرم آتا ہے۔ ذرا سی گرم شے، مثلاً انڈا وغیرہ کھائیں تو زبان میں چھالا پڑ جاتا ہے۔ پاخانہ تندرستوں کی طرح آتا ہے، مگر چار پانچ دفعہ آتا ہے۔ تلی اور جگر دونوں بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کا علاج انجکشن کے ذریعے ایک مدت ہوئی، کرایا گیا تھا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس کے بعد بعض پیٹنٹ انگریزی اور امریکن دوائیں استعمال کی گئیں، ان سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔[76]

....

آواز کی حالت بدستور ہے، خفیف سی تبدیلی، جو مدت ہوئی، ہوئی تھی، وہی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میرا بدن نئے سرے سے تعمیر ہو رہا ہے، مگر تعجب ہے کہ آواز میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔[77]

....

سفرنامہ افغانستان کی کتابت ختم ہوگئی ہے، دو چار روز میں طباعت شروع ہوگی۔ بالِ جبریل کی کتابت آج سے شروع ہے۔[78]

مَیں نے اپنی تمام کتابوں کا حقِ تصنیف جاوید کے نام ہبہ کر کے دستاویز رجسٹری کرا دی ہے۔ اب یہ سب مال اس کا ہے، چونکہ وہ ابھی نابالغ ہے، اس واسطے مجھے اس کا باقاعدہ حساب رکھنا ہے۔[79]

....

مکان کی تعمیر چند روز میں شروع ہوگی۔ مجھ کو روپے کی ضرورت ہے، اگر یہاں اس کا انتظام یک مشت ہوگیا تو بہتر، ورنہ کچھ کتابیں جامعہ کمیشن پر خرید سکتا ہے۔[80]

....

۷۶: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۸/۲۸ء، سوم، ۶۰۹-۶۱۲ ۷۷: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۹/۳ء، سوم، ۶۱۴

۷۸: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۹/۹ء، سوم، ۶۲۰ ۷۹: ایضاً، ۶۲۳

۸۰: ایضاً

کل شام خفیف سا بخار ہو گیا تھا، اس واسطے آج صبح سے کونین شروع کی ہے۔ بخار ملیریا ہے، دو چار روز تک کونین جاری رکھوں گا اور دوا حکیم صاحب قبلہ کی نہ کھاؤں گا۔ کل کابل سے سردا بھی آ گیا ہے، امید ہے، اس سے آواز کو فائدہ ہوگا۔[81]

میری صحت عامہ حکیم نابینا صاحب کے علاج سے بہت اچھی ہو گئی ہے، بلکہ تمام عمر میں ایسی نہ تھی، البتہ ابھی تک آواز میں، جو اصل شکایت ہے، کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی، گو بہ نسبت سابق کسی قدر فرق ضرور ہے۔ باتیں کر سکتا ہوں، خطابت نہیں کر سکتا، نہ کچہری جا کر مقدمات پر بحث کر سکتا ہوں۔ غالباً ابھی چند ماہ اور علاج ہوا تو آواز اپنی اصلی حالت پر عود کرے گی۔[82]

....

میرا ارادہ شملہ آنے کا تھا، مگر لاہور سے ہل نہ سکا۔ سردار صلاح الدین سلجوقی افغانی میرے دوست ہیں اور عربی و فارسی کے عالم، اگر مَیں شملہ آتا تو انھی کے ہاں ٹھہرتا۔[83]

لاہور میں ایک عالم ترک آیا تھا، مجھ سے بھی ملنے کے لیے آیا تھا۔ میرے کمرے میں سلطان ٹیپو کے مزار کا فوٹو دیکھ کر بے اختیار رونے لگا۔[84]

آج کل کوئی شغل نہیں۔ 'مسافر' اور بالِ جبریل کی کتابت اور پروف دیکھتا ہوں۔ رھوڈز لیکچر کا لکھنا ابھی نہیں ہو سکا، غالباً مہلت مانگنی پڑے گی۔[85]

لیکچروں کے اردو ترجمے کی شرائط طباعت کے متعلق کوئی خط ابھی تک مجھے جامعہ [ملیہ] کی طرف سے نہیں آیا۔[86]

....

ایک شخص، جو خود اس بیماری کا مریض رہ چکا ہے، عراق میں اسے ایک ترک طبیب نے تمباکو میں چرس رکھ کر پلائی تھی اور اس کے ساتھ لپٹن کی چائے، جس میں شکر کی جگہ گڑ

۸۱: بنام نذیر نیازی، ۱۲/۹/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۲۳
۸۲: بنام راغب احسن، ۱۶/۹/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۲۵-۶۲۶
۸۳: ایضاً، ۶۲۶
۸۴: ایضاً
۸۵: ایضاً، ۶۲۶-۶۲۸
۸۶: بنام نذیر نیازی، ۱۸/۹/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۲۸

ڈالا جائے۔ اس نسخے سے اُسے فائدہ ہو گیا اور صرف تین چار روز کے عرصے میں اس کی آواز صاف ہو گئی۔ کہتا ہے کہ شرطیہ علاج کرتا ہوں۔ چرس، گولی کی صورت میں ہے اور گولی مکئی کے دانے سے بقدر نصف کے ہے۔ حکیم صاحب کی دوا کا استعمال جاری ہے، چونکہ آواز پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوتا، اس واسطے طبیعت پریشان رہتی ہے۔ آواز کشا گولیوں کا بھی اثر نہیں ہوا۔ سردہ کابل سے منگوایا تھا، دو تین روز تک، مگر آواز پر اس نے اچھا اثر نہیں کیا، اس واسطے مَیں نے پرسوں سے اس کا کھانا چھوڑ دیا ہے۔[۸۷]

مجھے ان [حکیم صاحب] پر کامل اعتماد ہے، اس واسطے جب کبھی کوئی شخص دوا بتاتا ہے تو مَیں دوا بتانے والے سے یہی کہتا ہوں کہ اگر حکیم صاحب نے اجازت دی تو استعمال کروں گا۔ اِن شاء اللہ، ان ہی کی ہدایت پر عمل ہوگا۔ حبوبِ آواز کشا ختم ہو گئی ہیں۔ مَیں انھیں صرف ایک دفعہ دِن میں استعمال کرتا تھا اور ایک ہی دفعہ تین چار گولیاں منہ میں ڈال لیتا تھا اور کچھ وقت تک چوستا رہتا تھا۔[۸۸]

....

اکابرِ اسلام کی دین سے بے خبری دیکھ کر سخت روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ سنا ہے، اسی بے خبری اور جہالت کی وجہ سے علی گڑھ میں خرابیاں ہو رہی ہیں۔ باوجود ان سب باتوں کے، مایوس نہ ہونا چاہیے اور دعا میں پناہ ڈھونڈنی چاہیے۔[۸۹]

مَیں نے کسی سے [علی گڑھ میں Anti God کے قیام کے بارے میں[۹۰]] سنا تھا، جس کا مجھے اس قدر رنج ہوا کہ تمام رات بے خواب گزری اور صبح کی نماز گریہ وزاری کی کوئی حد نہ رہی۔[۹۱]

....

مَیں صبح کو بٹیر اور شام کو تیتر کھاتا ہوں، سبزی کا استعمال بہت کم کر دیا ہے، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پاخانہ سدہ بن کر گٹھلیوں کی طرح آتا ہے۔[۹۲]

۸۷: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۹/۱۸ء، سوم، ۶۲۸

۸۸: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۹/۲۵ء، سوم، ۶۳۳-۶۳۴

۸۹: بنام راغب احسن، ۱۹۳۴/۹/۱۶ء، سوم، ۶۲۶

۹۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۹/۲۵ء، سوم، ۶۳۴

۹۱: ایضاً، ۶۳۴

۹۲: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۹/۲۹ء، سوم، ۶۳۸

نئی دوا کے استعمال سے کوئی خاص اثر آواز پر نہیں ہوا، دو روز سے پان کی جڑ بھی رکھ رہا ہوں۔ میرے خیال میں اب تمام تر توجہ اُن [حکیم صاحب] کو آواز کی طرف دینی چاہیے۔ آٹھ ماہ کی علالت (اور علالت بھی ایسی کہ حقیقت میں کوئی علالت نہیں) سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔[۹۳]

علی بخش کی رائے ہے کہ جو دوا اس آخری دوا سے پہلے مَیں کھایا کرتا تھا، وہ صحت کے لیے بہت عمدہ ہے؛ بالخصوص وہ، جو صبح کے وقت ذرا سی چاٹ لی جاتی تھی۔ گذشتہ چند روز سے، چہرے پر جو سرخی حکیم صاحب کی دوا کے استعمال سے آ گئی تھی، اب علی بخش اور بعض دیگر آدمیوں کی رائے میں کم ہو گئی ہے۔ اگر حکیم صاحب دوا میں تبدیلی چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ مذکورہ بالا امر کو ملحوظ رکھ کر ابھی ہو جائے۔[۹۴]

رات کو روٹی کا استعمال میری طبیعت اور عادت کے خلاف ہے اور چاول کے استعمال سے اندیشہ ہے کہ بلغم کی تولید نہ ہو۔ پھلوں میں سردے کا اثر اچھا ثابت نہیں ہوا، علیٰ ھٰذا القیاس انگور کا اثر بھی آواز پر اچھا نہیں معلوم ہوتا۔[۹۵]

بادام روز کھاتا ہوں، کوزہ مصری کے ساتھ کھانے کے بعد۔ پستہ و چلغوزہ چند روز کھایا، بعد ازاں خود بخود چھوٹ گیا۔ مجھے تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ بادام مع مصری کوزہ، پستہ و چلغوزہ سے زیادہ مفید ہے۔ پرندوں اور نر خرگوش کا مغز مَیں نے آج تک استعمال نہیں کیا۔ مغز خرگوش کا کھانا میرے لیے ناممکنات سے ہے، علیٰ ھٰذا القیاس پرندوں کا مغز۔ مجھے مغز سے، خواہ وہ کسی جانور کا ہو، سخت کراہت ہوتی ہے۔ بکرے کا مغز پکا ہوا دیکھ لوں تو طبیعت متلا جاتی ہے۔ خرگوش کا ملنا بھی مشکل ہے۔ بکرے کا مغز تو شاید دل کڑا کر کے کھا بھی لوں، خرگوش کا مغز یا چڑے کا مغز کھانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔[۹۶]

آواز بہ نسبت سابق، اب کچھ ترقی ہے۔ الحمدللہ، صبح بلغم بہت نکلتی ہے، جس سے تعجب

۹۳: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۹/۳۰ء، سوم، ۶۴۰-۶۴۳
۹۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۱۰/۵ء، سوم، ۶۴۳
۹۵: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۱۰/۶ء، سوم، ۶۴۵
۹۶: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۱۰/۱۱ء، سوم، ۶۴۷

ہوتا ہے کہ اس قدر بلغم کہاں سے آتی ہے۔ بہر حال، اس کے نکلنے سے آواز میں اس وقت نسبتاً زیادہ صفائی ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے، یہی تجویز کار گر ہوگی۔ اس دوا کا عام صحت پر بھی اچھا اثر ہے، قبض بھی نہیں ہے۔[۹۷]

....

لیکچروں کے متعلق جو شرائط مکتبہ [جامعہ ملیہ] کے ساتھ طے ہوں، وہ صرف پہلی ایڈیشن کے متعلق ہوں گی۔ رقم، جو تجویز ہو، یک مشت اور فوراً ادا ہو جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اب چند روز میں جاوید کے مکان کی تعمیر شروع ہونے والی ہے اور روپے کی ضرورت ہے۔ بالِ جبریل دس ہزار طبع ہوگی۔ اس کی فروخت کا انتظام بھی ہو گیا ہے، ایک لوکل کمپنی نے سب کی سب خرید کر لی ہے۔[۹۸]

حامد علی صاحب [مہتمم مکتبہ جامعہ] کا خط آیا تھا، وہ رقم کی ادائیگی کے لیے کتاب کی اشاعت سے ایک سال کی میعاد مانگتے ہیں، بالفاظِ دیگر پندرہ سولہ ماہ کے لیے۔ مَیں ان کے خط کا آخری جواب چند روز تک لکھوں گا۔[۹۹]

....

آواز میں گذشتہ ہفتے کچھ تبدیلی ہوئی تھی، مگر اس سے آگے مزید تبدیلی نہیں ہوئی، البتہ صحت بہت اچھی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نمایاں ترقی آواز میں ہو۔ آواز کی خاطر کسی ایسے اکسیر کی ضرورت ہے، جو بہت جلد اور نمایاں اثر کرے اور آج کل ایسا اکسیر سوائے حکیم صاحب کے، اَور کس کے پاس ہے![۱۰۰]

....

جاوید کی والدہ بہت کمزور ہوگئی ہے۔ اس کے اعصاب بہت کمزور ہو گئے ہیں اور اگر زیادہ دیر تک بیٹھے تو اٹھتے ہوئے سر میں چکر آ جاتا ہے۔[۱۰۱]

۹۷: بنام نذیر نیازی، ۱۹/۱۰/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۵۰ — ۹۸: ایضاً، ۶۵۰-۶۵۲

۹۹: بنام نذیر نیازی، ۲۸/۱۰/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۵۸ — ۱۰۰: ایضاً، ۶۵۶

۱۰۱: بنام نذیر نیازی، ۲۰/۱۰/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۵۲-۶۵۳

افسوس کہ جاوید کی والدہ بہت کمزور ہوگئی ہے، سفر کے لائق نہیں رہی۔ کچھ اس کو میری بیماری نے بھی پریشان [کر] رکھا ہے۔ وہ نہایت حساس ہے اور ذرا سا فکر اس کو بے چین کر دیتا ہے۔ میرا اِرادہ اسے دہلی بھیجنے کا تھا، مگر اَب کیا کِیا جائے۔ اس کو صرف یہی شکایت ہے کہ کمزوری اعصاب کی بڑھتی جاتی ہے۔ ہاتھ سے پکڑ کر کوئی چیز مشکل سے اٹھا سکتی ہے۔ پاخانہ میں پایہ بلند ہو تو اس پر پاؤں رکھنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، چہرہ زرد ہوتا جاتا ہے اور بدن میں لاغری ہے۔ باقی تلی اور جگر کی شکایت اس کی پرانی ہے۔ فی الحال اس کمزوری نے اسے بہت تنگ کر رکھا ہے، اَور کوئی شکایت نہیں ہے۔ قریباً ایک ہفتے سے انگریزی گولیاں کھا رہی ہے، مگر ان کا کوئی اثر نہیں۔ ڈاکٹر کی تشخیص ہے کہ خون میں red corpuscles نہیں رہے یا اُن کی بہت کمی ہوگئی ہے۔[۱۰۲]

حکیم صاحب قبلہ کے بڑے بیٹے [عبدالحی انصاری] اتفاق سے لاہور میں ہیں۔ مَیں نے ان کو پرسوں بلایا تھا۔ انھوں نے جاوید کی والدہ کی نبض دیکھ کر ایک نسخہ تجویز کیا ہے، جو کل سے استعمال ہو رہا ہے۔ وہ چند روز تک دہلی واپس جائیں گے اور حکیم صاحب کی خدمت میں کُل حالات عرض کریں گے۔[۱۰۳]

....

ان دواؤں سے، جو اَب تک استعمال کی گئیں، صحت پر بڑا اچھا اثر پڑا ہے، مگر آواز میں بحیثیت مجموعی کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا۔ معلوم نہیں، یہ بلغم اتنی کہاں سے آتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی رہتی ہے۔ مَیں کوئی ایسی چیز بھی نہیں کھاتا، جس سے بلغم پیدا ہو، تاہم کھانا کھانے، چائے پینے یا پانی پینے کے بعد بلغم نکلتی ہے اور نکلنے کے بعد آواز نسبتاً صاف ہو جاتی ہے۔ تھوڑی مدت گزرنے کے بعد پھر اسی طرح ہو جاتی ہے۔[۱۰۴]

کبھی کبھی دِن میں ہچکی بھی ہوتی ہے، مگر صرف ایک دفعہ۔ ایسا دن بھر میں دو تین دفعہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ رات کو یہ ہچکی مطلق نہیں ہوتی اور نیند خوب آتی ہے۔ قبض رہتی ہے،

۱۰۲: بنام نذیر نیازی، ۳۱/۱۰/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۵۸-۶۶۰ ۱۰۳: بنام نذیر نیازی، ۵/۱۱/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۶۰-۶۶۲

۱۰۴: بنام نذیر نیازی، ۱۰/۱۱/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۶۵

پاخانہ کھل کر نہیں آتا۔ بھوک کسی قدر کم ہوگئی ہے۔ اس دوا سے پہلے، جو دوا حکیم صاحب نے ارسال فرمائی تھی، اس میں معلوم ہوتا ہے، حکیم صاحب نے قبض کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ شاید قبض کو بھی آواز کی ترقی بتعجیل نہ ہونے میں دخل ہو۔ غذا میری آج کل حسب ذیل ہے: صبح اُٹھتے ہی دوا کا استعمال، آٹھ بجے کے قریب چائے مع اُبلے ہوئے انڈوں کے، قریباً بارہ بجے یا ساڑھے گیارہ بجے کھانا، جس میں روٹی اور سبزی میں پکا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ کبھی شامی کباب بھی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد شہد خالص تین چار تولے اور بادام۔ رات کو بہت کم کھاتا ہوں، یہ میری پرانی عادت ہے۔ بھوک بھی کم ہوتی ہے، تاہم کبھی کبھی تھوڑا کھالیتا ہوں اور مرغ کا شوربا بالالتزام پیتا ہوں، خواہ کچھ کھاؤں یا نہ کھاؤں [105]

اگر آواز نارمل نہ ہوئی تو ویانا جانے کا قصد ہے۔[106]

....

[والدۂ جاوید کی] (۱) تلی اور جگر بڑھا ہوا ہونا، یہ شکایت پرانی ہے۔ (۲) ایامِ مخصوص میں تکلیف، بعض دفعہ خون کا بند ہو جانا اور ...... میں نکسیر پھوٹنا، یہ شکایت بھی مدت سے ہے۔ (۳) کبھی کبھی بخار کا ہونا، یہ ملیریا ہے کہ یہ بخار سردی کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ صرف ایک دو گھنٹے رہتا ہے، بعض دفعہ چار گھنٹے۔ عام طور پر رات کا کھانا کھانے کے بعد خفیف حرارت محسوس ہوتی ہے۔ بخار نہیں ہوتا، صرف ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا خفیف سا بخار ہے۔ (۴) چند روز ہوئے، کھانسی بھی تھی، مگر اب اس [کا] آرام ہے۔ (۵) حال میں جو شکایت پیدا ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہاتھوں اور ٹانگوں کے پٹھے کمزور ہو گئے ہیں۔ یہ شکایت قریباً پندرہ بیس روز سے پیدا ہوئی ہے، پہلے نہ تھی۔ پاؤں پر جسم کا بوجھ ڈال کر بیٹھیں تو دوسرے کی مدد کے بغیر اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاؤں لٹکا کر بیٹھیں اور دیر کے بعد اُٹھیں تو پھر اُٹھنے میں دِقت نہیں ہوتی۔ اس وقت سب سے بڑی تکلیف یہی ہے۔ (۶) ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ خون میں سرخ ذرّوں کی بہت کمی ہوگئی ہے۔

۱۰۵: بنام نذیر نیازی، ۱۲/۱۱/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۷۰ ۱۰۶: بنام نذیر نیازی، ۱۹/۱۱/۱۹۳۴ء، ۶۷۸

(۷) خون میں خرابی ہے، اس بنا پر مَیں نے یہ خیال کیا ہے کہ شاید روح الذہب ان کے لیے مفید ہو۔[۱۰۷]

[جاوید کی والدہ کو] بخار اب بالکل نہیں ہوتا، اعصاب کی شکایت ابھی بدستور ہے، دِماغ کی کمزوری بھی ہے، چنانچہ جب کچھ دیر بیٹھ کر اُٹھے تو دِماغ میں چکر سا محسوس ہوتا ہے۔ باقی شکایات اس کی پرانی ہیں، یعنی جگر تلی کا بڑھ جانا اور ایامِ خاص میں خون کا تکلیف سے آنا، بلکہ اب ایک آدھ مہینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالکل بند ہو جائے گا۔ عمر اُن کی تقریباً چالیس سال [ہے]۔[۱۰۸]

....

مَیں نے گذشتہ آٹھ مہینوں میں بہت مطالعہ کیا ہے اور غور و فکر بھی کیا ہے۔ 'مسافر' قریباً مہینا بھر ہوا کہ شائع ہو گئی، صرف چند سو نسخے طبع ہوئے تھے۔ بالِ جبریل ماہِ جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہو گی۔ چند روز میں مسودہ پریس کو چلا جائے گا۔ 'دَورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ' کی طباعت میں کچھ وقت لگے گا۔[۱۰۹]

....

میرا خیال ہے کہ ایک کتاب بعنوان ایک فراموش شدہ پیغمبر کا صحیفہ لکھوں۔ 'عصرِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ' اس کتاب کا صرف تشریحی عنوان ہو گا۔ صرف چند روز قبل بہت سے خیالات میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گئے اور مَیں نے اپنی خواہش اور اردو شاعری میں اپنی شہرت کے برعکس ان کو قلم بند کر لیا۔ بعد کے دو روز میں کتاب کا بیشتر حصہ لکھا جا چکا تھا، اب مَیں اس کو اردو نظم میں مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ فراموش شدہ پیغمبر کا صحیفہ اب انگریزی میں ایک علیحدہ کتاب ہو گی، جسے مَیں بعد میں لکھنے کی توقع رکھتا ہوں۔ قریب قریب یہ 'اعلانِ جنگ' کے موضوعات پر ہی ہو گی۔ موضوعات زندگی، ادب، سیاست، مذہب اور خواتین وغیرہ ہوں گے۔[۱۱۰]

۱۰۷: بنام نذیر نیازی، ۲۰/۱۱/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۷۸-۶۷۹
۱۰۸: بنام نذیر نیازی، ۲۹/۱۱/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۸۲
۱۰۹: بنام غلام السیدین، ۲۹/۱۱/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۸۴
۱۱۰: بنام غلام السیدین، ۲/۱۲/۱۹۳۴ء، سوم، ۶۸۷

اس میں کچھ شک نہیں کہ [آواز میں] پہلے کی نسبت اب کسی قدر ترقی ہے، مگر وہ اس قدر کم ہے کہ آئندہ کے لیے توقعات قائم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ شام کے وقت آواز کی حالت بدتر ہوتی ہے، پہلے شام کو اچھی نہ ہوتی تھی[111]

جب میں علی گڑھ آؤں گا تو...... [خواجہ غلام السیدین] کے ہاں قیام کر کے بہت مسرت ہوگی[112] اگر ایسا ہوا تو دہلی بھی حکیم صاحب سے ملنے کے لیے ٹھہروں گا۔[113]

....

[علی گڑھ مسلم] یونیورسٹی کورٹ نے مجھے اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیا یونیورسٹی کے قوانین وضوابط اس بات کی اجازت دیں گے کہ یہ ڈگری مجھے اگلے سال دے دی جائے؛ جب تک مجھے اُمید ہے کہ میں پوری طرح موجودہ بیماری سے نجات پالوں گا۔ میں ریل کا سفر کرنے کا خطرہ جاڑوں میں صرف اس صورت میں لے سکتا ہوں، جب یونیورسٹی کے قوانین کے تحت میری موجودگی قطعاً ناگزیر ہو۔[114]

فقہ اسلامی پر میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی، ہاں ان لیکچروں میں ایک لیکچر اجتہاد پر ہے، البتہ اگر صحت رہے اور قلب کو اطمینان ہو تو میں فقہ جدید کے اصول پر ایک کتاب لکھنے کا قصد رکھتا ہوں، علیٰ ھذا القیاس، قرآن شریف پر مفصل نوٹ لکھنے کا بھی ارادہ کر رہا ہوں، مگر مشکل یہ ہے...... چہ خورد بامداد فرزندم۔ رسالہ مساوات کے لیے لکھنے سے قاصر ہوں کہ علالت کی وجہ سے دل یکسو نہیں ہوتا۔[115]

مسلمان علما اپنی غفلت سے اسلامی عقائد پر بحث مباحثے کرتے رہے اور اسلام کے معاشرتی نظام کی طرف کسی نے (شاید سوائے شاہ ولی اللہ کے) توجہ نہیں کی۔ اب اس زمانے میں معاشرتی نظام اسلام کی تفصیلات کی ضرورت ہے، کیونکہ لوگ موجودہ زمانے کے اقتصادی سوالات کی وجہ سے عقائد مابعد الطبیعی میں دلچسپی نہیں لیتے۔ بحیثیت مذہب کے،

۱۱۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۱۲/۴ء، سوم، ۶۸۸
۱۱۲: بنام غلام السیدین، ۱۹۳۴/۱۲/۲ء، سوم، ۶۸۷
۱۱۳: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۱۲/۴ء، سوم، ۶۸۸
۱۱۴: بنام رجسٹرار، ۱۹۳۴/۱۲/۷ء، سوم، ۶۹۲، ۶۹۳
۱۱۵: بنام راغب احسن، ۱۹۳۴/۱۲/۱۰ء، سوم، ۶۹۳-۶۹۴

اسلام کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کے معاشرتی نظام کی افضلیت زمانۂ حال کے نظاموں پر ثابت کی جائے۔ یورپ اور اسلام کی رقابت ہمیشہ رہی ہے، مگر اس سے پہلے اس کا انتہائی نقطہ حروبِ صلیبیہ تھا، اب یورپ اور اسلام کی جنگ تلواروں کی نہیں، بلکہ معاشرت کے نظاموں کی ہوگی، یعنی فسطائیت، بولشوزم اور اسلام دِماغی flane پر معرکہ آرا ہوں گے۔ مسلمانوں میں تو اس وقت اس مطلب کے آدمی موجود نہیں، کیا عجب کہ یورپ کے مفکر خود اس نظام کا اکتشاف کر لیں۔ یہ امر مشکل بہت ہے، کیونکہ مذہب اسلام پر قرونِ اولیٰ سے ہی مجوسیت اور یہودیت غالب آ گئی، یعنی اسلام کے اصل افکار کو یہودی اور مجوسی افکار نے عوام کی نگاہوں سے چھپا لیا۔ میری رائے ناقص میں اسلام آج تک بے نقاب نہیں ہوا۔[116]

....

میرے دونوں شانوں کے درمیان جو درد تھی، اس سے افاقہ نہیں ہوا۔ بعض دفعہ مَیں رات کو اس کی وجہ سے سو نہیں سکتا، اُٹھ کر سیدھا بیٹھ جاتا ہوں تو قدرے ریلیف ہوتا ہے۔ اگر علی بخش دونوں ہاتھ سے ذرا زور سے مل دے تو پھر تھوڑی دیر کے لیے آرام ہو جاتا ہے۔ شاید دَورانِ خون کی وجہ سے ہے۔[117]

۱۱۶: بنام راغب احسن، ۱۹۳۴/۱۲/۱۱ء، سوم، ۵۹۸-۶۹۵   ۱۱۷: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۴/۱۲/۲۷ء، سوم، ۷۰۲

۱۹۳۵ء

مجھے مسرت ہوئی کہ وہ عظیم ترکی خاتون [خالدہ ادیب خانم] ہندوستان تشریف لے آئی ہیں، تاکہ ہمیں اُس اہم کشمکش کے بارے میں بتائیں، جو ابھی تک جاری ہے اور غالباً عرصہ دراز تک جاری رہے گی۔ میرے لیے ان کے خطبے کی صدارت بے پایاں مسرت کا موجب ہوتی، لیکن مَیں پچھلے سارے سال بیمار رہا اور اوّل ڈاکٹروں کے اور بعد میں ...... [ڈاکٹر انصاری] کے بھائی صاحب کے زیرِ علاج رہا۔ حکیم صاحب نے مجھے یقین دِلایا ہے کہ مَیں ٹھیک ہو جاؤں گا اور میری آواز میں بیّن افاقہ فروری کے مہینے میں ہو جائے گا۔ مَیں اُس وقت تک انتظار کروں گا اور اگر کوئی افاقہ نہیں ہوتا تو ویانا جانے کا قصد کروں گا[1]

....

آج صبح مسٹر جناح کا خط موصول ہوا۔ میرے خیال میں وقت آ گیا ہے کہ ہندو اور مسلمان متحد و متفق ہو جائیں۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ موجودہ اختلافات اَور بڑھتے جائیں گے اور پھر دونوں فرقوں میں کسی قسم کا اشتراک و تعاون ناممکن ہو جائے گا[2]

....

میری آواز کی حالت یہی ہے کہ کسی وقت تو بہت اچھی ہوتی ہے اور کسی وقت اچھی نہیں رہتی، بالعموم مَیں نے یہ نوٹ کیا ہے کہ دس بجے جو دوا پان میں کھائی جاتی ہے، اس کے بعد آواز کسی قدر بیٹھ جاتی ہے۔ اس دوا کا اثر اچھا نہیں پڑتا۔ اس سے پہلے بھی جو دوا پان میں کھائی جاتی تھی، اس کا اثر بھی اچھا نہ ہوتا تھا۔ دونوں شانوں کے درمیان جو مجھے درد

۱: بنام مختار احمد، ۱/۱/۱۹۳۵ء، چہارم، ۳۷ ۔ ۲: ایضاً، ۳۸

ہوتی ہے، یہ درد کبھی رات کو ہوتا ہے، کبھی دن کو بھی ہوتا ہے، مگر زیادہ تر رات کو۔ نیند بھی مجھ کو پہلے کی بہ نسبت کم آتی ہے اور بھوک بھی کم لگتی ہے۔ نہ معلوم، درد دورانِ خون کی سستی کی وجہ سے ہے۔ ریح کا اخراج پہلے کی نسبت کم ہوتا ہے؛ ممکن ہے، اخراجِ ریح نہ ہونے کی وجہ سے یہ درد ہو۔[۳]

پان میں رکھ کر کھانے کی دوا کا اثر بدستور اچھا نہیں پڑتا، اس واسطے مَیں نے کل پرسوں سے اسے استعمال نہیں کیا۔[۴] [البتہ] شانوں کے درمیان جو درد ہوتی تھی، وہ Embrocation سے جاتی رہی ہے۔[۵]

....

بالِ جبریل چھپ کر شائع ہوگئی ہے۔[۶]

....

[والدۂ جاوید کی] چلنے پھرنے کی قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، عام صحت کسی قدر بہتر ہوگئی ہے۔ پاؤں میں کسی قدر ورم معلوم ہوتا ہے۔ کسی قدر خشک بواسیر بھی ہے۔ ممکن ہے، یہ اس تبدیلی کی وجہ سے ہو، جو حکیم صاحب قبلہ نے دوا میں کی تھی۔ پاخانہ تین چار دفعہ دن میں آتا ہے، بھوک کم ہے۔[۷]

....

اگر موجودہ حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو مستقبل میں ملک کے لیے کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی۔ اندیشہ ہے کہ رپورٹ [Joint Committee on Indian Constitutional Reform] سے اس قسم کے محرکات اُبھریں گے اور ایسی قوتیں منصۂ شہود میں آئیں گی کہ پھر ملک کے موجودہ حالات ہمیشہ کے لیے ناقابلِ تغیر بن جائیں گے۔[۸]

....

۳: بنام نذیر نیازی، ۲/۱/۱۹۳۵ء، چہارم، ۳۸-۴۰
۴: بنام نذیر نیازی، ۵/۱/۱۹۳۵ء، چہارم، ۴۵
۵: بنام نذیر نیازی، ۹/۱/۱۹۳۵ء، چہارم، ۴۷
۶: ایضاً
۷: ایضاً
۸: بنام مختار احمد، ۹/۱/۱۹۳۵ء، چہارم، ۵۰-۵۲

مجھ کو چند روز سے نقرس کی شکایت ہے، کل سے افاقہ ہوا ہے، ابھی خفیف سا ورم پاؤں پر موجود ہے۔ امید ہے، دو چار روز [تک] دُور ہو جائے گا۔ نقرس کی وجہ سے مَیں نے حکیم صاحب کی دوا کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ درد نہیں، صرف ورم ہے، البتہ زیادہ زور سے چلوں تو کسی قدر درد بھی محسوس ہوتا ہے۔[9]

مسوڑے پھول جانے کی وجہ سے سخت تکلیف رہی، دو آپریشن کیے بعد دیگر ہو چکے ہیں۔ گذشتہ رات جو آپریشن ہوا، اس سے کسی قدر افاقہ ہوا، مگر ابھی تک صاحب فراش ہوں۔[10]

....

خالدہ ادیب خانم کے لیکچر سننے کا مَیں خود مشتاق تھا، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بہر حال، مَیں اُن سے اِن شاءاللہ ضرور ملوں گا یا بھوپال جاتے ہوئے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے۔ آج صبح سوِل [اینڈ ملٹری گزٹ] کا نمائندہ مجھ سے اُن کے پہلے لیکچر پر تبصرہ مختصر چاہتا تھا، مگر مَیں نہ لکھ سکا۔ شاید کل یا پرسوں بعض باتوں پر کچھ لکھ سکوں۔[11] مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت کے متعلق جو خیالات انھوں نے ظاہر کیے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت محدود ہے۔ انھوں نے انھی خیالات کا اعادہ کیا، جن کو یورپ کے سطحی نظر رکھنے والے مفکرین دہرایا کرتے ہیں۔ کاش! ان کو معلوم ہوتا کہ مشرق و مغرب کے تصادم میں (کلچرل) اُمّیِ عرب کی شخصیت اور قرآن نے کیا کام کیا ہے، مگر یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے، کیونکہ مسلمانوں کی فتوحات نے اسلام کے کلچرل تاثرات کو دبائے رکھا، نیز خود مسلمان دو ڈھائی سو سال تک یونانی فلسفے کا شکار ہو گئے۔[12]

بھوپال کے متعلق مفصل اطلاع دوں گا، مگر ایک دو روز میں جو اطلاع وہاں سے آئے گی، اگر اس کی رُو سے لیکچر کی صدارت ممکن ہوئی تو اس سے بھی مجھے انکار نہیں، بشرطیکہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ مَیں بولنے سے قاصر ہوں۔ یہی بات مَیں نے ڈاکٹر انصاری

9: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۱/۱۷ء، چہارم، ۵۵
10: بنام محمد شریف، ۱۹۳۵/۱/۱۹ء، چہارم، ۵۸-۵۹
11: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۱/۱۷ء، چہارم، ۵۵
12: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۱/۲۳ء، چہارم، ۶۱-۶۳

صاحب کو بھی لکھی تھی۔ اور کوئی امر مانع نہ تھا۔[۱۳]

....

علی گڑھ یونیورسٹی نے میری جو قدر افزائی کی ہے، اس کے لیے مَیں اُن کا نہایت شکرگزار ہوں۔ یہ اعزاز [ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری] اور بھی گراں قدر ہو جاتا ہے، جب مَیں یہ خیال کرتا ہوں کہ میرا کوئی حق اُس یونیورسٹی پر نہ تھا اور نہ عام طور پر علی گڑھ تحریک سے میرا کوئی خاص تعلق رہا ہے۔[۱۴]

....

مَیں ۲۹/جنوری کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۳۰/ کی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔ فرنٹیر میل سے سفر کروں گا۔ افغان قونصل خانے میں قیام کروں گا۔ افسوس کہ خالدہ خانم کے کسی لیکچر کی صدارت کرنا ناممکن ہوگا، کیونکہ دہلی صرف ایک روز ٹھہرنے کا موقع ہوگا۔[۱۵] وہاں [بھوپال میں] شاید ایک ماہ قیام رہے۔[۱۶]

بھوپال کا موسم نہایت عمدہ ہے۔ امید ہے، اس کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑے گا۔ طبی معائنہ کل ختم ہوا۔ یہاں کے ڈاکٹر نہایت ہوشیار ہیں اور ہسپتال بھی نہایت عمدہ ہے۔ طبی معائنے سے، جو نہایت مکمل تھا، حکیم صاحب کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ بہرحال، آج گیارہ بجے ultra violet rays [ماورا بنفشی شعاعوں] کا غسل شروع ہوگا، جو ابتدا میں صرف سات منٹ روزانہ ہوگا۔[۱۷]

طبی معائنہ ہو چکا ہے۔ بجلی، یعنی ultra violet rays کے ذریعے علاج کل سے شروع ہے۔ چند روز تک معلوم ہوگا کہ کس قدر فائدہ اس سے ہوتا ہے۔[۱۸] ڈاکٹر صاحبان یقین دِلاتے ہیں کہ [فائدہ] ضرور ہوگا۔[۱۹]

....

۱۳: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۱/۲۳ء، چہارم، ۶۱

۱۴: بنام محمد شریف، ۱۹۳۵/۱/۱۹ء، چہارم، ۵۹

۱۵: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۱/۲۶ء، چہارم، ۶۳

۱۶: بنام غلام السیدین، ۱۹۳۵/۱/۲۹ء، چہارم، ۶۷

۱۷: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۲/۵ء، چہارم، ۶۹

۱۸: بنام راغب احسن، ۱۹۳۵/۲/۶ء، چہارم، ۷۰

۱۹: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۲/۹ء، چہارم ۷۳

بجلی کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا ہے، کچھ خفیف سا فرق آواز میں ہے، مگر زیادہ وضاحت سے آٹھ دس دفعہ کے علاج کے بعد معلوم ہوگا۔ موسم بہت اچھا ہے، ڈاکٹر صاحب صبح و شام دیکھتے ہیں اور بہت پُر اُمید ہیں کہ مہینے کے اختتام تک نمایاں فرق ہوگا۔ نبض کی حالت اور علیٰ ھذا القیاس دل اور پھیپھڑوں کی حالت بہت عمدہ ہے۔[۲۰] مَیں سات یا آٹھ مارچ کی شام کو یہاں سے چلوں گا اور آٹھ یا نو کی صبح ساڑھے نو بجے دہلی پہنچوں گا، وہاں ایک آدھ روز قیام رہے گا۔[۲۱]

....

مسٹر جناح نے اپنی قابلیت کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ عام مسلمانوں کی پالیسی کے خلاف ایک قدم بھی نہ اُٹھائیں گے۔ میری اُن سے مفصل گفتگو ہو چکی ہے اور انتخابِ جداگانہ و مشترکہ پر بھی گفتگو ہو چکی ہے۔[۲۲]

....

رموزِ بے خودی کا ترجمہ انگریزی اگر...... [غلام دستگیر رشید] کرنا چاہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ترجمے کی مشکلات شاید اتنی ہیں کہ مترجم کا دل توڑنے کے لیے کافی ہیں، دوم یہ کہ مَیں خود ترجمے کی اصلاح کا کام نہیں کر سکتا۔[۲۳]

....

جاوید کی والدہ نے دوا آج سے شروع کر دی ہے۔ وہ اب چل پھر سکتی ہیں اور بواسیر کی شکایت بھی نہیں ہے، مگر دو شکایتیں بہت ہیں: جگر بہت بڑھ گیا ہے، اس پہلو پر لیٹنا بھی مشکل ہے۔ رات کو کھانسی بہت آتی ہے۔[۲۴] بالخصوص رات کے وقت بڑے تکیے پر سہارا لے کر بیٹھیں یا لیٹیں تو کھانسی کم ہوتی ہے، لیکن معمولی تکیے پر سیدھا لیٹنے سے بہت ہوتی ہے۔ پاؤں پر ورم ہے، جسم دُبلا ہو گیا ہے۔[۲۵]

....

۲۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۲/۱۳ء، چہارم، ۸۲

۲۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۲/۲۷ء، چہارم، ۸۶

۲۲: بنام شفیع داؤدی، ۱۹۳۵/۲/۱۲ء، چہارم، ۸۱

۲۳: بنام غلام دستگیر رشید، ۱۹۳۵/۳/۲ء، چہارم، ۸۷

۲۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۳/۱۱ء، چہارم، ۹۱

۲۵: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۳/۱۱ء، چہارم، ۹۱-۹۲

بھوپال کے ڈاکٹروں نے مجھے مکمل ذہنی اور جسمانی آرام کرنے کی تاکید کی ہے۔ مَیں نے (اسی باعث) آل انڈیا مسلم لیگ کی ریسپشن کمیٹی کی صدارت قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے[26]۔ علاج برقی ایک سال تک جاری رہے گا۔ دو ماہ کے وقفے کے بعد پھر بھوپال جانا ہوگا[27]۔

مَیں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں، اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی[28]۔

....

جاوید کی والدہ...... دن بدن لاغر اور کمزور ہو رہی ہے، ذرا اس میں طاقت آ جائے تو مَیں اسے ایک روز کے لیے دہلی بھیج دوں گا، تاکہ حکیم صاحب نبض دیکھ لیں[29] مگر افسوس ہے کہ وہ اس قابل نہیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ سفر سے اس کی تکلیف میں اضافہ نہ ہو جائے۔ یہاں کے اطبا پر مجھے اعتماد نہیں، انگریزی علاج سے مزمن امراض میں فائدہ نہیں ہوتا، علاوہ اس کے یہ طریقِ علاج پہلے آزمایا بھی جا چکا ہے۔...... [حکیم صاحب] خود ضعیف ہیں، معلوم نہیں کہ باہر تشریف لے جایا کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ کچھ کم فیس قبول کر لیں تو مَیں ان کی عنایت کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ ایک سال سے زیادہ مدت ہوتی ہے کہ مَیں اپنی علالت کی وجہ سے کچھ کام نہیں کر سکا۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے ہیں، تاہم جہاں تک ممکن ہوگا، مَیں حکیم صاحب کے سفر کا بار اُٹھانے کو حاضر ہوں۔ وہ رات کو وہاں سے سفر کریں اور صبح یہاں پہنچیں، پھر اُسی شام کو رخصت ہو سکتے ہیں[30]۔

ہم لوگ اِن شاء اللہ وسط مئی تک اپنے نئے مکان میں چلے جائیں گے۔ خدا کرے کہ اُس وقت تک میری بیوی میں ذرا چلنے پھرنے کی طاقت پیدا ہو جائے[31]۔

....

۲۶: بنام ورما، ۱۹۳۵/۳/۱۵ء، چہارم، ۹۵

۲۷: بنام محمد حسین عرشی، ۱۹۳۵/۳/۱۹ء، چہارم، ۹۶

۲۸: ایضاً

۲۹: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۳/۲۰ء، چہارم، ۹۸

۳۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۳/۲۷ء، چہارم، ۱۰۱-۱۰۲

۳۱: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۴/۲۶ء، چہارم، ۱۰۶

کچھ عرصہ پہلے تو اس خیال سے بہت مسرت تھی کہ...... [راس مسعود] کے اس کوشش میں کامیاب ہونے کی قومی امید تھی اور اس طرح میرے لیے ممکن ہوسکتا تھا کہ مَیں قرآنِ کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا، جو عرصے سے میرے زیرِ غور ہیں، لیکن اب تو، نہ معلوم کیوں، ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو مَیں سمجھتا ہوں، قرآنِ کریم کے اِن نوٹوں سے بہتر مَیں کوئی پیش کش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا۔ بہر حال، دیدہ باید، ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اگر عالمِ جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لیے مقدر ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لیے ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا۔[۳۲]

....

جاوید کی والدہ کی حالت تشویش انگیز ہوگئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، ہمارا تمام علاج اندھیرے میں تھا۔ قریباً آٹھ دس روز ہوئے، ان کی ران پر ایک خوف ناک پھوڑا نکلا، کل اس کا آپریشن کرایا گیا۔ اگرچہ وہ نہایت کمزور ہوگئی ہے اور اندیشہ تھا کہ شاید نشتر کو برداشت نہ کر سکے گی، تاہم آپریشن ضروری تھا۔ الحمد للہ کہ آپریشن کامیاب ہوا،[۳۳] اگرچہ یہ بڑا ہی ہول ناک اور ناقابلِ برداشت منظر تھا[۳۴] اور بے حد خون اور پیپ اس پھوڑے سے برآمد ہوا۔ دوسرے ہی روز اس کا بخار بھی کم ہوگیا، چنانچہ آج صبح نارمل تھا۔ اب کسی قدر تشویش کم ہوئی ہے اور امید ہے کہ اس کی زندگی ابھی کچھ باقی ہے۔ اب ذرا وہ اچھی ہو لے تو مَیں حکیم صاحب کی خدمت میں مفصل لکھوں گا۔[۳۵]

....

اب تک [میرا] یہی دستور رہا ہے کہ کتاب مَیں خود چھپواتا ہوں۔ زبورِ عجم اور اسرار و رموز کی طباعت کا انتظام فوراً ہو سکتا ہے، مگر میرا ارادہ ہے کہ زبورِ عجم اب

۳۲: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۴/۲۶ء، چہارم، ۱۰۸
۳۳: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۵/۲ء، چہارم، ۱۱۱
۳۴: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۵/۲ء، چہارم، ۱۱۳
۳۵: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۵/۲ء، چہارم، ۱۱۱

کے مع اردو ترجمہ شائع ہو۔ صورِ اسرافیل (اردو) کی تکمیل ابھی چند ماہ اَور لے گی۔[۳۶]

میری خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت [نواب بھوپال] خود مجھے اپنی ریاست سے پنشن منظور کر دیں، تا کہ مَیں اس قابل ہو جاؤں کہ قرآن پر اپنی کتاب لکھ سکوں۔ یہ ایک بے نظیر کتاب ہوگی اور ان کے نام اور شہرت کو بقاے دوام بخشے گی۔ یہ جدید اسلام کے لیے ایک بڑی خدمت ہوگی اور مَیں شیخی نہیں بگھار رہا ہوں، جب یہ کہتا ہوں کہ آج دنیاے اسلام میں مَیں ہی وہ واحد شخص ہوں، جو اس کو کر سکتا ہے۔ مَیں اس کے لیے تیار ہو سکتا ہوں کہ اس کتاب کو اعلیٰ حضرت کی نذر کر دوں اور اس پر کسی طرح کا کوئی حق نہ رکھوں۔ اعلیٰ حضرت بھوپال کے مستثنیات میں سے ہیں اور ان کو کچھ ایسی روایات ورثے میں ملی ہیں، جو ان میں سے اکثر کو نہیں ملیں، اس لیے اس بات کی امید کم ہے کہ وہ اعلیٰ حضرت کے خیالات سے ہمدردی رکھیں گے، تاہم انتظار کیا جائے، دیکھیے کہ موجودہ امید و بیم کی حالت کسی نہ کسی طرح ختم ہو۔ اگر ہم [راس مسعود اور مَیں] ناکام ہوئے تو مَیں فوراً ہی کوئی دوسرا منصوبہ بناؤں گا۔ میرے حالات فوری کارروائی کے مقتضی ہیں۔[۳۷]

مَیں نے خود کو سادہ زندگی گزارنا سکھا لیا ہے۔ میری ضروریات بہت زیادہ نہیں ہیں۔ مَیں سوچتا ہوں کہ ایک تھوڑی سی پنشن میرے لیے کافی ہوگی، نہ کہ مجھے ہزاروں کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ احساس ہے کہ مَیں زندگی کے آخری دِن گزار رہا ہوں اور میری دلی تمنا ہے کہ مَیں قرآن کے بارے میں اپنے افکار کو اس دنیا سے جانے سے پہلے قلم بند کر دوں۔ جو تھوڑی سی توانائی مجھ میں باقی ہے، اسے اب اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں، تا کہ (قیامت کے دِن)...... [راس مسعود] کے جدِ امجد (حضور نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دِین کی، جو حضورؐ نے ہم سب تک پہنچایا، کوئی خدمت بجا لا سکا۔[۳۸]

....

۳۶: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۵/۲ء، چہارم، ۱۱۱، ۱۱۳ ۳۷: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۵/۱۲ء، چہارم، ۱۱۷
۳۸: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۵/۱۳ء، چہارم، ۱۱۸

میری بیوی رُو بصحت ہے، وہ بہت کمزور ہے اور ہم لوگ آئندہ دو ہفتوں تک نئے مکان میں منتقل نہیں ہو سکیں گے۔[۳۹]

جاوید کی والدہ...... کے ابڈومن [abdomen] میں پانی بھر گیا ہے، اس غرض کے لیے ڈاکٹر آپریشن کیا کرتے ہیں، مگر ڈاکٹر جمعیت سنگھ، جن کے زیرِ علاج وہ اس وقت ہے، ان کی رائے ہے کہ آپریشن کی ضرورت نہیں، دواے اور انجکشن سے پانی خود بخود خارج ہوگا۔ بخار ایک سو اور ایک سو ایک کے درمیان ہمیشہ رہتا ہے، چھ ماہ سے اس کا mensuration بند ہے، عمر سینتیس [سے چالیس] برس کی ہوگی۔[۴۰]

....

[احراری قادیانی نزاع کے بارے میں میرا] مضمون قریباً تمام انگریزی اخباروں میں شائع ہوا ہے، *Eatern Times* [لاہور] *Tribune*، [لاہور] *Statesman*، [دہلی کلکتہ] *Star of India*، کلکتہ؛ علاوہ اس کے اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ ۱۴رمئی کے *Statesman* نے اسے شائع کیا ہے اور ساتھ ہی اس کے اوپر لیڈنگ آرٹیکل بھی لکھا ہے۔ اب یہاں کے چند نوجوان اسے پمفلٹ کی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ پمفلٹ کی صورت میں اس میں تھوڑا سا اضافہ بھی ہو جائے گا۔[۴۱]

....

میری بیوی خطرناک طور پر بیمار ہے، شاید یہ اس کے آخری لمحات ہیں، لہٰذا میرے لیے لاہور سے باہر جانا اِس وقت دُشوار ہے۔[۴۲]

....

کل [۲۳رمئی کی] شام [ساڑھے پانچ،[۴۳]] چھ بجے والدۂ جاوید اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں۔ ان کے آلام و مصائب کا خاتمہ ہوا اور میرے اطمینانِ قلب کا، اللہ فضل کرے...... ہر چہ از دوست می رسد نیکو است۔[۴۴]

۳۹: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۵/۱۲ء، چہارم، ۱۱۷

۴۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۵/۱۷ء، چہارم، ۱۱۹

۴۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۵/۱۷ء، چہارم، ۱۲۱

۴۲: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۵/۲۳ء، چہارم، ۱۲۵-۱۲۶

۴۳: ایضاً، ۱۲۶

۴۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۵/۲۴ء، چہارم، ۱۲۶-۱۲۸

راہی سوے فردوس ہوئی مادرِ جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پُر داغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی 'سرمۂ ما زاغ'[45]
[۱۳۵۴ھ]

اہلیہ کی وفات کا سانحہ میرے لیے سوہانِ روح ہے، لیکن خدا پر میرا ایمان اور تقدیرِ انسانی پر اعتقاد آج بھی اُتنا ہی پختہ اور مستحکم ہے، جتنا ہمیشہ رہا ہے۔ اس کا ایک متوسط گھرانے سے تعلق تھا، لیکن اس کے انتقال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ جو رقم مَیں اُسے دیا کرتا تھا، وہ سب غربا کی امداد میں صَرف کر دیا کرتی تھی۔ قدیم مکان میں بارہ سال کے قیام کے دَوران اس نے بیس غریب بچیوں کو وِردِ قرآن سکھایا اور ان میں سے چار کی شادیاں اپنے صرفہ سے کیں۔ یہ خاکروب لڑکیاں تھیں، جو مشرف بہ اسلام ہوئیں۔[46]

....

میری حالت وہی ہے، جو [مارچ میں] بھوپال سے آتے وقت تھی۔ شربت صدر کی ایک شیشی مَیں نے اتفاقیہ پی تو اُس سے فائدہ محسوس ہوا۔ اس سے بلغم ایک کر آسانی سے نکل جاتی ہے۔ مجھے گاہے گاہے دردِ نقرس بھی ہو جاتا ہے۔[47] [لیکن آئندہ تب تک] بھوپال نہ جا سکوں گا، جب تک بچوں کے لیے کوئی معقول انتظام نہ ہو جائے۔[48] دونوں بچے میرے لیے ایک مسئلہ بن گئے ہیں، جس کی سنگینی کو مَیں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔[49]

....

مَیں کس زبان سے اعلیٰ حضرت [نواب بھوپال] کا شکریہ ادا کروں، انھوں نے ایسے وقت میں [میری لائف پنشن پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر کر کے[50]] میری دستگیری فرمائی، جب کہ مَیں چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھا۔ ہندوستان کے مسلمان شرفا میں

۴۵: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، ۵۲۴
۴۶: بنام امراؤ سنگھ، ۱/۷/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۴۲
۴۷: بنام نذیر نیازی، ۲۴/۵/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۲۸
۴۸: ایضاً
۴۹: بنام راس مسعود، ۳۰/۵/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۲۹
۵۰: بنام نذیر نیازی، ۱/۶/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۳۲

کون ہے، جو اعلیٰ حضرت کا ان کے دُودمانِ عالی کا ممنونِ احسان نہیں ہے۔[۵۱]

اَب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔[۵۲]

مجھے کبھی کبھی ملیریا بھی ہو جاتا ہے، چند روز کونین کھاؤں تو رُکا رہتا ہے،، چھوڑ دوں تو پھر ہو جاتا ہے۔ گذشتہ ماہ میں دو تین دفعہ ایسا ہوا ہے۔[۵۳]

....

یہ حکومت کا فرض تھا کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے مابین بنیادی اختلاف پر مسلم فرقے کی عرض داشت کا انتظار کیے بغیر انتظامیہ کی جانب سے دست اندازی کرتی۔ میرے اس خیال کو سکھوں کے معاملے میں حکومت کے رویے سے تقویت پہنچی کہ ۱۹۱۹ء تک یہ فرقہ انتظامی و انصرامی طور پر ایک علیحدہ سیاسی اکائی شمار نہیں کیا جاتا تھا، لیکن بعد میں سکھوں کی رسمی عرض داشت کے بغیر اور لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے باوجود کہ سکھ ہندو ہیں، ان کی جداگانہ سیاسی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا۔[۵۴]

اسلام لازمی طور پر ایک مذہبی فرقہ ہے، جس کی حدود کی مکمل طور پر نشان دہی ہو چکی ہے، یعنی آنحضرتؐ کے خاتم المرسلین ہونے پر ایمان۔ یہ ایمان فی الحقیقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین صحیح حدِ فاصل قائم کرتا ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے دو ہی راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ بے جھجک بہائیوں کا راستہ اختیار کر لیں یا اسلامی عقیدہ میں ختم نبوت کی تاویلات سے گریز کریں اور اس عقیدہ اور اس کے لوازم پر ایمان لائیں۔ قادیانی مذہبی اور سماجی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے سیاسی طور پر دائرہ اسلام میں رہنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں حکومت کو علیحدگی کے لیے درخواست دینے کے سلسلے میں قادیانی کبھی پہل نہیں کریں گے۔ مسلم فرقہ ان کو فوراً علیحدہ کرنے کے مطالبے میں بالکل حق بجانب ہو گا۔ اگر گورنمنٹ اس مطالبے کو فوراً قبول نہیں کرتی تو گویا ہندوستانی مسلمانوں کو اس شک وشبے میں ڈالنے پر مجبور کیا جائے گا کہ برطانوی حکومت نے گویا اس

۵۱: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۵/۳۰ء، چہارم، ۱۳۰

۵۲: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۶/۱ء، چہارم، ۱۳۲

۵۳: ایضاً

۵۴: Statesman، ۱۹۳۵/۶/۱۰ء، چہارم، ۱۳۵

نئے مذہب کو کسی وقت کام میں لانے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔[۵۵]

....

کل اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کا تار تعزیتی آیا تھا اور آج سردار صلاح الدین سلجوقی اعلیٰ حضرت کا زبانی پیغام لائے ہیں۔ بہت حوصلہ افزا اور دل خوش کن پیغام ہے۔[۵۶]

لارڈ لوتھین کا خط ابھی لندن سے آیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں، رھوڈز لیکچرز کے لیے کب آؤ گے، [لیکن] اب بچوں کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔ ان کی ماں کی وصیت ہے کہ ان بچوں کو ایک دِن کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کرنا۔[۵۷]

مَیں اِن شاء اللہ وسط جولائی تک بھوپال پہنچوں گا، جاوید کو ہمراہ لانا ہوگا۔ علی بخش بھی ہمراہ ہوگا۔[۵۸] وہاں بغرضِ علاج ڈیڑھ ماہ قیام رہے گا۔[۵۹] ۱۶ر کی صبح دہلی پہنچوں گا۔ وہاں تمام دِن قیام رہے گا، تاکہ جاوید دہلی دیکھ لے۔[۶۰]

....

یہ دوا، جو مَیں نے اب استعمال کی ہے، حکیم صاحب کی تمام پہلی دواؤں سے بہتر ہے۔ میری صحت بہت اچھی ہے، گلے پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔[۶۱]

مَیں یہاں بھوپال میں بغرضِ علاجِ برقی مقیم ہوں اور اگست کے آخر تک علاج جاری رہے گا۔ بہ نسبت سابق حالت بہتر ہے اور ڈاکٹر صاحبان یقینی امید دِلاتے ہیں کہ آواز عود کر آئے گی۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اب ذرا صحت اچھی ہو لے تو اِن شاء اللہ اس کتاب [مقدمۃ القرآن] کو لکھنا شروع کروں گا۔ اسی سال کے دَوران میں امید ہے، صورِ اسرافیل بھی ختم ہو جائے گی۔ اب زندگی میں کوئی دلچسپی مجھ کو نہیں رہی، صرف جاوید و منیرہ کی خاطر زندہ ہوں۔ انگلستان آنا بھی اب ممکن نہیں رہا۔ ان کی ماں کی آخری وصیت بھی یہ تھی کہ جب تک یہ دونوں بچے بالغ

۵۵: Statesman، ۱۹۳۵/۶/۱۰ء، چہارم، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷

۵۶: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۶/۱۵ء، چہارم، ۱۳۹ ۵۷: ایضاً

۵۸: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۶/۲۴ء، چہارم، ۱۴۰ ۵۹: بنام راغب احسن، ۱۹۳۵/۷/۶ء، چہارم، ۱۴۸

۶۰: بنام سید نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۷/۱۳ء، چہارم، ۱۴۹ ۶۱: بنام سید نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۷/۵ء، چہارم، ۱۴۳

نہ ہو جائیں، ان کو اپنے سے جدا نہ کرنا۔[۶۲]

....

لاہور سے فساد کی خبریں آ رہی ہیں، ملٹری نے فائر کر دیے تھے۔ آج کی خبر ہے کہ دس مسلمان مارے گئے، زخمیوں کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ ملٹری اور پولیس کے آدمی بھی زخمی ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ مسجد شہید گنج کے انہدام کے سلسلے میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ انگریزی تدبر کے اَب آخری دِن ہیں۔[۶۳]

....

مَیں بغرضِ علاجِ برقی بھوپال میں مقیم ہوں اور اگست کے آخر تک یہیں رہوں گا۔ میری صحت عامہ پہلے کی نسبت بہت اچھی ہے اور آواز میں بھی کسی قدر فرق ہے۔ امید ہے کہ اس دفعہ کے علاج سے بہت فائدہ ہوگا۔ رُبِ شہتوت کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا، لیکن بعض لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ مفید ہے۔ بہرحال، آزمانے پر معلوم ہوگا۔[۶۴]

صحت خوب ترقی کر گئی ہے، آواز میں بھی فرق ہے۔ امید ہے، اب کے علاج سے فائدہ ہوگا۔ شاید ایک دفعہ اَور بھوپال آنا پڑے گا۔[۶۵]

مَیں یہاں حمیدیہ لائبریری اور بعض پرائیویٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا، الحمدللہ بہت سی باتیں مل گئیں۔ اس مطالعے سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا۔[۶۶]

مَیں ۲۸ر اگست کی شام کو سات بجے یہاں [بھوپال] سے روانہ ہو کر ۲۹ر کی صبح آٹھ بجے دہلی پہنچوں گا۔ دن بھر ریلوے اسٹیشن پر قیام رہے گا، رات کی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہو کر ۳۰ر کی صبح اِن شاء اللہ لاہور [پہنچوں گا]۔[۶۷]

....

لاہور پہنچتے ہی مجھے زکام ہو گیا تھا، جو تین دِن رہا۔ بہیدانہ اور شربت بنفشہ پینے سے بلغم پک گئی ہے، مگر ذرا دِقت سے نکلتی ہے۔ بعض دفعہ بلغم نکالنے کی کوشش میں وہ حالت یا

۶۲: بنام تاثیر، ۲۲/۷/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۵۵
۶۳: ایضاً، ۶۳-۶۴
۶۴: بنام ناموس منعمی، ۵/۸/۱۹۳۵ء، چہارم، ۶۳-۶۵
۶۵: بنام نذیر نیازی، ۱۵/۸/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۶۷
۶۶: بنام سلیمان ندوی، ۲۰/۸/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۶۹
۶۷: بنام نذیر نیازی، ۲۴/۸/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۷۵

اس کا خفیف سا پر تو پیدا ہو جاتا ہے، جس کو حکیم صاحب نے ہلکا سا دمہ بتایا تھا۔ کسی شخص نے کہا ہے کہ چاندی کا کشتہ، جو لیموں میں تیار کیا جائے، چالیس روز تک کھایا جائے تو آواز عود کر آئے گی۔[۶۸]

مَیں نے کل سے انگریزی دوا کا استعمال شروع کیا، جس سے کھانسی کم ہوگئی ہے، مگر بلغم ابھی تک نکلتی ہے، گو کسی قدر کم دِقت کے ساتھ۔ بھوپال میں دو دفعہ پھیپھڑوں کا امتحان کرایا تھا، معلوم ہوا کہ پھیپھڑے بالکل صاف ہیں۔ کل پھر معائنہ کرایا تو یہاں کے ڈاکٹر کا نتیجہ بھی یہی تھا کہ پھیپھڑے بالکل صاف ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلغم کا سر چشمہ کوئی اَور ہے۔[۶۹]

....

کھانسی بہت کم ہوگئی ہے، بلکہ جاتی رہی ہے۔ انگریزی دوا سے بہت فائدہ ہوا۔ زرد رنگ کی جمی ہوئی [بلغم]، جو پہلے آتی تھی، اب نہیں آتی، البتہ وہ معمولی بلغم جو زکام سے پہلے آتی تھی، ابھی آتی ہے۔ مختصراً یہ کہ جیسا مَیں بھوپال سے آتے وقت تھا، اب وہی حالت عود کر آئی ہے۔ کل دوبارہ معائنہ کرایا تھا، خون کا دباؤ نارمل ہے اور پھیپھڑوں کی حالت بالکل درست ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلغم اس نالی میں پیدا ہوتی ہے، جس کا مقام، بقول ڈاکٹروں کے، پھیل گیا ہے۔[۷۰]

....

مولانا حالی کی سالگرہ کی تاریخ ۲۶، ۲۷ اکتوبر مقرر ہوئی ہے۔ مَیں غالباً ۲۵ یا ۲۴ اکتوبر کو وہاں پہنچ جاؤں گا۔ غالباً چودھری محمد حسین اور جاوید بھی ساتھ ہوں گے۔[۷۱] چند اشعار فارسی مَیں نے لکھے ہیں، جو اعلیٰ حضرت [نواب حمید اللہ خاں، والیِ بھوپال] کی تشریف آوری کے موقع پر جلسے کے آغاز سے پہلے پڑھ دیے جائیں تو خوب رہے گا۔ کاش! مَیں خود پڑھ سکتا، گلے کی خرابی سے یہ بات ممکن نہیں۔[۷۲]

....

۶۸: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۹/۵ء، چہارم، ۱۷۷
۶۹: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۹/۱۰ء، چہارم، ۱۸۱
۷۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۹/۱۲ء، چہارم، ۱۸۷
۷۱: ایضاً، ۱۸۹
۷۲: بنام سجاد حسین، ۱۹۳۵/۹/۱۲ء، چہارم، ۱۹۰

اس دوا سے اِس وقت تک کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ حالت وہی ہے، جو پہلے تھی۔ میرے خیال میں جو دوا اس سے پہلے مَیں نے کھائی تھی، وہ نسبتاً اس سے زیادہ مفید تھی۔ اگر صرف قوتِ جسمانی کے لیے کوئی جوہر حکیم صاحب تیار کریں تو شاید باقی دونوں کے لیے مفید ہوگا، مگر جو دوا پھر وہ تجویز کریں، اس کا ایک نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہر صبح فراغت کھل کر ہو جایا کرے۔[۷۳]

میرے ایک دوست، جو یہاں کے سادات میں سے ہیں، مرضِ ذیابیطس کے پرانے بیمار تھے، حال میں تندرست ہو کر ویانا سے واپس آئے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ دورانِ علاج میں انھوں نے اپنے ڈاکٹر سے میرے مرض کا ذکر بھی کیا تھا، جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر وہ بیمار یہاں آ جائے تو مَیں گارنٹی کرتا ہوں کہ بالکل تندرست ہو جائے گا۔ شاہ صاحب فروری میں پھر ویانا جانے والے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ مَیں بھی اُن کے ساتھ چلوں اور وہاں چل کر علاج کراؤں۔ فی الحال میری صحت ترقی کر رہی ہے، آواز میں بھی قدرے امپروومنٹ ہے۔ ڈاکٹر عبدالباسط نے جو فوٹو میرے سینے کا لیا تھا، اسے ڈاکٹر رحمٰن ویانا بھیجنے والے تھے۔ معلوم نہیں، ابھی تک بھیجا ہے یا نہیں۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب (عبدالباسط) کو خط لکھ کر دریافت کیا ہے، وہاں سے اکسپرٹ اوپنین آ جانے پر آخری فیصلہ کروں گا۔[۷۴]

....

کل سے کوٹھی کے بقایا حصے کی تعمیر ہوگی۔ امید کہ پانی پت جانے تک کام ختم ہو جائے گا۔[۷۵]

چھوٹی بچی منیرہ کے لیے استانی کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شریف زادی، جو قرآن اور دینی کتابیں پڑھا سکتی ہو، مل جائے تو غنیمت ہے۔ بیوہ اور بے اولاد ہو تو سبحان اللہ۔ تمام عمر میرے گھر میں گزار دے۔ گھر کا انتظام کرے اور بچوں کی تربیت کرے۔ عمر چالیس سال ہو یا اس سے کم و بیش۔ اس کے علاوہ ایک باورچی کی بھی ضرورت ہے، جو ہندی کھانا پکانا

۷۳: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۹/۲۷ء، چہارم، ۱۹۴ ۷۴: بنام راس مسعود، ۱۹۳۵/۱۰/۲ء، چہارم، ۱۹۶-۱۹۷
۷۵: ایضاً، ۱۹۷

جانتا ہو اور دیانت دار ہو۔[۷۶]

تہذیبِ نسواں میں اشتہار دیا تھا، جس کے جواب میں ایک خط علی گڑھ سے پھر آیا ہے۔ گھر کا تمام انتظام بھی استانی صاحبہ کے سپرد ہوگا۔ ان کے فرائض [میں] بچوں کی اخلاقی اور دینی تربیت اور نگہداشت۔ لڑکا گیارہ سال کا ہے، اسکول جاتا ہے، لڑکی پانچ سال کی ہے۔ سب گھر کا چارج انھیں کو دیا جائے گا اور زنان خانے کے تمام اخراجات انھیں کے ہاتھ سے ہوں گے۔ کسی شریف گھر کی ہو، جو گردشِ زمانہ سے اس قسم کا کام کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ دینی اور اخلاقی تعلیم دے سکتی ہو، یعنی قرآن اور اردو پڑھا سکتی ہو، عربی اور فارسی بھی جانے تو اَور بھی بہتر ہے۔ سینا پرونا وغیرہ بھی جانتی ہو۔ کھانا پکانا جانتی ہو، اس سے میری مراد یہ نہیں کہ اس سے باورچی کا کام لیا جائے گا۔[۷۷]

....

صبح نو بجے حلوے کے ساتھ دوا کھانا غیر ممکن ہے کہ مَیں اگر حلوہ کھا لوں تو دِن بھر بھوک نہیں لگتی اور میرے لیے حلوہ سخت قابض ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کھانا ہمیشہ گیارہ بجے کھاتا ہوں۔ اگر خوراک میں تبدیلی کی جائے تو تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔[۷۸]

....

من کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا، لاہور کا ہوں، اس وقت بقائمی ہوش و حواسِ خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ چونکہ میری ہر دو اَولاد نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور من مقر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی، اس لیے مَیں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کی بعد اگر میری اَولاد مذکورہ نابالغ رہیں تو ان کی جائداد اور ذات کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے:

(۱) خواجہ عبدالغنی، ماموں حقیقی نابالغان،

(۲) شیخ اعجاز احمد، سب جج، برادر زادہ من مقر،

۷۶: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۹/۲۷ء، چہارم، ۱۹۴
۷۷: بنام غلام السیدین، ۱۹۳۵/۱۰/۸ء، چہارم، ۱۹۹
۷۸: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۵/۱۰/۹ء، چہارم، ۲۰۰

(۳) چودھری محمد حسین ایم اے، سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور،

(۴) منشی طاہر الدین، جو کئی سال سے میرے کلارک رہے ہیں اور ان کی شرافت و دیانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔

اس وصیت کی رُو سے مَیں ان جملہ حضرات کو نابالغان کی ذات و جائداد کا ولی مقرر کرتا ہوں۔ تمام امورِ متعلقہ ذات و جائداد نابالغان کا انتظام اولیا مذکورہ کثرتِ رائے سے کیا کریں گے، لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات و جائداد کا ولی ہوگا اور اس کی جائداد و ذات کے متعلقہ انتظامات خود بطور ولی کرے گا۔ اگر ان اولیا مقرر کردہ میں سے کوئی دستبردار ہو جائے یا فوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے ناقابل ہو جائے تو اس صورت میں باقی اولیا کو اختیار ہوگا کہ کثرتِ رائے سے اس کا جانشین مقرر کرلیں۔ اگر کسی معاملے میں اولیاے مذکورہ کی رائے مساوی ہو تو صدر انجمن حمایت اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو، اسی پر عمل کیا جائے گا اور اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

اس وقت، جو ملکیت کی چیزیں ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

کتب فلسفہ و لٹریچر وغیرہ: ان میں سے چند کتب، یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے معہ مسودات، مثنوی مولانا روم، فارسی و انگریزی مرتبہ ڈاکٹر نکلسن، دیوانِ مرزا عبدالقادر قلمی، مرآۃ المثنوی (مولانا روم، مطبوعہ حیدرآباد)، اپنے پڑھنے کا قرآن شریف باقی اور مسودات و کاغذات مَیں نے جاوید کو بطور یادگار دے دیے ہیں۔ باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں رکھ دی جائیں۔ باقی میرا اسباب، مثلاً دو قالین بررنگ سرخ و دری و صوفہ و کرسیاں و بکس اور پہننے کے کپڑے ہیں، ان کی نسبت میری وصیت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد میرے پہننے کے تمام کپڑے غربا میں تقسیم کر دیے جائیں۔

مکرر آنکہ

اگر نابالغان کے فائدے کی خاطر یا جائداد کے انتظام یا کسی اور جائداد وغیرہ کے

لیے اولیا کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ کثرتِ رائے سے بینک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں۔

دیگر میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ مَیں عقائدِ دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں، عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہوں۔ بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے ورثا کا اور اولیائے مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا لحاظ کریں اور رشتہ ناطہ میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں۔[۷۹]

جاوید کو میری عام وصیت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے۔ اپنے رشتے داروں کے ساتھ خوش گوار تعلقات رکھے۔ میرے بڑے بھائی کی اولاد سب اس سے بڑی ہے، ان کا احترام کرے اور اگر ان کی طرف سے کبھی سختی بھی ہو تو برداشت کرے۔ دیگر رشتے داروں کو اگر اس سے مدد کی ضرورت ہو اور اس میں ان کی مدد کی توفیق ہو تو اس سے کبھی دریغ نہ کرے۔ جو لوگ میرے احباب ہیں، ان کا ہمیشہ احترام ملحوظ رکھے اور ان سے اپنے معاملات میں مشورہ کر لیا کرے۔ باقی دینی معاملات میں مَیں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ مَیں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا، جو ارکانِ دین میں سے نہیں ہیں، سلف صالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے۔ جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اس راہ پر گامزن رہے اور اس بدقسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو دینی عقائد کے نئے فرقے مختص کر لیے ہیں، ان سے احتراز کرے۔ بعض فرقوں کی طرف لوگ محض اس واسطے مائل ہوتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے دنیوی فائدہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ طریقہ حضراتِ اہل سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہیے اور ائمہ اہلِ بیت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہیے۔[۸۰]

....

مَیں گذشتہ اٹھارہ ماہ سے علیل ہوں، سفر بہت کم کرتا ہوں۔ ہر تیسرے مہینے بھوپال جاتا

۷۹: بحوالہ زندہ رُود، ۶۱۵ ۸۰: زندہ رُود، ۶۱۶-۶۱۷

ہوں، وہاں برقی علاج ہے، جس سے کچھ فائدہ ہے۔ اب ویانا (آسٹریا) جانے کی فکر میں ہوں[۸۱]۔ ویانا (آسٹریا) جانے کا خیال ہے، اگر گیا تو فروری یا اپریل ۳۶ء میں جاؤں گا۔[۸۲]

خدا کے فضل و کرم سے میری صحت اچھی ہے اور آواز میں بھی امپروومنٹ ہے۔ بلغم بھی اَب بہت کم ہوگئی ہے، صبح کے وقت البتہ آتی ہے۔ مَیں نے ڈاکٹر انصاری اور سید راس مسعود سے خط کتابت کی ہے اور دونوں حضرات نے ویانا جانے کے خیال کی تائید کی ہے۔[۸۳]

....

اب...... [اکبر شاہ نجیب آبادی] کے لیے ایک مضمون لکھنا باقی ہے، یعنی مسئلہ جہاد کی تاریخ ہندوستان میں۔ مولوی چراغ علی مرحوم کی انگریزی کتاب، سرسید احمد کی تصانیف، مرزا غلام احمد قادیانی کی تصانیف اور ان کے علاوہ علما کے فتوے، جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے، اس مضمون کے لکھنے میں مدد دیں گے۔ شاید ٹیپو سلطان کے زمانے سے جہاد کے مسائل کی نئی تفسیریں شروع ہوئی ہیں۔[۸۴]

....

حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ماڈرن ریویو میں دو مضمون شائع کیے ہیں، جن میں سے ایک کا مقصود غالباً قادیانیوں کی حمایت ہے۔ ان کے جواب میں ان شاء اللہ مَیں بھی کچھ لکھوں گا۔[۸۵]

....

راولپنڈی میں کیا، تمام پنجاب میں مسجد [شہید گنج] کی بازیابی کے لیے جوش و خروش بڑھ رہا ہے۔ خداے تعالیٰ مسلمانوں پر اپنا فضل کرے۔[۸۶]

....

اعلیٰ حضرت نواب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اَور طرف نگاہ کرنا

۸۱: بنام محفوظ علی بدایونی، ۱۴/۱۰/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۰۲
۸۲: بنام نذیر نیازی، ۱۵/۱۰/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۰۲-۲۰۳
۸۳: بنام عبدالباسط، ۱۸/۱۰/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۰۴
۸۴: بنام اکبر شاہ، ۱۲/۱۱/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۲۳-۲۲۵
۸۵: بنام مسعود عالم، ۲۸/۱۱/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۳۸
۸۶: بنام راس مسعود، ۱۰/۱۲/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۴۳

آئینِ جواں مردی نہیں[87] [کیونکہ] اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لیے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ مجھے [ہز ہائینس آغا خاں کی طرف سے] اس رقم مزید کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے اور مَیں بے حد تذبذب کی حالت میں ہوں۔ بہر حال، مَیں نے ہز ہائینس آغا خاں کو شکریے کا خط لکھ دیا ہے، گو اس میں مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مطلق نہیں کیا گیا اور اخلاقاً مجھ کو ایسا کرنے کی جرأت بھی نہ ہونی چاہیے تھی۔ مَیں ایک اَور تجویز پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہز ہائینس آغا خاں یہ پنشن جاوید کو عطا کر دیں، اُس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو جائے یا جس وقت تک ہز ہائینس مناسب تصور کریں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اس کی تعلیم کی طرف سے بہ کُلی اطمینان ہو جائے۔[88]

....

سید مسعود صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ فوٹو آسٹریا بھیج دیے گئے،[89] [لیکن] ڈاکٹر مظفر علی صاحب کا خط ویانا (آسٹریا) سے آیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ بھوپال سے کوئی کاغذات ان کو موصول نہیں ہوئے۔[90]

۸۷: بنام راس مسعود، ۱۸/۹/۱۹۳۵ء، چہارم، ۱۹۳
۸۸: بنام راس مسعود، ۱۱/۱۲/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۴۶
۸۹: بنام عبدالباسط، ۷/۱۲/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۳۸
۹۰: بنام عبدالباسط، ۱۳/۱۲/۱۹۳۵ء، چہارم، ۲۴۸

۱۹۳۶ء

مَیں خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ ایک ایرانی الاصل سید زادے کی دوا نے بہت فائدہ کیا۔ کیا عجب کہ آواز پھر عود کر آئے۔ اس کا دعویٰ تو یہی ہے۔ اسی واسطے مَیں نے چند روز کے لیے بھوپال جانا ملتوی کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ سردی بھی بہت تھی، غالباً جنوری کے آخر میں جاؤں گا۔[1]

....

مجھے ایک ایسی خاتون کی تلاش ہے، جس پر مکمل اعتماد کر سکوں۔ یہاں لیڈی انسپکٹر آف اسکولز (مس خدیجہ بیگم) نے ایک دو خواتین کے نام تجویز کیے ہیں اور مَیں [ان کے] متعلق ضروری معلومات کر رہا ہوں۔[2]

....

مضمون [Islam & Ahmadism] کا آخری پروف مَیں نے آج بھیجا ہے، امید کہ آج شام یا کل شام تک چھپ جائے گا، اِن شاء اللہ[3] یورپ کے لیے ایک علیحدہ ایڈیشن پانچ سو کی تعداد میں شائع کیا جائے گا۔[4] [علاوہ ازیں] شعبۂ تبلیغ و اشاعت مسجد مبارک اسلامیہ کالج لاہور کی طرف سے اعلان ہوا کہ 'اسلام اور احمدزم' کے اردو ترجموں کی کاپیاں لاکھوں کی تعداد میں شائع کی جائیں اور مفت تقسیم کی جائیں۔[5]

مَیں نے اپنی چند فارسی نظموں میں اپنے ہندو ہم وطنوں کو قدیم ہندو رشیوں کی اصلی

۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۱/۳ء، چہارم، ۲۵۳
۲: بنام غلام السیدین، ۱۹۳۶/۱/۱۱ء، چہارم، ۲۵۵
۳: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۱/۱۷ء، چہارم، ۲۵۷
۴: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۱/۲۸ء، چہارم، ۲۶۲
۵: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۲/۱۵ء، چہارم، ۲۸۳-۲۸۴

تعلیمات یاد دِلائی ہیں، وہ اسے نظر انداز کرتے ہیں۔[6]

....

یہاں کے کالجوں کے مسلمان طلبہ کی ایک جمعیت ہے، انھوں نے ایک اپیل شائع کی تھی کہ اقبال کے لیے جمعہ کے روز مسجدوں میں دعا کی جائے۔ اس اپیل سے اخباروں اور ان کے ناظرین کو غلط فہمی ہوئی[7] جس کی وجہ سے میرے دوستوں کو تردّد ہوا[8]، [حالانکہ] مَیں خدا کے فضل سے بہ نسبت سابق، بہت تندرست ہوں، آواز میں بھی اَب کے نمایاں فرق ہے۔[9]

....

مَیں یہاں سے ۲۹/فروری کی شب کو فرنٹیر میل سے چلوں گا یا دوسری ٹرین میں، جو اس کے قریب ہی لاہور سے چلتی ہے۔ بہرحال، یکم مارچ کی صبح کو دہلی پہنچ کر دِن بھر وہیں قیام کروں گا۔ چار پانچ بجے دوپہر جو ٹرین دہلی سے بھوپال کی طرف جاتی ہے، اس میں سوار ہو کر ۲/مارچ کو بھوپال پہنچوں گا۔[10] اِن شاء اللہ بھوپال سے واپسی پر قونصل خانے میں ایک آدھ روز قیام رہے گا کہ سردار صلاح الدین اصرار کرتے ہیں۔[11]

مَیں چند روز [۲/مارچ سے] اپنے گلے کے برقی علاج کے لیے [بھوپال میں] مقیم ہوں، [آج ۱۷/مارچ تک] معمولی سا افاقہ ہے، لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ میری صحت کُلی طور پر خراب ہو چکی ہے اور مجھے اپنے بقیہ ماندہ دِنوں میں حد درجہ محتاط رہنا ہوگا۔[12]

بوجہ علالت رھوڈز لیکچرز فی الحال منسوخ کر دیے ہیں۔[13] اردو کلام کا ایک اَور مجموعہ بعنوان ضربِ کلیم، مجھے امید ہے، اپریل یا مئی میں شائع ہوگا۔[14]

۳/اپریل کی رات ۳/بجے کے قریب مَیں نے سر سید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔

۶: بنام امراؤ سنگھ، ۱۹۳۶/۱/۳۱ء، چہارم، ۲۶۲

۷: بنام دریابادی، ۱۹۳۶/۴/۲۸ء، چہارم، ۳۱۰

۸: بنام امراؤ سنگھ، ۱۹۳۶/۳/۲۴ء، چہارم، ۳۰۳

۹: بنام غلام السیدین، ۱۹۳۶/۴/۱۸ء، چہارم، ۳۰۷

۱۰: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۲/۲۵ء، چہارم، ۲۸۸

۱۱: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۲/۱۹ء، چہارم، ۲۸۶

۱۲: بنام فضل شاہ، ۱۹۳۶/۳/۱۷ء، چہارم، ۳۰۰

۱۳: بنام عبدالجمیل، ۱۹۳۶/۳/۶ء، چہارم، ۲۹۲

۱۴: بنام فضل شاہ، ۱۹۳۶/۳/۱۷ء، چہارم، ۳۰۰

پوچھتے ہیں، 'تم کب سے بیمار ہو؟' مَیں نے عرض کیا، 'دو سال سے اوپر مدت گزر گئی ہے'۔ فرمایا، 'حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کرو'۔ میری آنکھ اُسی وقت کھل گئی اور اس عرض داشت کے چند شعر، جو اَب طویل ہوگئی ہے، میری زبان پر جاری ہو گئے۔[15] کُل ساٹھ شعر ہوئے۔[16]

مَیں ان شاء اللہ ۹/اپریل کی شام کو ساڑھے سات بجے لاہور پہنچ جاؤں گا۔[17]

....

استانی کا اب تک کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ ایک نوجوان لڑکی، جو خاصی تعلیم یافتہ ہے اور دینی تعلیم بھی رکھتی ہے، اتالیقی قبول کرتی ہے، مگر شرط یہ کرتی ہے کہ نکاح کرلو۔ شاید کچھ عرصے کے لیے علی گڑھ بھی رہ چکی ہے۔ بہت سمجھایا، نہیں مانتی۔ آخر اس کے ساتھ [گفت و شنید] بند کرنی پڑی۔[18]

....

میری صحت خدا کے فضل سے بحال ہوگئی ہے، بلکہ مَیں کہہ سکتا ہوں کہ اس بیماری سے پہلے جو حالت تھی، وہ عود کر آئی ہے؛ البتہ آواز میں ابھی اتنی ترقی نہیں ہوئی، جتنی کہ امید تھی، گو پہلے سے بہتر ہے۔[19]

....

مجھے اب اسلامی فلسفہ اور تصوف میں پہلی سی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ میرے خیال میں دنیا کی معاشی اور ثقافتی تاریخ میں اسلامی فقہ، یعنی اُن امور کے متعلق قانون، جن کو معاملات کہا جاتا ہے، محض تعقل و تفکر کی بہ نسبت کہیں زیادہ اہم ہے، جو اسلام میں تفرقہ پیدا کرنے کا غیر شعوری سبب ثابت ہوا۔[20]

....

۱۵: بنام الیاس برنی، ۱۹۳۶/۲/۱۳ء، چہارم، ۳۲۵
۱۶: بنام راس مسعود، ۱۹۳۶/۲/۲۹ء، چہارم، ۳۴۴
۱۷: بنام نذیر نیازی، ۱۹۳۶/۳/۳۱ء، چہارم، ۳۰۵
۱۸: بنام غلام السیدین، ۱۹۳۶/۴/۱۸ء، چہارم، ۳۰۸
۱۹: بنام راس مسعود، ۱۹۳۶/۵/۲ء، چہارم، ۳۱۰
۲۰: بنام عمر الدین، ۱۹۳۶/۵/۸ء، چہارم، ۳۱۱

آج کل مسٹر محمد علی جناح لاہور آئے ہوئے ہیں اور یہاں کی مختلف پولیٹیکل پارٹیوں میں اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں[۲۱]۔ امید ہے کہ پنجاب کی پارٹیاں، بالخصوص احرار و اتحادِ ملت تھوڑی بہت نزاع و کشمکش کے بعد انجامِ کار...... [جناح] کے ساتھ شامل ہو جائیں گی[۲۲]۔

امید ہے کہ [مسلم لیگ کے پارلیمنٹری] بورڈ کی طرف سے شائع ہونے والے بیان میں تمام اسکیم کی پوری تفصیل موجود ہوگی اور ساتھ ہی اب تک اس اسکیم کے خلاف جتنے اعتراضات کیے گئے ہیں، ان کا جواب بھی موجود ہوگا۔ اس بیان میں لگی لپٹی رکھے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ حیثیت کا ہندوؤں اور حکومت دونوں سے متعلق ایک واضح اور صاف صاف اعلان ہونا چاہیے۔ اس بیان میں یہ انتباہ بھی موجود ہونا چاہیے کہ اگر مسلمانانِ ہند نے موجودہ اسکیم کو اختیار نہ کیا تو وہ نہ صرف، جو کچھ گذشتہ پندرہ برس میں حاصل کر چکے ہیں، اُسے ہی کھو دیں گے، بلکہ اپنا شیرازہ خود اپنے ہاتھوں درہم برہم کر کے اپنے لیے خسارے کا باعث ہوں گے۔ اسلامی اوقاف (جیسا کہ مسجد شہید گنج نے ضرورت کا احساس کرایا ہے) سے متعلق قانونِ شریعت سے متعلق مسائل پر بھی بیان میں توجہ کرنے کی ضرورت ہے[۲۳]۔

مرکزی اسمبلی کے لیے بالواسطہ انتخاب نے ہمارے لیے یہ بالکل لازمی و لابدی کر دیا ہے کہ صوبائی اسمبلیوں کے مسلمان نمائندے ایک کل ہند پالیسی اور پروگرام پر متحد ہو جائیں، تاکہ وہ مرکزی اسمبلی میں صرف ایسے لوگوں کو بھیج سکیں، جو مرکزی اسمبلی میں اسلامی ہند کے اُن مرکزی مسائل کی تائید و حمایت کریں، جو ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کی حیثیت سے مسلمانوں سے متعلق ہوں۔ جو لوگ اِس وقت صوبائی پالیسی اور پروگرام کے حامی ہیں، وہی آئین میں مرکزی اسمبلی کے لیے بالواسطہ انتخاب کے طریق کو جزوِ آئین بنوانے کے ذِمے دار ہیں۔ بلاشبہ ایک غیر ملکی حکومت کی مصلحتوں کا یہی تقاضا تھا، اب جب

۲۱: بنام راس مسعود، ۲/۵/۱۹۳۶ء، چہارم ۳۱۱ ۲۲: بنام جناح، ۲۳/۵/۱۹۳۶ء، چہارم ۳۱۲

۲۳: بنام جناح، ۹/۶/۱۹۳۶ء، چہارم ۳۱۹-۳۲۰

کہ قوم بالواسطہ انتخابات کی مصیبت کا علاج لیگ اسکیم کے مطابق ایک کُل ہند طریقِ انتخابات کے ذریعے، جسے تمام صوبائی امیدواروں کو لازماً اختیار کرنا ہوگا، کرنا چاہتی ہے تو پھر وہی سور ما دوبارہ ایک غیر ملکی حکومت کے اشارے پر قوم کو اپنی شیرازہ بندی کی کوششوں میں ناکام بنانے کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔[۲۴]

....

افسوس ہے کہ ضربِ کلیم کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق ہوئی۔ کل آخری پروف دیکھ کر پریس میں بھیجے ہیں۔ امید کہ جون کے آخر تک شائع ہو جائے گی۔[۲۵]

لاہور آ کر خیال ہوا کہ [بھوپال میں شروع کی گئی] چھوٹی سی نظم، اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہے۔ الحمدللہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہرحال، اس کا نام ہوگا، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ ضربِ کلیم کی طباعت کے بعد اس کی کتابت شروع ہوگی۔[۲۶]

۴/اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی، اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ (کھنک) عود کر رہا ہے، جو انسانی آواز کا خاصہ ہے؛ گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے، جسم میں بھی عام کمزوری ہے[۲۷] [اور] مسلسل علالت کے سبب گذشتہ دو سال سے عملاً ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں[۲۸]۔ فی الحال بھوپال جانے کا قصد نہیں ہے اور کابل جانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں۔[۲۹]

....

(ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ) مسلمانوں کی وفاداریاں اوّل اوّل کس طرح پیدا ہوئیں اور ان وفاداریوں نے بالآخر کس طرح احمدیت کی شکل میں اپنے لیے ایک الہامی اساس فراہم کر لی۔ یہ انکشاف میرے لیے انتہائی باعثِ تعجب تھا کہ تعلیم یافتہ

۲۴: بنام جناح، ۱۹۳۶/۶/۹ء، چہارم، ۳۲۰
۲۵: بنام عبدالوحید، ۱۹۳۶/۶/۱۱ء، چہارم، ۳۲۱
۲۶: بنام راس مسعود، ۱۹۳۶/۶/۲۹ء، چہارم، ۳۴۴
۲۷: بنام الیاس برنی، ۱۹۳۶/۶/۱۳ء، چہارم، ۳۲۵
۲۸: بنام جواہر لال، ۱۹۳۶/۶/۲۱ء، چہارم، ۳۳۰
۲۹: بنام عبدالوحید، ۱۹۳۶/۶/۲۲ء، چہارم، ۳۳۳

مسلمان بھی ان تاریخی عوامل کا کوئی شعور نہیں رکھتے، جنھوں نے احمدیت کی تعلیمات کو تشکیل دی۔ میرا ذہن اس بارے میں ہر شبے سے پاک ہے کہ احمدی، اسلام اور ہندوستان، دونوں کے غدار ہیں۔[۳۰]

....

ضروری ہے کہ [بروز بدھ ۲۴/جون ۱۹۳۶ء، ۶/بجے شام[۳۱]] پارلیمنٹری بورڈ کی فوری میٹنگ [میرے غریب خانے (واقع میوروڈ لاہور) پر[۳۲]] منعقد کی جائے اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل تیار کیا جائے۔[۳۳]

سر سکندر حیات، دو ایک روز گزرے، لاہور سے روانہ ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی میں ...... [جناح] سے مل کر بعض اہم امور پر گفتگو کریں گے۔ کل شام [احمد یار خاں] دولتانہ مجھ سے ملے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبران [اس] اعلان کے لیے تیار ہیں کہ 'ان تمام امور میں، جو مسلمانوں سے بحیثیت ایک کُل ہند اقلیت کے متعلق ہیں، وہ لیگ کے فیصلے کے پابند ہوں گے اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم پارٹی کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کریں گے'، بشرطیکہ (صوبائی) لیگ بھی [یہ] اعلان کرنے کو تیار ہو کہ 'وہ مسلم ارکانِ اسمبلی، جو لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی میں پہنچتے ہیں، اس پارٹی سے موالات کریں گے، جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو'۔[۳۴]

....

گولیاں کھاتے ہوئے آج چوتھا روز ہے، ان کے استعمال سے بلغم کا آنا کم ہو گیا ہے، البتہ آواز پر ابھی تک کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ابھی گولیاں باقی پورے ہفتے تک اِن شاء اللہ استعمال کرتا جاؤں گا۔ جواہر مہرہ اور سفوف، شاید اُن کا استعمال گولیوں کے استعمال کے بعد ہونا ضروری ہے۔ دودھ، بالائی، دہی اور تُرشی کے استعمال سے تکلیف ہوتی ہے۔ مَیں تُرشی

۳۰: بنام جواہر لال، ۱۹۳۶/۶/۲۱ء، چہارم، ۳۲۹-۳۳۰ ۳۱: بنام عبدالعزیز، ۱۹۳۶/۶/۱۸ء، چہارم، ۳۲۷

۳۲: ایضاً ۳۳: ایضاً

۳۴: بنام جناح، ۱۹۳۶/۶/۲۵ء، چہارم، ۳۳۸-۳۴۰

کے استعمال کا عادی تھا، چونکہ دو سال سے تُرشی کا استعمال نہیں کر سکا، اس واسطے میرا کھانا بالکل بے لطف ہو گیا ہے۔ بھوک کم لگتی ہے، قبض کی بھی شکایت رہتی ہے۔ نقرس کی شکایت ہے، کبھی کبھی اس کا دَورہ ہوتا ہے، مگر زیادہ شدت کے ساتھ نہیں۔[۳۵]

....

ضربِ کلیم یا اعلانِ جنگ زمانۂ حاضر کے خلاف، افسوس کہ ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔ اب چار جولائی کو کتاب کی طباعت ختم ہو گی۔[۳۶]

....

جامعہ ازہر کا ارادہ ہے کہ شودروں میں تبلیغ اسلام کے لیے ایک وفد ہندوستان روانہ کرے اور اس وفد کے متعلق انھوں نے مجھ سے ضروری مشورہ طلب کیا ہے[۳۷]۔ میرا خیال تھا کہ ان کا ہندوستان آنا عام طور پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر اور نیز خود مسلمانوں پر اچھا اثر ڈالے گا۔ ان کے آنے سے مسلمانوں کے تبلیغی جوش میں اضافہ ہونا بہت ممکن ہے۔[۳۸] [علاوہ ازیں] اچھوتوں کا اسلام قبول کرنا ہندوستان کی تاریخ میں (فروغِ اسلام کا) ایک غیر معمولی موقع فراہم کرے گا اور سارے ایشیا میں اسلام کے مستقبل کی تاریخ پر اثر انداز ہو گا، [بشرطیکہ] وفد میں ایسے علمائے دِین شامل ہوں، جو دینِ اسلام سے بخوبی واقف ہوں اور اس کو جدید فکر و تجربہ کی روشنی میں پیش کرنے کے قابل ہوں[۳۹]، [البتہ اب مَیں سمجھتا ہوں کہ] اچھوتوں میں تبلیغ کی غرض سے مصری علما کی جماعت کو ہندوستان بھیجنے کی ضرورت نہیں، اس کے لیے تو ٹھوس کام کی ضرورت ہے، جس کو ہندوستان کے علما ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اگر مصر سے علما کا وفد آیا تو اس کی وجہ سے ہندو مسلم تعلقات پر ناخوش گوار اثر پڑے گا اور ہمارا حقیقی مقصد فوت ہو جائے گا۔[۴۰]

....

۳۵: بنام الیاس برنی، ۱۹۳۶/۶/۲۷ء، چہارم، ۳۴۱ ۳۶: بنام راس مسعود، ۱۹۳۶/۶/۲۹ء، چہارم، ۳۴۳
۳۷: بنام شجاع الدین، ۱۹۳۶/۷/۲ء، چہارم، ۳۴۶-۳۴۵ ۳۸: بنام نیرنگ، ؟/۱۹۳۶/۷ء، چہارم، ۳۵۳
۳۹: بنام مصطفیٰ المراغی، ؟/۱۹۳۶/۷ء، چہارم، ۳۵۵،۳۵۴ ۴۰: بنام مصطفیٰ المراغی، ۱۹۳۶/۹/۵ء، ۳۵۷

یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نئی اصلاحات ملک میں نافذ ہوں گی اور پنجاب لجسلیٹو اسمبلی کے لیے انتخابات تاریخِ مذکورہ سے پہلے عمل میں آ جائیں گے۔ آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے اپنے منشورِ عام میں بعض ایسے حقائق و واقعات کی طرف قوم کی توجہ مبذول کر دی ہے اور آئندہ کا پروگرام بھی سامنے رکھ دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ان واقعات کی تفصیلات سے بے خبری اور قوم کا باہمی تفرقہ کہیں پھر وہ صورت نہ پیدا کر جائے کہ آنے والی اصلاحات سے بھی ہم بحیثیت قوم پورا فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائیں اور جو قومی ترقی فرقہ وار فیصلہ نے ان اصلاحات کے ماتحت ہمارے لیے ممکن الحصول کر دی ہے، اس کا حاصل کرنا ہم سے بعید ہو جائے۔ یہی خدشہ ہے، جسے مدِ نظر رکھ کر مسلم لیگ نے صوبہ جاتی انتخابات میں قوم کی رہنمائی کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ لیگ کی یہ فرض شناسی اس صورت میں بار آور ہو سکتی ہے، جب قوم بھی فرض شناسی سے کام لے اور اس مسئلے میں لیگ کی ہدایات اور اس کے پروگرام سے تمسک کرے۔ مسلم لیگ اور صرف مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبہ جاتی اسمبلی میں جانے والے افراد سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کے محافظ ہوں گے اور ملک کی آئینی ترقی کے لیے سعیِ بلیغ کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔[41]

....

گولیاں ختم ہو گئی ہیں، مگر ان کے استعمال سے بلغم کے اخراج پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ تُرشی ابھی [۲۱/جولائی] تک نہیں کھا سکتا، ہاں دہی اگر میٹھا ہو تو کسی قدر کھا لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جواہر مہرہ اور سفوف کو گولیوں سے پہلے ٹرائی کیا جائے تو شاید بہتر نتائج نکلیں[42]۔ میری صحت عامہ تو اچھی ہے، مگر آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔[43]

....

الحمد للہ کہ قادیانی فتنہ اب پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں، مگر حال کے روشن خیال علما کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

۴۱: بنام مسلمانانِ پنجاب، ۸/۷/۱۹۳۶ء، چہارم، ۳۵۸-۳۵۹ ۴۲: بنام الیاس برنی، ۲۱/۷/۱۹۳۶ء، چہارم، ۳۶۰-۳۶۳

۴۳: بنام تلمذ حسین، ۲۷/۷/۱۹۳۶ء، چہارم، ۳۶۳

مَیں بھی تیسرا بیان اِن شاء اللہ جلد لکھوں گا۔[44]

اِن شاء اللہ موسمِ سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا، جس کا وعدہ مَیں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔[45]

ضربِ کلیم کتاب خانہ طلوعِ اسلام، ۲۵رمیکلوڈ روڈ، لاہور نے خرید لی ہے۔[46]
مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق عن قریب شائع ہوگی۔[47]

....

[مسلم لیگ] پارلیمنٹری بورڈ کا کام زیادہ تیزی سے ستمبر کے بعد شروع ہوگا، جب کہ اُن لوگوں (کی) درخواستیں نامزدگی کے لیے وصول ہو جائیں گی، جو بورڈ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔ بورڈ کا اجلاس ۲۲راگست کو ہونے والا ہے، اس میں نامزدگی کے لیے درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ مقرر ہوگی۔ مَیں نے علالت کی بنا پر استعفا دیا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمام امور سوچ سکوں۔[48]

بورڈ کے ممبر اصرار کر رہے ہیں کہ کچھ دِن کے لیے اسے ملتوی کر دوں۔ بہر حال، اِس ماہ کے اختتام تک مَیں اس کی صدارت سے دستبردار ہو جاؤں گا۔[49]

کلکتہ میں جناح صاحب کی زبردست کامیابی کے بارے میں اخبارات میں پڑھا [ہے]۔[50]

....

اگرچہ مَیں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔[51]

میرے خیال میں [صدر انجمن ترقی اردو کا مستقر] لاہور میں ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی، ان کا میدان پنجاب ہوگا۔ پنجابیوں کو

۴۴: بنام سلیمان ندوی، ۱۹۳۶/۸/۷ء، چہارم، ۳۷۴ ۔ ۴۵: ایضاً

۴۶: بنام مظفر الدین، ۱۹۳۶/۸/۲۰ء، چہارم، ۳۷۸ ۔ ۴۷: بنام مظفر الدین، ۱۹۳۶/۹/۲ء، چہارم، ۳۸۲

۴۸: بنام فوق، ۱۹۳۶/۸/۲۱ء، چہارم، ۳۷۸۔۳۷۹ ۔ ۴۹: بنام راس مسعود، ۱۹۳۶/۸/۲۷ء، چہارم، ۳۸۰

۵۰: بنام زماں مہدی، ۱۹۳۶/۹/۲ء، چہارم، ۳۸۱ ۔ ۵۱: بنام مولوی عبدالحق، ۱۹۳۶/۹/۲۷ء، چہارم، ۳۹۴

اس میں بڑی بڑی دِقتیں پیش آئیں گی، کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی، مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔ انجمن اردو سے متعلق ایک پبلشنگ ہاؤس کی کامیابی بھی لاہور ہی میں ہو سکتی ہے، کیونکہ [یہ] ایک بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انگریزی پبلشنگ کی طرف بھی یہاں کے مسلمان توجہ کر رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادّہ زیادہ ہے۔ سادہ دل صحرائیوں کی طرح ان میں ہر قسم کی باتیں سننے اور اُن سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت اَور مقامات سے بڑھ کر ہے۔ ایک معمولی جلسے کے لیے آٹھ دس ہزار مسلمانوں کا جمع ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں، بلکہ بیس بیس ہزار کا مجمع بھی غیر معمولی نہیں۔ یہ بات پنجاب کے ہندوؤں میں بھی نہیں پائی جاتی۔[۵۲]

[انجمن ترقی اردو] سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے یہ تحریک اُس تحریک سے کسی طرح کم نہیں، جس کی ابتدا سر سید رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔[۵۳]

....

مَیں علی گڑھ حاضر ہونے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا، مگر افسوس کہ کمر کے درد سے ابھی [۲۱/اکتوبر] تک افاقہ نہیں ہوا۔ اس بنا پر بقیہ علاج کے لیے بھوپال نہیں جا سکا۔ علیٰ ھذا القیاس فلسطین کانفرنس کی صدارت سے بھی اسی بنا پر انکار کرنے پر مجبور ہوا، حالانکہ مسئلہ فلسطین سے مجھے بے حد دلچسپی ہے۔[۵۴]

....

فارسی کی نظم [پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق] حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور کتاب خانہ طلوعِ اسلام، ۲۵/میکلوڈ روڈ، لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے۔[۵۵]

ضربِ کلیم میں نغمگی کم ہے۔ مَیں نے خود قاری کو متنبہ کر دیا ہے...... میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ...... حکیمانہ شاعری کو یقیناً اس منزل تک ضرور ترقی کرنا چاہیے،

۵۲: بنام عبدالحق، ۱۹۳۶/۹/۲۷ء، چہارم، ۳۹۴۔۳۹۴
۵۳: بنام مولوی عبدالحق، ۱۹۳۶/۱۰/۲۱ء، چہارم، ۴۰۳
۵۴: ایضاً، ۴۰۱۔۴۰۳
۵۵: بنام فضل شاہ، ۱۹۳۶/۱۰/۳۱ء، چہارم، ۴۰۳

جہاں یہ قطعاً کھرے اور بے لاگ انداز میں اور بلا زیبِ داستان کے اظہارِ بیان پر قادر ہو جائے، تا کہ کسی کو بھی حقیقی زندگی کے مسائل سے گریز کرنے کا کوئی جواز ہاتھ نہ آئے۔[۵۶]

....

مَیں ...... [اپنے سیکرٹری مسٹر غلام رسول] کے اس بیان سے بالکل متفق ہوں کہ انتخابات سے کم از کم پندرہ روز پہلے اس صوبے میں ...... [جناح] کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔ یہاں کے لوگ نہایت ناقابلِ اعتماد لوگ ہیں۔ وہ عام طور پر وقتی جذبات کی رَو میں بہہ جاتے ہیں۔ اگر...... [جناح]، شوکت علی اور ایم کفایت اللہ انتخابات سے عین پیشتر ان سے خطاب کریں تو مجھے یقین ہے کہ وہ سب حمایت کریں گے، وگرنہ وہ کچھ اَور کر بیٹھیں گے۔ اگر...... [جناح] تشریف نہ لا سکے تو مجھے خدشہ ہے کہ آنے والی اسمبلی میں [جناح] کے چار سے زائد حامی نہ ہوں گے۔[۵۷]

....

['ادب اور زندگی' میں اختر حسین رائے پوری نے مجھ پر فاشزم کا الزام عائد کیا ہے،[۵۸] حالانکہ] معترض قرآنِ کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ علیٰ ھذا القیاس، اسلامی تصوف میں مسئلہ خودی کی تاریخ اور نیز میری تحریروں سے ناواقف محض ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں میں اسے معذور جانتا ہوں۔ آخر اس غلامی کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس کون سا ذریعہ ہے، جس سے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اسلامی تصورات کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ سے آگاہ کر سکے۔ غلام قومیں مادّیات کو روحانیت پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور جب انسان میں خوے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتی ہیں، جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔[۵۹]

دینِ اسلام، جو ہر مسلمان کے عقیدے کی رُو سے ہر شے پر مقدم ہے، نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود

۵۶: بنام فضل شاہ، ۱۹۳۶/۱۰/۳۱ء، چہارم، ۴۰۳۔۴۰۴ ۵۷: بنام جناح، ۱۹۳۶/۱۲/۸ء، چہارم، ۴۱۱۔۴۱۲
۵۸: مطبوعہ اردو (اورنگ آباد)، جولائی ۱۹۳۵ء ۵۹: بنام ظفر احمد، ۱۹۳۶/۱۲/۱۲ء، چہارم، ۴۱۲۔۴۱۳

کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو، خواہ ہٹلر کی، قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا، مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں، دوسری صورت میں قانونِ الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہر حال، حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکامِ الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیۂ اسلام نے فنا کہا ہے، بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے؛ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رُو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔[60]

معترض کا یہ کہنا کہ 'اقبال اس دَورِ ترقی میں جنگ کا حامی ہے'، غلط ہے۔ میں جنگ کا حامی نہیں ہوں، نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رُو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں؛ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں، یعنی اس صورت میں، جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے، مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ [کہ] حکم) [۲۲:۳۹]۔ دوسری صورت، جس میں جہاد کا حکم ہے، ۴۹:۹ میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیزیں، جس کو سیموئیل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس میں collective security کہتا ہے، قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے

۶۰: بنام ظفر احمد، ۱۹۳۶/۱۲/۱۲ء، چہارم، ۴۱۳-۴۱۴

بیان کیا ہے۔ اگر گذشتہ زمانے کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام کے بنے ہوئے آج صدیاں گزر گئی ہوتیں۔ جمعیت اقوام، جو زمانہ حال میں بنائی گئی ہے، اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ جنگ کی مذکورہ بالا دوصورتوں کے سوائے مَیں اَور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لیے جنگ کرنا دینِ اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ھذا القیاس، دین کی اشاعت کے لیے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔[61]

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں؛ خوددار اور غیرت مند ہے کہ اَور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے، تیز نگاہ ہے۔[62]

۶۱: بنام ظفر احمد، ۱۲/۱۲/۱۹۳۶ء، چہارم، ۴۱۴-۴۱۵ ۶۲: ایضاً، ۴۱۵

۱۹۳۷ء

الحمدللہ، میری صحت دن بدن ترقی کر رہی ہے، آواز میں بھی فرق آ رہا ہے۔ اِن شاء اللہ دربارِ رسالتؐ میں جو کچھ مَیں نے عرض کیا ہے، قبول ہوگا۔ امسال دربارِ حضورؐ میں حاضری کا قصد تھا، مگر بعض موانع پیش آ گئے۔ اِن شاء اللہ امید کہ سالِ آئندہ حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالتؐ میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانانِ ہند یاد کریں گے۔[1]

....

مصر کے علما آ گئے ہیں، مَیں نے اُن کو ۲۷ جنوری بروز بدھ ڈیڑھ بجے بعد دوپہر لنچ دیا ہے۔[2] ان کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا مشاہدہ اور معائنہ ہے۔[3]

....

اس خط کا لکھنے والا [آفتاب اقبال] میرے لیے قطعاً اجنبی ہے اور بہت برسوں سے ہے۔ میرے لیے یہ احاطۂ بیان سے باہر ہے کہ اس کا برتاؤ میرے ساتھ کیا رہا ہے۔ اس عریضے کے لکھنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ...... [سر اکبر حیدری] کو اس نوجوان [آفتاب] کی حرکات سے متنبہ کر دوں، جو میرے لیے مستقل کرب واندوہ کا باعث رہا ہے۔ مَیں سوچ نہیں سکتا کہ بغیر کسی شرارت یا فتنہ انگیزی کی غرض کے، وہ میرے احباب کو خط لکھ سکتا ہے۔[4]

میری آنکھوں میں پانی اُترنے کے آثار ہیں۔ ڈاکٹر لکھنے پڑھنے سے منع کرتے ہیں،

۱: بنام راس مسعود، ۱۵/۱/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۲۰

۲: بنام نذیر نیازی، ۲۳/۱/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۲۳

۳: بنام شمس الدین، ۲۴/۱/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۲۶

۴: بنام اکبر حیدری، ۲/۲/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۳۱

جب تک آپریشن نہ ہو جائے۔[5]

....

میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے اُور اِزم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے، جو بنی نوعِ انسان کے لیے ہر نقطہ نگاہ سے موجبِ نجات ہوسکتی ہے۔[6]

....

گذشتہ دس پندرہ سال سے کئی لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے حضور رسالت مآبؐ کو جلالی رنگ میں یا سپاہیانہ لباس میں خواب میں دیکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ علامت احیائے اسلام کی ہے۔[7]

....

پنڈت جواہر نہرو کا وہ خطبہ، جو انھوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے اجلاس میں دیا ہے، اس کے بین السطور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق حکمت عملی کارفرما ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا کی آئندہ سیاسی ترقیات کے پیش [نظر] نیا دستور ہندی مسلمانوں کو اپنی تنظیم کے لیے ایک نادر موقع بہم پہنچاتا ہے۔ اگرچہ ہم ملک میں دیگر ترقی پسند پارٹیوں کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہیں، تاہم ہمیں اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کے اخلاقی و سیاسی اقتدار کے مستقبل کا دار و مدار تمام تر ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے، لہٰذا میری تجویز ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کا ایک مؤثر جواب دیا جائے۔ دہلی میں جلد از جلد ایک آل انڈیا مسلم کنونشن میں نئی صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلم رہنماؤں کو بھی دعوتِ شمولیت دی جائے۔ اس اسلامی مؤتمر کی طرف سے پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی وحدت کا بطور نصب العین اعلان کر دیں۔ ہندوستان اور

۵: بنام آلِ احمد سرور، ۱۲/۳/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۳۵ ۶: ایضاً، ۴۳۶

۷: بنام نور حسین، ۱۷/۳/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۴۱

بیرونِ ہندوستان کی دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں صرف اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی اکثریت کی نگاہ میں ثقافتی مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اگر معاشی مسئلے سے زیادہ اہم نہیں تو اس سے کسی طرح کم اہمیت کا حامل بھی نہیں۔ اگر ایسی کنونشن منعقد کر سکیں تو ان ارا کین اسمبلی کی حیثیت کا امتحان بھی ہو جائے گا، جنھوں نے مسلمانوں کی خواہشوں اور مقاصد کے خلاف اپنی اپنی جداگانہ پارٹیاں قائم کر لی ہیں۔ مزید برآں اس کنونشن سے ہندوؤں پر بھی یہ عیاں ہو جائے گا کہ کوئی حربہ، خواہ وہ کسی قدر عیارانہ کیوں نہ ہو، ہندی مسلمانوں کو اپنے ثقافتی وجود سے غافل نہیں کر سکتا۔[۸]

....

شہزادی [بمبا دلیپ سنگھ] صاحبہ چند روز ہوئے، مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ یہ ان کی بڑی کرم فرمائی ہے کہ وہ تشریف لائیں اور میرے لیے گلاب کے حسین پھول بطور تحفہ لے کر آئیں۔[۹]

مَیں ایک روز کے لیے دہلی گیا تھا، حکیم نابینا کی دوائی سے صحت بہت ترقی کر رہی ہے۔[۱۰] آنکھ کا معائنہ کرایا ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دوسرے معائنے تک لکھنا پڑھنا بند کر دو۔[۱۱]

....

صورتِ حال نازک تر ہوتی جا رہی ہے اور پنجاب کے مسلمان کانگریس کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ مسلم لیگ کا اجلاس تو اگست تک کے لیے ملتوی ہو چکا ہے، لیکن حالات مسلم پالیسی کے فوری اعلانِ مکرر کے مقتضی ہیں۔ اگر کنونشن کے اجلاس سے قبل مقتدر مسلمان لیڈروں کا ایک دَورہ بھی ہو جائے تو کنونشن یقیناً نہایت کامیاب رہے گا۔[۱۲]

....

[علی گڑھ] مسلم یونیورسٹی کے فلسفہ کے طالب علموں نے مجھ کو ایک خط لکھا ہے، جس

۸: بنام جناح، ۲۰/۳/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۴۱-۴۴۳
۹: بنام امراؤ سنگھ، ۱۴/۴/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۴۸-۴۴۹
۱۰: بنام راس مسعود، ۱۹/۴/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۴۹
۱۱: ایضاً
۱۲: بنام جناح، ۲۲/۴/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۵۰

میں وہ لکھتے ہیں کہ مَیں فلسفۂ اسلام کی ایک مفصل تاریخ لکھوں۔ اگرچہ یہ کام میرے ذہن میں تھا، لیکن افسوس کہ اس کے مشکلات اور نیز میری موجودہ علالت نے مجھ کو اس کی طرف سے کُلی مایوس کر دیا۔ مضمون اتنا وسیع ہے کہ فی الحال اس کی ابتدا خاص خاص سوالات کی بحث سے شروع کی جاسکتی ہے۔ کچھ مدت ہوئی، مَیں نے آکسفرڈ یونیورسٹی کے لیکچروں کے لیے Time and Space in the History of Muslim Thought پر لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اس کے لیے مَیں نے کچھ میٹریل بھی جمع کیا تھا، لیکن یہ مقصد بھی میری علالت نے پورا نہ ہونے دیا۔ [اگر] فلسفہ کا کوئی نہایت ہشیار طالب علم، جو عربی اچھی طرح سے جانتا ہو، اس کام کو کرنے کے لیے تیار [ہوتو] مندرجہ بالا مضمون کو اَور بھی محدود کیا جا سکتا ہے، مثلاً اس طرح کہ صرف Time پر بحث ہو اور Space کو چھوڑ دیا جائے۔ اگر ایسا طالب علم [علی گڑھ مسلم] یونیورسٹی میں موجود ہو اور یونیورسٹی اس خاص ریسرچ کے لیے کم ازکم دو سال تک وظیفہ بھی دے سکے تو وہ ایک چھوٹی سی نہایت عمدہ کتاب مضمونِ مذکورہ پر لکھ سکتا ہے۔ جو میٹریل میرے پاس موجود ہے، مَیں اس کو دے دوں گا اور اگر وہ چند روز لاہور میں ٹھہر سکے تو مَیں اس کی، زبانی بحث و مباحثہ سے بھی مدد کر سکتا ہوں۔ ایسے اسٹوڈنٹ کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی لکھنے پر اچھی قدرت رکھتا ہو، عربی زبان جانتا ہو، صحت اس کی اچھی ہو، تاکہ اگر ریسرچ کے لیے اس کو ہندوستان کے مختلف یونیورسٹیوں یا تعلیم گاہوں کے کتب خانے تلاش کرنے کے لیے سفر کرنا پڑے تو یہ زحمت اٹھا سکتا ہو [اور] فلسفۂ جدید، خاص کر Time کی بحث سے اچھی طرح واقف ہو۔ میرے ذہن میں مضمون کا خاکہ [یوں] ہے:

کتاب کا خاکہ

تعارف...... ٹائم کا مسئلہ ایشیا میں

(الف) ٹائم ہندو مابعد الطبیعیات میں

(ب) بدھ ازم کی دلچسپی ٹائم کے مسئلے پر

(ج) ٹائم کا مسئلہ اور زرتشت

(د) ٹائم قرآن میں

پہلا باب:

مسلم فلسفہ کی تاریخ میں عمومی طور پر ٹائم کی بحث

ٹائم مسلم سائنس دانوں کے یہاں۔

میرا خیال ہے کہ اس پہلو سے بھی کچھ مواد موجود ہے۔ یہ مواد ہندوستان میں دستیاب ہے یا نہیں، اس کے متعلق مجھے نہیں معلوم۔ اس سلسلے میں طالب علم کو رازی کی مباحث مشرقیہ اور دوسری کئی چیزوں کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس موضوع پر کچھ مواد ہندوستان کی لائبریریوں میں بھی ہوگا۔

دوسرا باب:

ٹائم اسلامی تصوف میں

اس سلسلے میں محی الدین ابن عربی، عراقی اور دوسرے صوفیہ کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

تیسرا باب:

ٹائم ہندوستان کے مسلم مفکر کی تاریخ میں

ایک ہندوستانی مسلم مفکر کے جواب میں میر باقر داماد نے اپنا مشہور نظریہ ٹائم وضع کیا تھا، یہ پوری بحث تحقیق کی طالب ہے۔

ٹائم کے مسئلے پر مسلم متکلمین کی دلچسپی ابھی تک کم نہیں ہوئی ہے۔ مولوی سید برکات احمد ٹونکی کا رسالہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا[۱۳]

....

مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی سب سے پرانی سیاسی جماعت ہے، جسے تمام مسلمانوں کا مکمل اعتماد حاصل ہونا چاہیے، خصوصاً اس وقت، جب کہ اس کی عنانِ قیادت مسٹر محمد علی جناح ایسے رہنما کے ہاتھ میں ہے، جنھیں تمام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔[۱۴] [دوسری

۱۳: بنام ظفر الحسن، ۶/۵/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۵۶-۴۵۹ ۱۴: گفتارِ اقبال، ۲۰۸

طرف] پنجاب میں لیگ کی نسبت ہمدردانہ جذبات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور یہ کہ یونینسٹوں سمیت پنجاب کے مسلمان ...... [جناح] کی پوری پشت پناہی کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ مسلم لیگ کے آئین میں مناسب تبدیلیاں کرنا ضروری ہیں، تاکہ مسلم لیگ کو عوام الناس کے قریب تر لایا جائے، جنھوں نے اب تک مسلمانوں کے بالائی متوسط طبقے کی سیاسی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ عام مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہمارے لیڈروں کو صرف اپنے عہدوں سے دلچسپی ہے اور یہ کہ حکومت کے مختلف محکموں میں خالی اسامیاں وزیروں کے رشتے داروں یا دوستوں کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے [یہاں] عام مسلمان سیاسی معاملات میں کم دلچسپی لیتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کی شکایت بجا ہے۔[15]

....

سنہری گولی، جو صبح بالائی میں رکھ کر کھائی جاتی ہے، اس کے کھانے سے پیٹھ کی درد رفع ہوئی۔ اپریل کے ابتدا میں جب مَیں حکیم صاحب سے ملا تھا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ تمھارا جگر ریح پیدا کرتا ہے، اب اس کا علاج ضروری ہے، اس کے لیے انھوں نے ایک معجون مجھے عطا فرمائی تھی۔ جگر بدستور ریح پیدا کرتا ہے، اس میں کمی نہیں ہوئی، غالباً یہ معجون مؤثر نہیں ہوئی۔ دم بھی پھولتا ہے، گو پہلے کی نسبت کم۔ اس سے مَیں یہ اندازہ کرتا ہوں کہ دل کی تقویت کے لیے کسی خاص مؤثر دوا کی ضرورت ہے۔ قبض کی شکایت بھی کم وبیش ہے۔ اس معجون کے استعمال کے چند روز بعد پیٹھ کا درد بھی عود کر آیا، حالانکہ اس کے استعمال سے پہلے مطلق نہ تھا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا عود کر آنا معجون کے استعمال کی وجہ سے ہے۔ جو ریح پیدا ہوتی ہے، جب تک نہ نکلے، کمر میں درد ہوتا رہتا ہے اور دونوں طرف کے گردوں پر بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ نکل جائے تو درد میں تخفیف ہوتی ہے۔[16]

....

۱۵: بنام جناح، ۱۰/۵/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۶۰-۴۶۱ ۱۶: بنام شیخ اعجاز احمد، ۲۰/۵/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۶۸-۴۷۱

قادیانی تحریک یا بانیِ تحریک کا دعویٰ مسئلہ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ مذکور کی تحقیق تاریخی لحاظ سے ازبس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیل اس سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ میری رائے ناقص میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔[17]

....

میری آنکھوں کی تکلیف بڑھ رہی ہے اور میرے معالجین نے مجھے لکھنے پڑھنے کی قطعاً ممانعت کر دی ہے[18]، اس واسطے تمام دِن لیٹے لیٹے گزر جاتا ہے۔[19]

....

لیگ کا تمام تر مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ نے اس ضمن میں کوئی وعدہ نہ کیا تو مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلے کا حل موجود ہے اور فقہ اسلامی میں مقتضیاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر مزید ترقی کا امکان ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعے کے بعد مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کا کم از کم حقِ معاش محفوظ ہو جاتا ہے، لیکن کسی ایک آزاد مسلم ریاست یا ایسی چند ریاستوں کی عدم موجودگی میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ اور ارتقا اس ملک میں ناممکن ہے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور اب بھی میرا ایمان ہے کہ مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان میں قیامِ امن و امان کا ایک ہی حل ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں ہے تو پھر صرف دوسرا راستہ (متبادل) صرف خانہ جنگی ہے، جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کچھ عرصے سے جاری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں، مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین کی سی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ موجودہ مسائل کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں

17: بنام الیاس برنی، ۲۷/۵/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۷۴-۴۷۶ 18: بنام شیو لال، ۲۷/۵/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۷۶
19: بنام مسعود عالم، ۲۸/۵/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۷۷

زیادہ آسان ہے، لیکن مسلم ہندوستان میں ان مسائل کو آسان طور پر حل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کو ایک یا زائد مسلم ریاستوں میں تقسیم کیا جائے، جہاں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو۔ کیا اس مطالبے کا وقت نہیں آن پہنچا؟ شاید جواہر لال کے بے دین اشتراکیت کا یہ بہترین جواب ہے۔[20]

....

جاوید کا ماموں خواجہ عبدالغنی چند روز ہوئے، بقضاے الٰہی فوت ہوگیا۔ دلّی سے مسوری پہنچ کر ایک روز دفعتہً گرتے ہی بے ہوش ہوگیا اور پانچ دن بے ہوش رہ کر عالمِ بے ہوشی میں ہی اس عالمِ فانی سے کوچ کر گیا۔ نہایت نیک اور مخلص انسان تھا۔ میرے دونوں بچوں سے بہت محبت رکھتا تھا اور مجھے اس پر بہت بھروسا تھا۔ اس کی ناگہانی موت نے مجھ کو بے حد پریشان کیا ہے۔ ماں کی طرف سے ان دونوں بچوں کا یہی بازو تھا۔ باپ کی طرف سے جو رشتے داران کے ہیں، ان سے کسی قسم کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اگرچہ مَیں نے تمام عمر اپنے مقدور سے زیادہ ان کی خدمت کی ہے۔ اس ساری پریشانی میں ایک خیال مجھے تسکین دیتا رہا اور وہ یہ کہ جو میری زندگی میں ان بچوں کا محافظ [اور] پرورِش کرنے والا ہے، وہی میرے بعد بھی ان کی حفاظت اور پرورِش کرے گا۔[21]

جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے لیے اور گھر کے عام انتظام کے لیے، جو ایک مدت سے بگڑا ہوا ہے، مَیں نے فی الحال آزمائشی طور پر علی گڑھ سے ایک جرمن لیڈی [ڈورس احمد] کو، جو اسلامی معاشرت سے واقف ہے اور اردو بول سکتی ہے، بلوایا ہے۔ پروفیسر رشید صدیقی اور دیگر احباب نے اس کی شرافت کی بہت تعریف کی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کامیاب ہوگئی تو مجھے بے فکری ہو جائے گی۔ ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں، اسی واسطے مَیں نے مذکورہ بالا انتظام کیا ہے۔ یہ جرمن لیڈی علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن ہے، جو ایک مدت سے علی گڑھ میں مقیم ہے۔[22]

۲۰: بنام جناح، ۲۸/۵/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۷۹-۴۸۰ ۲۱: بنام راس مسعود، ۳/۶/۱۹۳۷ء، ۴۸۱-۴۸۳

۲۲: بنام راس مسعود، ۸/۶/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۸۳-۴۸۵

مَیں نے جاوید اور منیرہ کے چار گارڈین مقرر کیے تھے۔ یہ گارڈین از رُوے وصیت مقرر کیے گئے تھے، جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے:

(۱) شیخ طاہر الدین، یہ میرے کلارک ہیں، جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

(۲) چودھری محمد حسین ایم اے، سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

(۳) شیخ اعجاز احمد بی اے، ایل ایل بی، سب جج دہلی۔

(۴) عبدالغنی مرحوم۔

عبدالغنی بے چارے کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے، نہایت صالح آدمی ہے، لیکن افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں، اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ...... [راس مسعود] کو گارڈین مقرر کردوں۔ یہ درست ہے کہ [راس مسعود] لاہور سے بہت دُور...... [ہے]، لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین...... [راس مسعود کے] ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔[۲۳]

میری صحت بہ نسبت سابق بہتر ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ایک دائم المریض کی زندگی بسر کر رہا ہوں، تاہم صابر اور شاکر ہوں۔ اِن شاءاللہ جب موت آئے گی تو مجھے متبسم پائے گی۔[۲۴] بعض احباب نے علاج کے لیے جرمنی اور آسٹریا جانے کا مشورہ دیا ہے، لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے اخراجات میری استطاعت سے باہر ہوں گے۔ مزید برآں یہ بات میرے بچوں کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہوگی کہ عمر کے اِن ڈھلتے ہوئے سالوں میں،

۲۳: بنام راس مسعود، ۱۰/۶/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۸۷-۴۸۸   ۲۴: بنام عبداللہ چغتائی، ۱۳/۶/۱۹۳۷ء

جب کہ میری زندگی کا کام عملاً انجام کو پہنچ چکا ہے، مَیں اپنی ذات پر اس قدر خرچ کروں[۲۵] خصوصاً جب کہ مَیں ان کی مرحوم ماں سے یہ عہد کر چکا ہوں کہ جب تک یہ بالغ نہ ہو جائیں، ان کو اپنی نظر سے اوجھل نہ کروں گا[۲۶] تنہا خواہش، جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستی کے مزار پر حاضری دوں، جس کا ذاتِ الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہِ تسکین اور سرچشمہ الہام رہا ہے[۲۷] مجھ ایسے گناہ گاروں کے لیے آستانِ رسالتؐ کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے[۲۸]۔ میری جذباتی زندگی کا سانچا کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی شعور کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہو سکا۔ یہ یقین مجھے پیغمبرِ اسلامؐ کی ذاتِ گرامی سے حاصل ہوا ہے۔ میرا ہر بُنِ مُو آپؐ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے اور میری رُوح ایک بھرپور اظہار کی طالب ہے، جو صرف آپؐ کے مزارِ اقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج اظہارِ تشکر کی ایک شکل ہوگی۔[۲۹]

....

اس وقت جو طوفان شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے، اس میں صرف...... [جناح] ہی کی ذاتِ گرامی سے قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی کی حالت ہی میں ہیں۔ اگر فوج اور پولیس نہ ہو تو یہ (خانہ جنگی) دیکھتے ہی دیکھتے پھیل جائے۔ گذشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ سا قائم ہو چکا ہے۔ صرف شمال مغربی ہندوستان میں گذشتہ تین ماہ میں کم از کم تین (فرقہ وارانہ) فسادات رونما ہو چکے ہیں اور کم از کم چار وارداتیں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہینِ رسالت کی ہو چکی ہیں۔ ان چاروں مواقع پر رسول اللہؐ کی اہانت کرنے والوں کو فی النار کر دیا گیا۔ سندھ میں قرآنِ مجید نذرِ آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔

۲۵: بنام اکبر حیدری، ۱۳/۶/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۹۴
۲۶: بنام عبداللہ چغتائی، ۱۳/۶/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۹۵-۴۹۶
۲۷: بنام اکبر حیدری، ۱۳/۶/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۹۴
۲۸: بنام عبداللہ چغتائی، ۱۳/۶/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۹۶
۲۹: بنام اکبر حیدری، ۱۳/۶/۱۹۳۷ء، چہارم، ۴۹۴

مَیں نے تمام صورتِ حال کا نظر غائر سے جائزہ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں اور نہ اقتصادی، بلکہ خالی سیاسی ہیں، یعنی مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کر دینا ہے۔ نیا دستور کچھ اس قسم کا ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کا دارومدار تمام تر غیر مسلموں پر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم وزارت کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتی، بلکہ وزارت کو خود مسلمانوں سے ناانصافی برتنا پڑتی ہے، تاکہ وہ لوگ، جن پر وزارت کا انحصار ہے، خوش رہ سکیں اور ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر جانب دار ہے؛ لہٰذا یہ واضح ہے کہ ہمارے پاس اس دستور کو رَد کرنے کے خاص وجوہ موجود ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیا دستور ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں، (برخلاف اس کے) مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو کاملاً ہندوؤں پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ یہ دستور ہندوستانی مسلمانوں کو بے پایاں نقصان پہنچانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ دستور تو اقتصادی مسئلے کا بھی حل نہیں ہے، جو مسلمانوں کے لیے اس قدر جانکاہ بن چکا ہے۔ کمیونل ایوارڈ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی وجود کو صرف تسلیم کرتا ہے، لیکن کسی قوم کے سیاسی وجود کا ایسا اعتراف، جو اس کی اقتصادی پسماندگی کا کوئی حل تجویز نہ کرتا ہو اور نہ کر سکے، اس کے لیے بے سود ہے۔ کانگریس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کے (جداگانہ) سیاسی وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری سیاسی جماعت، یعنی مہاسبھا نے، جسے مَیں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں، بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا وجود ناممکن ہے۔ اندریں حالات یہ بالکل عیاں ہے کہ ہندوستان میں قیامِ امن کے لیے ملک کی از سرِ نو تقسیم کی جائے، جس کی بنیاد نسلی، مذہبی اور لسانی اشتراک پر ہو۔ بہت

سے برطانوی مدبرین بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں اور اس دستور کے جلو میں، جو ہندو مسلم فسادات پوری تیزی سے رونما ہو رہے ہیں، وہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں کہ ملک کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے میری روانگی سے قبل لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مشکلات کا حل تو تمھاری اسکیم میں موجود ہے، لیکن اس کے بارآور ہونے کے لیے پچیس سال کی مدت درکار ہوگی۔ پنجاب کے بعض مسلمان پہلے ہی شمال مغربی ہند کی مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کر رہے ہیں اور یہ خیال پھیلتا جا رہا ہے۔ ہماری قوم ابھی تک نظم وضبط سے محروم ہے اور شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ابھی وقت سازگار نہیں، لیکن مَیں محسوس کرتا ہوں کہ...... [جناح] کو اپنے خطبے میں کم ازکم اس طریقِ عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے، جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجامِ کار مجبوراً اختیار کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں تو نئے دستور میں ہندوستان بھر کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی نیا بالکل یاس انگیز ہے۔ مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق کا قیام اس طریق پر، جس کا مَیں نے اوپر ذکر کیا ہے، صرف واحد راستہ ہے، جس سے ہندوستان میں امن وامان قائم ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ وتسلط سے بچایا جا سکے گا، کیونکہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ اقوام تصور کیا جائے، جنھیں ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حقِ خود اختیاری حاصل ہو۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی طریق کو اختیار کرنے میں ہے، اس لیے مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبے کی بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور لاہور میں مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کا انعقاد پنجابی مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی بیداری پیدا

کرنے کا باعث ہوگا۔[30]

....

میری طویل علالت مجھے مجبور کرتی ہے کہ ہر قسم کے فرائض سے، خواہ وہ کتنے ہی ہلکے کیوں نہ ہوں، سبکدوش ہو جاؤں۔[31]

[راس مسعود کی طرف سے] مَیں بہت متردّد ہوں، بارہ دِن کا ملیریا اور اس پر مسلسل سر درد، مجھے اندیشہ ہے کہ مسعود بہت کمزور ہو گئے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ ان کو جلد صحت کامل عطا فرمائے۔[32]

....

اسلام کے لیے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے، ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علما میں مداہنت آ گئی ہے، یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے؛ صوفیہ، اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں؛ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں؛ عوام میں جذبہ موجود ہے، مگر ان کا کوئی بے غرض راہنما نہیں ہے۔[33]

....

میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ نیشنل لیگ آف انگلینڈ وقت شناسی کا ثبوت دے اور اہلِ برطانیہ کو عربوں کے خلاف، جن سے برطانوی سیاست دانوں نے اہلِ برطانیہ کے نام سے حتمی وعدے کیے تھے، ناانصافی کے ارتکاب سے بچا لے۔ طاقت کا سرچشمہ فراست ہے، جب طاقت عقل و دانش کو پس پشت ڈال کر محض اپنی ذات ہی پر بھروسا کر لیتی ہے تو نتیجہ خود طاقت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ پرنس محمد علی مصری نے ایک معقول تعمیری تجویز پیش کی ہے، جو ہر طرح اہلِ برطانیہ کے لیے لائقِ توجہ ہے۔ ہمیں یہ کبھی بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ فلسطین انگلستان کی کوئی ذاتی جائداد نہیں۔ فلسطین تو انگلستان کے پاس جمعیۃ الاقوام کی

۳۰: بنام جناح، ۱۹۳۷/۶/۲۱ء، چہارم، ۵۰۳-۵۰۶ ۳۱: بنام سیکرٹری انجمن، ۱۹۳۷/۷/۱ء، چہارم، ۵۰۹

۳۲: بنام ممنون حسن، ۱۹۳۷/۷/۱۶ء، چہارم، ۵۱۱ ۳۳: بنام نیاز علی خاں، ۱۹۳۷/۷/۲۰ء، چہارم، ۵۱۳-۵۱۴

طرف سے زیرِ انتداب ہے اور مسلم ایشیا اب لیگ آف نیشنز کو انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ایک ایسا ادارہ سمجھنے لگا ہے، جسے انھوں نے کمزور مسلم سلطنتوں کے علاقوں کی تقسیم کے لیے وضع کر رکھا ہے۔ اگر پروپیگنڈے کے زور سے اہلِ برطانیہ کو عربوں کے خلاف دھوکا دیا گیا تو مجھے اندیشہ ہے، موجودہ حکمت عملی کے نتائج خطرناک ثابت ہوں گے۔[34]

....

کچھ دِنوں سے میرے دونوں گردوں کی طرف ایک بوجھ سا رہتا ہے اور گذشتہ رات بائیں جانب کے گردے میں خفیف سی درد بھی محسوس ہوتی رہی، جو اِس وقت نہیں ہے۔ اسی بائیں جانب کے گردے میں، دس سال ہوئے، جب مجھے درد ہوئی تھی۔ جب حکیم صاحب نے اس کا علاج کیا، دس سال تک ذرا سی کسک بھی محسوس نہیں ہوئی، سوائے گذشتہ رات کے۔[35]

لاہور کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلسہ کل شام، یعنی سوموار [یکم اگست] کی شام کو ہونے والا ہے۔ افسوس کہ مَیں علالت کی وجہ سے جلسے میں حاضر نہیں ہو سکوں گا، مگر میری طرف سے ایک بیان اس جلسے میں پڑھا جائے گا۔[36] لیکن مَیں مسلمانوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے، مجھے اس کا ایسا ہی شدید احساس ہے، جیسا مشرقِ قریب کی صورتِ حالات سے واقف کسی بھی شخص کو ہو سکتا ہے۔[37]

....

سید [راس] مسعود مرحوم کے انتقال کی ناگہانی خبر صبح اٹھتے ہی اخبار زمیندار سے معلوم ہوئی۔ مَیں نے اس خبر کو مشتبہ سمجھ کر...... [ممنون حسن خاں] کے نام تار لکھا کہ اتنے میں سول اینڈ ملٹری گزٹ سے مرحوم کے انتقال کی سرکاری اطلاع معلوم ہوئی۔ میرے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہے۔[38] آج صبح سے دوپہر تک مرحوم کے جاننے والے اور ان کے غائبانہ معترف تعزیت کے لیے آتے رہے۔[39] سید راس مسعود کے ناگہانی انتقال

۳۴: بنام فارقو ہرسن، ۲۰/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۱۵-۵۱۶
۳۵: بنام شیخ اعجاز احمد، ۲۲/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۱۷-۵۱۹
۳۶: بنام راغب احسن، ۲۵/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۲۱
۳۷: *Speeches*, p-293 (ترجمہ جاوید اقبال)
۳۸: بنام ممنون حسن، ۳۱/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۲۴
۳۹: بنام ممنون حسن، ۳۱/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۲۵

نے سخت پریشان کر رکھا ہے[۴۰]۔ انھوں نے اپنے مرحوم دادا کی طرح ملک وملت کی بہت زیادہ خدمت کی۔ مرحوم کی بے وقت موت سے مسلمانانِ ہند کو بہت نقصان پہنچا ہے[۴۱]۔ مرحوم کے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا، جس کے دل پر مرحوم نے اپنی دل نوازی، بلند نظری اور سیر چشمی کا گہرا نقش نہ چھوڑا ہو۔ مسعود اپنے باپ دادا کے تمام اوصاف کا جامع تھا۔ اس نے قدرت سے دادا کا دل اور باپ کا دِماغ پایا تھا اور جب تک جیا، اس دل و دِماغ سے ملک وملت کی خدمت کرتا رہا۔ خدا تعالیٰ اسے غریقِ رحمت کرے[۴۲]۔ مَیں ذرا سفر کے قابل ہولوں تو سید مسعود کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے علی گڑھ جانے کا قصد رکھتا ہوں[۴۳]۔ مرحوم کی موت کالا آزار [Kalaazar] سے واقع ہوئی ہے۔ یہ کالا آزار مشرقی افریقہ کی بیماری ہے۔ بھوپال میں اس کا ظاہر ہونا تعجب کی بات ہے۔ ان کی وفات پر چند اشعار لکھ رہا ہوں، جو میرے دوسرے مجموعے میں شامل ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے ہی شائع کر دیے جائیں[۴۴]۔ مسعود مرحوم کے کتبہ مزار کے لیے مَیں نے مندرجہ ذیل رباعی انتخاب کی ہے:

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
ز بندِ این و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمِ چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

یہ رباعی مَیں نے اپنے کتبہ مزار کے لیے لکھی تھی، لیکن تقدیرِ الٰہی یہ تھی، مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے، حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ اُن کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے۔ لیکن اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر، میرے خیال میں، بہتر ہوگا:

۴۰: بنام غلام السیدین، ۳۱/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۲۵
۴۱: بنام جنرل کونسل، ۳۱/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۲۶
۴۲: بنام لیڈی مسعود، ۱/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۲۹
۴۳: بنام ممنون حسن، ۲/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۳۰
۴۴: بنام ممنون حسن، ۵/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۳۱

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

مسعود کا غم باقی رہے گا، جب تک مَیں باقی ہوں[45]۔

مسعود مرحوم کا اخلاص، اس کی دردمندی اور اس کا اخلاق، جس میں اس کے باپ اور دادا دونوں کی جھلک نظر آتی تھی، اب ہندوستان میں یہ باتیں کہاں نظر آئیں گی۔ جس روز مرحوم کی ناگہانی موت کی خبر لاہور پہنچی ہے، مَیں نے اُسی روز چند اشعار لکھے تھے، مگر یہ مرثیہ کہلانے کے مستحق نہیں، مرثیہ لکھنا مجھے آتا بھی نہیں۔ میرے لیے مرحوم کا غم محض ایک محرک ہے اس یقین کی آرزو اور تلاش کا کہ مرحوم باوجود ہم سے جدا ہو جانے کے، مَرا نہیں، بلکہ زندہ ہے۔ آنسو بہانا ایک فطری امر ہے، مگر میرا غم اسی یقین سے ہلکا ہوتا ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے میرے قلب کی یہی کیفیت چلی آتی ہے[46]۔ مسعود مرحوم کی وفات پر جو اشعار مَیں نے لکھے تھے، وہ آج مَیں نے رسالہ اردو میں چھپنے کے لیے حیدرآباد دکن بھیج دیے ہیں[47]۔

یہ مہر و مہ، یہ ستارے، یہ آسمانِ کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود
خیالِ جادہ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود
رہی نہ آہ! زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہُنر، مرگِ ناگہاں اُس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود

۴۵: بنام ممنون حسن، ۷/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۳۸
۴۶: بنام عبدالحق، ۲۳/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۴۷-۵۵۰
۴۷: بنام ممنون حسن، ۲۳/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۵۴

مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود
دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است[۴۸]

....

مَیں نے علالت کی بنا پر [انجمن حمایت اسلام سے] استعفا دیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اَور بھی وجوہ تھے، جن کو محض اس وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا کہ ان کی اشاعت سے انجمن کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا، صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ انجمن کے موجودہ حالات میں مَیں صدارت کا بارِ گراں نہیں اٹھا سکتا۔ مَیں نہیں چاہتا کہ میری صدارت میں انجمن تمام مسلمانوں میں اپنا وقار کھو دے اور مَیں اس بے اعتمادی کا کوئی علاج نہ کر سکوں۔[۴۹]

....

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم پنجاب کی ایک بستی میں ایک اہم ادارے کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اَور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا اور اِن شاء اللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہو گی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو، جو جدید علوم سے بہرہ ور ہوں، کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یکجا کر دیں، جنھیں دینی علوم میں مہارت حاصل ہو، جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیت پائی جاتی ہو اور جو اپنا وقت دینِ اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں اور ہم ان لوگوں کے لیے نئی تہذیب اور جدید تمدن کے شور و شغب سے دُور ایک دارالاقامت بنا دیں، جو ان کے لیے ایک اسلامی علمی مرکز کا کام دے اور اس میں ہم ان کے لیے ایک لائبریری ترتیب دیں، جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتابیں موجود ہوں، جن کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ مزید برآں ان کے لیے ایک کامل اور صالح گائیڈ کا

۴۸: کلیاتِ اقبال اردو، ۲۳۔۷۴۔۷۲۲
۴۹: بنام عظیم اللہ، ؟/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۲۸

تقرر کیا جائے، جسے قرآنِ حکیم پر بصیرتِ تامہ حاصل ہو اور جو دنیائے جدید کے احوال و حوادث سے بھی باخبر ہو، تاکہ وہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی روح سمجھا سکے اور فلسفہ وحکمت اور اقتصادیات وسیاسیات کے شعبوں میں فکرِ اسلامی کی تجدید کے سلسلے میں انھیں مدد دے سکے، تاکہ یہ لوگ اپنے علم اور اپنے قلم سے اسلامی تمدن کے احیا کے لیے کوشاں ہوسکیں۔[۵۰]

....

واقعات نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ لیگ کو اپنی تمام تر سرگرمیاں شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز کر دینی چاہییں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگست اور ستمبر میں اجلاس منعقد نہیں ہوسکے گا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے لیے روز افزوں جوش وخروش بڑھ رہا ہے اور مجھے ذرا شک وشبہ نہیں کہ لاہور میں اس کا اجلاس مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں باب ثابت ہوگا اور عوام سے رابطہ استوار کرنے کا ایک اہم ذریعہ۔[۵۱]

....

حج بیت اللہ کی آرزو تو گذشتہ دو تین سال سے میرے دل میں بھی ہے، خدا تعالیٰ ہر پہلو سے استطاعت عطا فرمائے تو یہ آرزو پوری ہو۔ عراق کی راہ جائیں تو بہت سے مقدس مقامات کی زیارت ہو جاتی ہے، لیکن بغداد سے مدینہ تک چھ سو میل کا طویل سفر ہے، جو لاری پر کرنا پڑتا ہے۔ ہمت تو میری بھی بلند ہے، لیکن بدن عاجز وناتواں ہے۔ کیا عجب کہ خدا تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ چند روز ہوئے، سر اکبر حیدری وزیرِ اعظم حیدرآباد کا خط مجھ کو ولایت سے آیا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ حجِ بیت اللہ اگر تمھاری معیت میں نصیب ہو تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن درویشوں کے قافلے میں جو لذت وراحت ہے، وہ امیروں کی معیت میں کیونکر نصیب ہوسکتی ہے۔[۵۲]

....

۵۰: بنام مصطفیٰ المراغی، ۵/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۳۵ ۵۱: بنام جناح، ۱۱/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۳۹-۵۴۰

۵۲: بنام غلام میراں، ۱۱/۸/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۴۰-۵۴۱

حکومتِ ہندوستان ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر اپنے مسلمان ایجنٹوں کے ذریعے مختلف مسلم صوبوں میں کمیونل ایوارڈ منسوخ کرواسکتی ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہندوستان میں فی الوقت ایک بھی ایسا مسلم سیاست دان موجود نہیں ہے، جس کی آنکھیں اسلام کے مستقبل اور ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز ہوں۔ مسلم پریس کے لیے ضروری ہو چلا ہے کہ وہ کانگریس کے ساتھ حکومتِ ہندوستان کو بھی بے جگری کے ساتھ بے نقاب کرے، کیوں کہ یہ حکومت اپنے پرانے دشمن کے ساتھ اتحاد کے لیے کوشاں ہے۔[۵۳]

پنجاب کے مختلف شہروں میں پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے (باقاعدہ) آغازِ کار کے بغیر لیگ کی تقریباً بیس شاخیں قائم ہوگئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر پنجاب مسلم لیگ کے کچھ عہدے دار صوبے کا دورہ کرسکیں تو وہ نہ صرف رقم اکٹھی کرسکیں گے، بلکہ اس صورتِ حال کے بارے میں، جو خوش قسمتی سے خود ہی مسلمانوں کے بارے میں کانگریس کے رویے سے پیدا ہوچکی ہے، پنجاب کے عام مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں گے۔[۵۴]

....

اخباروں میں جو خبریں شائع ہوتی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب یورپ میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھنے والی ہے۔ یورپ کی قوموں نے ایک اعلیٰ کلچر کی بنیاد رکھی ہے، مگر افسوس کہ ان کا عمل اس کلچر کے مقتضیات کے خلاف ہے، اس واسطے اغلب ہے کہ یہ کلچر بیکار ہوکر یورپ میں فنا ہوجائے گا۔[۵۵]

....

افسوس ہے کہ [روضۂ رسولؐ سے] جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں۔ مَیں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضورؐ کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جاسکوں، تاہم حضورؐ کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے، الطالح لی، یعنی گنہگار میرے لیے ہے۔[۵۶]

بے حد افسوس ہے کہ مَیں طویل علالت کے باعث کلکتہ میں منعقد ہونے والی فلسطین

۵۳: بنام راغب احسن، ۱۹۳۷/۸/۱۳ء، چہارم، ۵۴۶-۵۴۵ ۵۴: بنام جناح، ۱۹۳۷/۸/۱۳ء، چہارم، ۵۴۶

۵۵: بنام عبداللہ چغتائی، ؟/۱۹۳۷/۸ء، چہارم، ۵۵۶ ۵۶: بنام غلام میراں، ۱۹۳۷/۹/۶ء، چہارم، ۵۵۹-۵۵۸

اور لیگ کانفرنسوں میں شرکت سے معذور ہوں۔[57]

گذشتہ تین برس سے مَیں ایک معذور شخص کی سی زندگی گزار رہا ہوں اور حال ہی میں ڈاکٹروں نے مجھے لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا ہے، کیونکہ میری بینائی خراب ہوتی جارہی ہے۔ کئی سال پہلے میں نے مسلم یونیورسٹی کے سامنے ایک منصوبہ رکھا تھا کہ اسلامی علمی ورثے پر تحقیقی کام کے لیے علما تیار کیے جائیں، بدقسمتی سے میری آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ مَیں یہ حقیقت نہیں چھپانا چاہتا کہ جدید مابعد الطبیعیات کے تیس سالہ مطالعے کے بعد، میرا وہ جوش اور ولولہ ختم ہوگیا، جو جوانی کے زمانے میں فلسفے نے میرے اندر پیدا کر دیا تھا، تاہم خرابِ صحت کی اس حالت میں بھی، مَیں کسی حد تک ایک نوجوان محقق کے کام آ سکتا ہوں اور ان مسائل کی تفہیم میں اس کی مدد بھی کرسکتا ہوں، جنھوں نے ہمارے آبا کے دِلوں کے اندر ولولہ پیدا کیا تھا، تاہم یہ ضروری ہے کہ ایسا عالم عربی میں اچھی قدرت رکھتا ہو اور مجھ مریض کے پلنگ کے پاس بیٹھنے کے لیے کچھ وقت بھی نکال سکے۔[58]

....

بنگال میں یہ خیال ہے کہ مجھے لیگ سے ہمدردی نہیں، [حالانکہ] مَیں لیگ کے ایک سالانہ اجلاس کا صدر رہ چکا ہوں اور اِس وقت بھی پراونشل لیگ کا صدر ہوں۔[59] مَیں بہت خوشی سے کلکتہ کی آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس کی صدارت کی دعوت قبول کر لیتا، لیکن بدقسمتی سے طویل علالت نے مجھے اس امر کے ناقابل کر دیا ہے کہ مَیں ملک کی تازہ تحریکات میں کوئی سرگرم حصہ لے سکوں۔ بہرکیف، مجھے امید ہے کہ مسلمانوں کی نوجوان نسل اس نازک سیاسی دَور کی اہمیت کو سمجھے گی، جس میں سے آج کل مسلمانانِ ہند گزر رہے ہیں۔[60] اس وقت مسلمانوں کے لیے یہی راہِ عمل کھلی ہے کہ وہ مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں اپنی تنظیم کریں۔ مجھ کو ان کی دیانت پر کُلی اعتماد ہے۔[61]

۵۷: بنام راغب احسن، ۱۹/۹/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۶۹
۵۸: بنام فضل کریم، ۱۹/۹/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۷۱-۵۷۳
۵۹: بنام راغب احسن، ۲۳/۹/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۷۴
۶۰: بنام محمد نعمان، ۲۳/۹/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۷۶-۵۷۷
۶۱: بنام راغب احسن، ۲۳/۹/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۷۴

اب جب کہ مَیں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری استعدادیں تھک گئی ہیں تو مجھے اس دردناک حقیقت کا احساس ہو رہا ہے کہ سیاسیاتِ ہند میں بعض ایسی نئی قوتیں برسرِ عمل ہیں، جو ہندوستان میں اسلام اور اس کے تمدن کے مستقبل پر بُری طرح اثر انداز ہوں گی۔ جن علمائے اسلام نے سیاسیاتِ ہند میں حصہ لیا ہے، ان کے کردار سے عیاں ہے کہ انھیں ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کا قطعی تصور نہیں ہے؛ بلکہ وہ علما، جو دوسروں سے زیادہ علم رکھتے ہیں، حقیقت میں اُن سے کہیں زیادہ احمق ثابت ہوئے ہیں۔[۶۲]

مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس میں پنجاب سے خاصی تعداد کی شرکت کی توقع ہے۔ یونینسٹ مسلمان بھی سرسکندر حیات کی قیادت میں شرکت کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں۔ ہم ایک پُرآشوب دَور سے گزر رہے ہیں اور ہندوستانی مسلمان امید کرتے ہیں کہ [جناح] اپنے خطبے میں جملہ امور میں، جن کا تعلق قوم کے مستقبل سے ہے، ان کی کامل اور واضح ترین راہنمائی فرمائیں گے۔ میری تجویز ہے کہ مسلم لیگ ایک مناسب قرارداد کی صورت میں کمیونل ایوارڈ سے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان یا مکرر وضاحت کر دے۔ پنجاب اور معلوم ہوا ہے کہ سندھ میں بھی بعض گمراہ مسلمان اس فیصلے کو اس طرح تبدیل کرنے کے لیے تیار ہیں کہ یہ ہندوؤں کے حق میں زیادہ مفید ہو جائے۔ ایسے لوگ بخوشی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندوؤں کو خوش کر کے وہ اپنا اقتدار بحال رکھ سکیں گے۔ ذاتی طور پر مَیں سمجھتا ہوں کہ برطانوی حکومت ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتی ہے، جو کمیونل ایوارڈ میں رخنہ اندازی کرانے کو خوش آمدید کہیں گے؛ لہٰذا وہ (برطانوی حکومت) کوشش کر رہی ہے کہ اپنے مسلم ایجنٹوں کے ذریعے اس میں رخنہ اندازی کرائے۔ مسلم لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لیے مَیں اٹھائیس افراد کی فہرست تیار کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ انتخاب پورے غور وخوض سے کیا جائے گا۔ ہمارے آدمی تیرہ تاریخ کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔ مسلم لیگ یہ قرارداد پاس کرے کہ کوئی صوبہ دوسری اقوام کے ساتھ کمیونل ایوارڈ سے متعلق کوئی سمجھوتا کرنے کا مجاز

۶۲: بنام نواب بہاولپور؟ ۷/۹/۱۹۳۷ء، (بحوالہ زندہ رود، ۷۰۳)

نہ ہوگا۔ چونکہ یہ ایک کُل ہند مسئلہ ہے، لہٰذا اس کو طے کرنے کا حق صرف مسلم لیگ کو ہی حاصل ہوگا۔ ممکن ہے، ایک قدم آگے بڑھا کر...... [جناح] یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ فضا کسی فرقہ وارانہ مصالحت کے لیے سازگار نہیں۔[۶۳]

مسلم لیگ کے مقاصد کے لیے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ہمارے لیے یہ نادر موقع ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسلم لیگ اس مسئلے پر ایک پُر زور قرارداد ہی منظور نہ کرے گی، بلکہ لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس میں کوئی ایسا مثبت لائحہ عمل بھی تیار کیا جائے گا، جس میں مسلمان عوام بڑی تعداد میں شامل ہوسکیں۔ اس سے (ایک طرف تو) مسلم لیگ کو فوری طور پر ہردل عزیزی حاصل ہوگی اور (دوسری طرف) شاید فلسطین کے عربوں کو [بھی] فائدہ پہنچ جائے۔ ذاتی طور پر مَیں کسی ایسے امر کے لیے، جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو، جیل جانے کی بھی پروا نہیں کروں گا۔ مشرق کے عین دروازے پر ایک مغربی چھاؤنی کا قیام (اسلام اور ہندوستان) دونوں کے لیے پُرخطر ہے۔[۶۴]

ہمیں مسلمانوں کی تنظیم کا کام زیادہ گرم جوشی کے ساتھ جاری رکھنا ہے اور اس وقت تک دم نہ لینا چاہیے، جب تک پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہوسکتی اور بلوچستان کو اصلاحات نہیں ملتیں۔[۶۵]

ہمارے آدمی صوبے میں دَورے کررہے ہیں اور مختلف مقامات پر لیگ کی شاخیں قائم کررہے ہیں۔ گذشتہ شب لاہور میں ایک نہایت کامیاب جلسہ منعقد ہوا، ایسے ہی اور بھی جلسے ہوں گے۔[۶۶]

یہاں افواہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک حصہ لیگ کے مسلک پر دستخط کرنے کو تیار نہیں۔ ابھی تک سرسکندر اور ان کی پارٹی نے دستخط نہیں کیے اور آج صبح معلوم ہوا کہ وہ لیگ کے آئندہ اجلاس تک انتظار کریں گے۔ جیسا کہ خود اُن میں سے ایک ممبر نے مجھ سے کہا،

۶۳: بنام جناح، ۱۰/۷/۱۹۳۷ء، چہارم، ۵۹۲۔ ۵۹۳ ۶۴: ایضاً، ۵۹۳

۶۵: بنام جناح، ۱۰/۳۰/۱۹۳۷ء، چہارم، ۶۰۰ ۶۶: بنام جناح، ۱۱/۱/۱۹۳۷ء، چہارم، ۶۰۱

ان کا منشا صوبائی لیگ کی سرگرمیوں کو کمزور کر دینا ہے۔[67]

سر سکندر حیات خاں اپنی پارٹی کے چند ممبران کے ساتھ کل میرے پاس تشریف لائے۔ لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے اختلافات پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ طرفین کی طرف سے اس سے پہلے بھی اخبارات میں بیانات شائع ہوئے ہیں اور ہر فریق نے جناح سکندر معاہدہ کی شرائط کی اپنے مقصد کے موافق اپنی اپنی تاویل کی ہے۔ اس سے بہت زیادہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ سر سکندر حیات نے مجھے بتایا ہے کہ...... [جناح] نے یہ قبول کر لیا تھا [کہ صوبائی پارلیمنٹری بورڈ یونینسٹ پارٹی کے اختیار میں رہے[68]]، لہٰذا اُن کا مطالبہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کو بورڈ میں اکثریت حاصل ہونی چاہیے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، ایسی شرط جناح سکندر معاہدے میں موجود نہیں۔[69]

لکھنؤ میں...... [جناح] کے اور سر سکندر کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، وہ صوبے بھر میں شدید اختلافات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ سر سکندر نے پنجاب واپس آتے ہی ایک بیان شائع کر دیا تھا کہ 'جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے، سابقہ صورتِ حال ہنوز قائم اور بحال ہے، البتہ اس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلم ارکان کو، جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں، مشورہ دیا جائے گا کہ اگر وہ پسند کریں تو لیگ میں شامل ہو جائیں؛ اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ آئندہ ضمنی انتخابات میں جو مسلم امیدوار لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے، انھیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ کامیاب ہونے کے بعد وہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔ اس کے عوض انتخابات کی جنگ میں انھیں یونینسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہوگی۔' سر سکندر کی جماعت کے بعض دیگر ارکان نے بھی اس قسم کے بیان شائع کیے ہیں کہ 'جناح سکندر پیکٹ کی رُو سے پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ، یونینسٹ پارٹی کے قبضے میں چلا جائے گا'۔ سر چھوٹو رام نے اپنے دستخط سے ایک بیان اخبارات کو دیا ہے، جس

67: بنام جناح، ۳۰/۱۰/۱۹۳۷ء، چہارم، ۶۰۰
68: بنام جناح، ۱/۱۱/۱۹۳۷ء، چہارم، ۶۰۰-۶۰۱
69: ایضاً، ۶۰۱

میں انھوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ 'آئندہ لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی اور وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بن کر رہ جائے گی'۔ یونینسٹ پارٹی کے ارکان کی ان تصریحات سے مسلمانانِ پنجاب میں زبردست ہیجان واضطراب پیدا ہو گیا ہے اور وہ سخت حیران ہیں کہ ایسا معاہدہ کیوں کیا گیا، جس کے تحت لیگ کی مستقل حیثیت کالعدم ہو گئی ہے اور وہ یونینسٹ پارٹی کی ایک ماتحت جماعت بنا دی گئی ہے، حالانکہ عوام کی نگاہ میں یونینسٹ پارٹی بدترین رجعت پسندوں کا ایک گروہ ہے۔ فروری ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاسِ خصوصی لاہور میں منعقد کرنے کے متعلق جہاں تک سر سکندر کی دعوت کا تعلق ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن ہم اس وقت تک کوئی تجویز پیش کرنے کے قابل نہیں ہیں، جب تک اس قسم کا واضح اور غیر مبہم سمجھوتا نہ ہو جائے کہ سر سکندر کی پارٹی کے مسلمان ارکان کسی مزید تاخیر کے بغیر، مسلم لیگ کے حلف نامے اور قرطاس رکنیت پر دستخط کر دیں اور اعلان کریں کہ اسمبلی کے اندر بھی ان کی جماعت مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی۔ جہاں تک صورتِ حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ سر سکندر حیات خاں کی طرف سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے سے بچ جائیں۔ پراونشل مسلم لیگ اس وقت موجود ہے اور ہم ہر ضلع، ہر تحصیل اور اکثر دیہات میں لیگ کی مقامی شاخیں قائم کر رہے ہیں، اس لیے پنجاب میں کسی آرگنائزنگ کمیٹی کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک سر سکندر اور میاں احمد یار خاں دولتانہ کا تعلق ہے، اس مسئلے کے حل کا انحصار بیشتر اُن کے اس فیصلے پر ہے کہ وہ لیگ کے ٹکٹ پر دستخط کر دیں اور کسی مزید تاخیر کے بغیر اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیں۔ اگر وہ اس معاہدے پر عمل کریں تو یہ خیال رکھا جائے کہ ان کی نیابت کسی صورت میں موجودہ مسلم لیگ پارٹی کی نیابت سے تجاوز نہ کرنے پائے۔[۷۰]

۷۰: بنام جناح، ۱۹۳۷/۱۱/۸ء، چہارم، ۲۰۳-۲۰۸

صوبے کی رائے سے پوری آگاہی رکھتے ہوئے مَیں مسلم لیگ کو سر سکندر اور ان کے احباب کے حوالے کر دینے کی ذِمہ داری نہیں لے سکتا۔ اس معاہدے سے، پہلے ہی لیگ کے وقار کو صدمہ پہنچا ہے اور یونینسٹوں کے ہتھکنڈے اسے اَور بھی نقصان پہنچائیں گے۔ انھوں نے ابھی مسلم لیگ کے منشور پر دستخط نہیں کیے ہیں اور مَیں سمجھتا ہوں، نہ ہی وہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس وہ فروری کی بجائے اپریل میں چاہتے ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ وہ صوبے میں اپنی زمیندارہ لیگ کے قیام واستحکام کے لیے مہلت چاہتے ہیں۔ لکھنؤ سے واپسی پر سر سکندر نے ایک زمیندارہ لیگ قائم کی ہے، جس کی شاخیں اب صوبہ بھر میں قائم کی جا رہی ہیں۔[۷۱]

....

دوا کا استعمال باقاعدہ ہو رہا ہے، لیکن پیٹھ کا درد، جو پہلے رُوح الذہب کے کھانے سے دُور ہو گیا تھا، اب پھر ہوتا ہے۔ یہ درد عموماً رات کو ہوتا ہے، دِن میں نہیں۔[۷۲] پتھر کا ریزہ پیشاب کے ساتھ خارج ہوا۔ حکیم صاحب نے جو دوا تقویتِ صلب کی ارسال فرمائی تھی، اس پتھر کا اتنی جلدی خارج ہو جانا اسی دوا کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔[۷۳] گرمی میں بلغم بہت کم تھی، اب جوں جوں سردی زیادہ ہوتی جاتی ہے، بلغم میں بھی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ صبح قریباً ایک گھنٹے تک بلغم جاری رہتی ہے۔ دوسرے اوقات میں کبھی آتی ہے، کبھی نہیں آتی ہے۔ بلغم کچی ہوتی ہے اور اس کے نکل جانے سے آواز میں صفائی اور ترقی پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ قلب کے قریب سے جو نالی گزرتی ہے، اسی میں یہ بلغم پیدا ہوتی ہے۔ شاید اطبا اس کا سرچشمہ دِماغ بتاتے ہیں۔[۷۴]

ڈاکٹر متھر اداس صاحب...... آج [۲؍دسمبر کو] خود تشریف لے آئے اور میری آنکھ کا معائنہ کیا۔ ان کا خیال ہے کہ موتیا بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ماہِ مارچ میں آپریشن کے لائق ہو جائے، مگر فروری میں پھر معائنہ کریں گے۔ اگر مارچ میں آپریشن کے

۷۱: بنام جناح، ۱۰؍۱۱؍۱۹۳۷ء، چہارم، ۶۰۹
۷۲: بنام مظفر الدین، ۱۸؍۱۰؍۱۹۳۷ء، چہارم، ۶۱۰
۷۳: بنام مظفر الدین، ۲۷؍۱۱؍۱۹۳۷ء، چہارم، ۶۱۲
۷۴: ایضاً، ۶۱۴

لیے آنکھ پختہ نہ ہوئی اور آپریشن کی ضرورت گرمیوں میں محسوس ہوئی تو پھر آپریشن مسوری پہاڑ پر کیا جائے گا۔ مارچ میں ہوا تو لاہور میں ہو جائے گا اور اگر اس نے اکتوبر تک طول کھینچا، اکتوبر میں لاہور میں ہی ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ انھوں نے ہر طرح اطمینان دِلایا ہے کہ آپریشن نہایت عمدگی کے ساتھ ہوگا اور پوری بصارت عود کر آئے گی۔[۷۵]

....

سر سکندر حیات خاں نے انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے نام اپنے پیغام میں میرے متعلق جن پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا ہے، مَیں ان کا ممنون ہوں، لیکن مَیں ان کی پیش کردہ تجویز کہ میرے کلام اور افکار میں دلچسپی رکھنے والے سب مل کر مجھے تھیلی پیش کریں، کے متعلق مَیں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں قوم کی اجتماعی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے مقابلے میں ایک شخص کی انفرادی ضرورت کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اگرچہ اس شخص کی شاعری نے کئی انسانوں کی روح کو جلا ہی کیوں نہ بخشی ہو۔ فرد اور اس کی احتیاج بہرحال ختم ہو جانے والی چیز ہے، لیکن قوم اور اس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔ آج وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی علوم کی جدید طریقوں کے مطابق تحقیق کے لیے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک شعبہ قائم کیا جائے۔ مَیں ایک سو روپے کی حقیر رقم اس مجوزہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں۔[۷۶]

....

وہ دوائی، جو مونگ کے دانے کے برابر روزانہ استعمال کے لیے تھی، ایک مدت (جب سے آئی ہے) سے استعمال ہو رہی ہے، مگر بلغم کی تولید پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ تھوڑی سی حرکت کرنے، مثلاً کپڑے بدلنے یا دس بیس قدم چلنے سے میرا دم پھول جاتا ہے اور اس کے بعد جب تک پانچ سات منٹ تک بیٹھ نہ جاؤں یا لیٹ نہ جاؤں، دم ٹھیک نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں کہ یہ نتیجہ اعصاب کی کمزوری کا ہے یا پھیپھڑوں یا قلب کی کمزوری کی وجہ سے۔ اس سے پہلے اگرچہ دم پھولتا تھا، تاہم اس طرح نہیں ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

۷۵: بنام شیخ اعجاز احمد، ۱۹۳۷/۱۲/۲ء، چہارم، ۶۱۷، ۶۱۸   ۷۶: Speeches, p-296 (ترجمہ جاوید اقبال)

میرے جسم میں (یورک ایسڈ) کا مواد ہے، جو کبھی نقرس کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، کبھی پٹھے یا زانو کی تکلیف کی صورت میں۔ حملہ اگرچہ شدید نہیں ہوتا، تاہم کوئی مہینا خالی نہیں جاتا، جب یہ تکلیف نہ ہو۔"

۷۷: بنام مظفرالدین، ۱۸/۱۲/۱۹۳۷ء، چہارم، ۶۲۳

۱۹۳۸ء

عہد حاضر علم و دانش اور سائنسی اختراعات میں اپنی بے مثال ترقی پر بجا طور پر مفتخر ہے۔ آج زمان و مکاں کی تمام وسعتیں سمٹ رہی ہیں اور انسان قدرت کے راز افشا کر کے اس کی قوتوں کو اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے، لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے ڈیما کریسی، نیشنلزم، کمیونزم، فاشزم اور نجانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا کے کونے کونے میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک ورق بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ نام نہاد سیاست دان، جنھیں قیادت عوام اور انتظامِ حکومت کی ذِمہ داری سونپی گئی تھی، قتل و غارت اور ظلم و استبداد کے شیاطین ثابت ہوئے ہیں اور ان حاکموں نے اپنے اپنے مخصوص گروہوں کے طمع اور حرص کی خاطر لاکھوں انسانوں کا خون بہایا ہے اور کروڑوں کو اپنا محکوم بنا لیا ہے۔ ایبے سینیا ہو یا فلسطین، ہسپانیہ ہو یا چین، انسان کے ہر ارضی گھر پر غم و اندوہ کے بادل چھائے ہیں اور سیکڑوں، بلکہ ہزاروں انسان روز بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیے جاتے ہیں۔ سائنس کی تیار کی ہوئی تباہی مشینیں انسانی تمدن کے حاصل کردہ عظیم شاہکاروں کو نیست و نابود کرتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ حکومتیں، جو بجائے خود اس آگ اور خون کے ڈرامے میں ملوث نہیں، معاشی طور پر کمزور اقوام کا خون چوس رہی ہیں۔ جب تک اس نام نہاد ڈیما کریسی، لعنتی نیشنلزم اور ذلت آمیز امپیریلزم کا قلع قمع نہیں کیا جاتا، جب تک انسان

اپنے اعمال کے ذریعے یہ مظاہرہ نہیں کرتے کہ ان کے عقیدے کے مطابق ساری دنیا خداوند تعالیٰ کا ایک واحد خاندان ہے، جب تک نسل، رنگ اور علاقائی قومیتوں کے امتیازات قطعی طور پر مٹا نہیں دیے جاتے، اس دنیا میں انسانوں کو کبھی بھی خوشی، مسرت اور اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہوگی اور آزادی، مساوات اور اخوت کے حسین تخیل کو کبھی بھی حقیقت کا جامہ نہ پہنایا جا سکے گا۔[1]

....

وہ تقریب، جسے یومِ اقبال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس میں میرے لیے صرف یہ خیال باعثِ طمانیت قلب ہے کہ جس زمین میں مَیں نے اپنا بیج پھینکا تھا، وہ زمین شور نہیں ہے۔[2]

....

[حج کا] ارادہ تو ہے، بشرطیکہ صحت اجازت دے، ورنہ اب کے نہیں تو اگلے سال سہی۔ آگے، جو اللہ کو منظور۔ ایک طرح سے تو مَیں حج ہی کے راستے میں ہوں۔ چاہتا ہوں، یہ راستہ جلد طے ہو جائے۔ یہ راستہ طے تو ہو جاتا ہے، لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ مَیں تو اَب جو کچھ کہتا ہوں، وہیں کے لیے کہتا ہوں۔ آستانہ اقدس پر پہنچ جاؤں تو کچھ اَور بھی عرض کروں۔[3]

....

مجھے تو مسلمانوں کے مستقبل سے قطعاً مایوسی نہیں۔ ہمارا کوئی مسئلہ ہے تو قیادت۔ ہمارے دعوے اور ہمارے اقدامات ہی اس امر کا ثبوت ہیں کہ ہم میں ہر طرح کی استعداد موجود ہے، نہیں موجود تو قیادت۔ مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ ہمیں میں سے کوئی صاحبِ ایمان اُٹھ کھڑا ہوگا اور اس کا خلوص اور دیانت ساری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دے گا۔ یہ محض خیال ہی خیال نہیں ہے، حقیقت ہے۔ ہمارے مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ اتحاد۔ مسلمان متحد ہو گئے تو ان کی جداگانہ قومیت تسلیم کر لی جائے گی۔ جداگانہ قومیت تسلیم کر لی گئی تو ہم

1: Speeches, p-298-300 (ترجمہ جاوید اقبال)　　2: عبداللطیف، ؟/۱/۱۹۳۸ء، چہارم، ۶۲۹
3: اقبال کے حضور، ۳۷-۳۸

آزادی سے اپنا مستقبل تعمیر کر سکیں گے۔ کانگریس کیسے گوارا کرے گی کہ حصولِ آزادی کے بعد وہ اس وحدت سے دست کش ہو جائے، جس پر آج اسے اصرار ہے اور جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کے جداگانہ ملّی وجود سے انکار کر رہی ہے۔ پھر صوبوں سے کانگریس کا مطلب صوبے ہیں، نہ کہ باعتبارِ مذہب ان کی الگ الگ آبادی کہ مذہب کی بنا پر اس کا ایک حصہ دوسرے سے الگ ہو جائے یا کسی ایسے نظامِ مدنیت کے نفاذ کا مطالبہ کرے، جس سے دوسرے کو اختلاف ہو۔ صوبے مرکز سے ملحق رہیں یا بے تعلق ہو جائیں، ان کا مدارِ سیاست بہرحال وہی لادین سیاست ہوگی، جو محض جغرافی قومیت کی قائل اور اسے بنائے اجتماع سمجھتی ہے، لہٰذا نہ غیر مسلم کسی ایسے مطالبے میں، جس کی بنا اسلام پر ہے، مسلمانوں کا ساتھ دیں گے نہ ان کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ بحیثیت مسلمان اپنے آپ کو ہندوستان سے الگ کر سکیں۔ اگر کانگریس فی الواقعہ سمجھتی ہے کہ حصولِ آزادی پر مسلمانوں کو حق ہوگا کہ اگر چاہیں تو اپنے مخصوص نظامِ مدنیت کے پیشِ نظر مرکز سے الگ ہو جائیں تو اسے آج ہماری جداگانہ قومیت سے کیوں انکار ہے؟ کیوں نہ آج ہی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور اس لیے سیاسی سمجھ بوجھ کا تقاضا ہے کہ ان میں باہم کوئی سمجھوتا ہو جائے۔

اس [یونینسٹ] پارٹی کے سامنے صرف زمینداروں کا مفاد ہے۔ یہ پارٹی بظاہر مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی ہے، اس میں اکثریت بھی مسلمانوں کی ہے، لیکن اس کے مسلمان عناصر اسلام ہی کے نام پر اسلام کی نفی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان نہ اس سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے، نہ تقویت۔ ہاں، فائدے میں ہیں تو چند اہلِ غرض اور ان کی کوشش بھی یہی کہ اپنی جماعت مضبوط کرتے چلے جائیں۔ اگر میرا خیال غلط نہیں تو حکومت اور روپیہ ہی وہ چیز ہے، جو بالآخر اس کے زوال کا موجب ہوگا۔ جیسے جیسے یونینسٹ پارٹی کی گرفت بڑھتی جائے گی، ویسے ہی عامۃ المسلمین اس سے بدظن ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ محسوس کریں گے کہ اس پارٹی کا وجود ان کی عزت اور خودداری کے راستے میں حائل ہے۔

۴: اقبال کے حضور، ۴۵۔۴۷

جیسے جیسے کانگریس متحدہ قومیت کی آڑ میں اپنا دستِ تغلب دراز کرے گی، مسلمان خود ہی ان جماعتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے، جن کا دانسہ یا نادانستہ خیال ہے کہ ہندو اور مسلمان باہم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں۔[۵]

....

یہ امر بڑا افسوس ناک ہے کہ کسی شخص [ابوالکلام آزاد] کا علم وفضل یا احترامِ ذات ہمیں حق گوئی سے باز رکھے اور وہ بھی اُن مسائل میں، جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہے۔[۶]

....

میری سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ذرا سی حرکت سے میرا دم پھول جاتا ہے، یہاں تک کہ مسلسل پانی کا آدھا گلاس پینا، یہ سب چیزیں تنفس پر اثر کرتی ہیں۔ بعض دفعہ رات کو پچھلے پہر بھی تنفس تکلیف دیتا ہے اور حکیم قرشی صاحب کے جوشاندہ، جس میں عناب، گاؤزبان اور ابریشم وغیرہ ہے، کے پینے سے آرام ملتا ہے۔ ریح کے اخراج سے بھی تنفس پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تنفس کی تکلیف شدتِ برودت کی وجہ سے ہے یا ریح کی وجہ سے؟ قریباً چار سال ہوئے ہیں، حکیم صاحب نے فرمایا تھا کہ تمھاری بیماری اصل میں مرضِ دمہ کی ایک ہلکی سی صورت ہے۔ اب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کا ارشاد بالکل بجا تھا۔ تنفس کی یہ حالت اس سے پہلے کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ دم پھولتا تھا، مگر موجودہ حالت صرف اسی موسمِ سرما میں ہوئی ہے، اس سے پہلے نہ تھی۔[۷]

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلغم اگر بند ہو جائے تو کسی قدر تکلیف رہتی ہے اور اگر ہر صبح آسانی کے ساتھ نکل جائے تو مقابلتاً حالت بہتر رہتی ہے۔ میرے انگوٹھے، زانو یا جسم کے اَور حصوں میں کبھی کبھی درد ہوتا ہے۔ یہ درد اگرچہ شدید نہیں ہوتا، تاہم دو چار دِن تکلیف ضرور دیتا ہے۔ ہر مہینے میں ایک آدھ دفعہ ضرور ہوتا ہے۔[۸]

۵: اقبال کے حضور، ۴۸ ۶: ایضاً، ۵۳

۷: مظفر الدین، ۲۲/۱/۱۹۳۸ء، چہارم، ۶۳۱-۶۳۲ ۸: بنام مظفر الدین، ۳۱/۱/۱۹۳۸ء، چہارم، ۶۳۶

سر اکبر حیدری مدار المہام دولت آصفیہ نے مجھے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا تھا۔ حیدری صاحب لکھتے ہیں، 'یہ رقم شاہی توشے خانے سے، جس کا انتظام میرے ذِمے ہے، بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے'۔ 'یہ جس کا انتظام میرے ذِمے ہے' کے الفاظ نہایت تکلیف دہ ہیں۔ مَیں نے چیک واپس کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اشعار ہو گئے ہیں[9]:

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے، اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
مَیں تو اس بارِ امانت کو اُٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے، یہ ہے میری خدائی کی زکات[10]

....

ایک روز ڈاکٹر چکرورتی آئے تھے۔ کہنے لگے، 'پنڈت جی [نہرو] سے جب بھی ذکر آیا، انھوں نے آپ سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا۔ وہ آج لاہور آ رہے ہیں، میرا جی چاہتا ہے، ان کی آپ سے ملاقات ہو جائے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟' مَیں نے کہا، 'اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، آپ کو جب موقع ملے، انھیں یہاں لے آیئے؛ لیکن دو مسئلے ہیں، ایک ہندوستان کی آزادی، دوسرا آزادی کی اس جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ۔ پنڈت جی ان دونوں مسئلوں پر غور کر کے آئیں'۔ ڈاکٹر صاحب اُس روز شام کو پھر آئے۔ کہنے لگے، 'پنڈت جی کو آج فرصت ہے، ہم لوگ آٹھ بجے حاضر ہو جائیں گے'۔ مَیں نے کہا، 'بسر و چشم تشریف لایئے'۔ کہنے لگے، 'آپ کو تکلیف تو نہیں ہوگی۔ یہ وقت شاید آپ

9: اقبال کے حضور، ۹۲۔۹۳
10: کلیاتِ اقبال اردو، ۶۵۳

کے سونے کا ہے'۔ مَیں نے ہنس کر کہا، 'آج ہم ذرا دیر سے سولیں گے، آپ حضرات آئیں تو سہی'۔ چنانچہ آٹھ بجے کے قریب پنڈت جی تشریف لائے۔ ڈاکٹر چکرورتی ان کے ساتھ تھے، دو ایک خواتین اور میاں اور بیگم افتخار الدین بھی، دیر تک گفتگو رہی۔ بس یہی سیاستِ حاضر پر تبصرہ ہوتا رہا اور وہ بھی سرسری طور پر۔ کوئی خاص مسئلہ زیرِ بحث نہیں تھا، اِلا یہ کہ روس، انگلستان، جرمنی اور اٹلی میں سیاست کا جو رنگ ہے، اس کا ذکر آیا تو سوال پیدا ہوا کہ مغرب کی ہوسِ استعمار اور جوع الارض کا نتیجہ دنیا کے حق میں کیا ہوگا، بالخصوص ایشیا کے۔ آزادی یا غلامی، اَور زیادہ غلامی! یوں باتوں باتوں میں پنڈت جی کہنے لگے، 'اگر مسلمان بلا قید شرائط کانگریس کا ساتھ دیں تو کیا اچھا ہو، آزادی کی منزل جلد طے ہو جائے اور انگریز بھی دیر تک ہمارا راستہ نہ روک سکیں'۔ اس پر مجبوراً مجھے پنڈت جی سے سوال کرنا پڑا کہ اگر مسلمان ان کی بات مان لیں اور بلا قید شرائط کانگریس کا ساتھ دیں تو آزادی کی منزل کیسے طے ہو جائے گی؟ یہ کیسے ہوگا کہ انگریز ہمارا راستہ نہ روک سکیں؟ انھوں نے کہا، 'یوں کہ ہم اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ہندو ہوں یا مسلمان، باہم شرائط طے کرنے کا خیال چھوڑ دیں'۔ مَیں نے کہا، کیسی سرگرمیاں؟ کہنے لگے، 'یہی قانون شکنی اور عدم ادائے مالیہ کی مہم'۔ مَیں نے کہا، 'ان سے تو آج تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، نہ یہ تحریکیں کامیابی سے جاری رہ سکیں۔ انگریزی فوجیں بدستور ہندوستان میں پڑی ہیں، ان کا اخراج کیسے عمل میں آئے گا؟ رہا انتقالِ اختیارات کا عمل، سو یہ ان تحریکوں کے باوجود جاری ہے اور جاری رہے گا، یوں آزادی کی منزل کیسے طے ہوگی؟' اس پر پنڈت جی کہنے لگے، 'انتقالِ اختیارات کا عمل ہی تو اصل چیز ہے۔ ہماری تحریکیں جاری رہیں تو یہ عمل تیز تر ہو جائے گا۔ ہم نے تھوڑی بہت آزادی تو حاصل کر لی ہے، یہ تحریکیں جاری رہیں تو اندرونی طور پر اَور بھی آزاد ہو جائیں گے'۔

'اور برطانوی فوجیں؟'

'ان کا کیا ہے! برطانوی فوجیں اگر ہندوستان میں پڑی ہیں تو پڑی رہیں۔ اس میں

کیا حرج ہے۔ ہم ان کی موجودگی برداشت کرتے رہیں گے، تا آنکہ ایک دِن آئے گا، جب انگریز خود ہی تنگ آ کر اس ملک سے نکل جائیں گے'۔

'تو گویا سوال آزادی کا نہیں ہے، سوال اندرونی آزادی کا ہے، لیکن اس اندرونی اور بیرونی آزادی کے مسئلے سے قطع نظر یہ تو فرمائیے، انگریز اس ملک سے کیوں تنگ آنے لگے؟ وہ اس ملک سے آپ ہی آپ کیسے نکل جائیں گے؟'

پنڈت جی نے میرے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا، بڑا قابلِ غور اور معنی خیز ہے۔ انھوں نے کہا، 'بحالتِ موجودہ یورپ کی کوئی قوم روسی ہوں یا جرمن، فرانسیسی یا اطالوی، ہندوستان کا رُخ نہیں کرے گی۔ انھیں خود ہی مشکلات درپیش ہیں، حتیٰ کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ جرمنوں کی نظر یورپ پر ہے، اٹلی کی افریقہ پر، روسی برطانوی اور فرانسیسی سلطنتیں اَب اُور زیادہ کیا پھیلیں گی۔ امریکا کو ہندوستان کی ضرورت نہیں، امریکا ہندوستان سے دُور ہے، بہت دُور۔ جاپان ہندوستان پر حملہ نہیں کرے گا، جاپان کی نگاہیں آسٹریلیا پر ہیں؛ لہٰذا جیسے جیسے ہم اندرونی طور پر آزاد ہوتے گئے اور ہم نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں، انگریز خود ہی اس ملک سے نکل جائیں گے۔ انگریز گئے تو ہم ایک دستور ساز اسمبلی طلب کریں گے اور یہ دستور ساز اسمبلی ایک اشتراکی آئین نافذ کر دے گی'۔

یہ اُس شخص کے خیالات ہیں، جو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کا نمائندہ ہے۔ اس کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ کیسا آسان ہے۔ کیسے کیسے مسلمات ہیں، جن کا اس سلسلے میں مان لینا ضروری ہے۔ اسے کہتے ہیں فریبِ نفس، اسے کہتے ہیں انگریزی محاورے میں 'جنت الحمقا'۔ پنڈت جی کی منطق بھی وہی ہے، جو گاندھی جی کی۔ دونوں کی نظر انتقالِ اختیارات پر ہے۔ دراصل کانگریس اور حکومت کی ساری لڑائی دو بنیوں کی لڑائی ہے۔ ہندوستان میں کوئی تحریک کامیابی سے چل سکتی ہے تو جب ہی کہ اقلیتوں کو اکثریت پر اعتماد ہو اور تصفیہ حقوق کا مسئلہ طے ہو جائے۔ لیکن پنڈت جی نے میری

بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پنڈت جی اس زعم میں ہیں کہ حکومت اور کانگریس میں چونکہ آخر آخر کوئی سمجھوتا ہو جائے گا، لہٰذا مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مَیں نے جب بھی انھیں سمجھانے کی کوشش کی، انھوں نے ہر بار گفتگو کا رُخ بدلا اور سارا زور اسی ایک بات پر دیا کہ مفاہمت و مصالحت کا خیال غلط ہے۔ ہمیں چاہیے، بغیر یہ سوال اُٹھائے مل کر کام کریں۔ مَیں نے تو پنڈت جی سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مفاہمت و مصالحت کے بغیر چارہ نہیں۔ یہ مفاہمت و مصالحت ہو کر رہے گی۔ یہ تقاضا ہے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا۔ مَیں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ مَیں جو کچھ کہہ رہا ہوں، یونہی نہیں کہہ رہا۔ مَیں وہی بات کہتا ہوں، جسے حق سمجھتا ہوں۔ سنیے پنڈت جی! مسلمانوں کو انگریزوں سے کوئی عشق نہیں، وہ ان کے اقتدار سے کچھ زیادہ ہی نالاں ہیں۔ رہی شہنشاہیت دشمنی، سو شہنشاہیت دشمنی میں بھی مسلمان ہندوؤں سے کچھ آگے ہی ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود پنڈت جی کی یہی کوشش رہی کہ اصل مسئلے سے گریز کریں۔[11]

میری تو شروع ہی سے رائے تھی کہ اس [یونینسٹ] پارٹی کو لیگ میں شامل نہیں کرنا چاہیے، بلکہ وہ شمولیت پر اصرار بھی کرے تو اس کی درخواست ٹھکرا دی جائے۔[12]

....

نقرس کا زہر جسم میں سرایت کر جائے تو انسان چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی سہاروں کی ضرورت ہے۔[13]

....

مولوی حسین احمد کے اس غلط خیال کی تردید مقصود ہے کہ 'قومیں اوطان سے بنتی ہیں'۔ شفیع کچھ یادداشتیں لے رہے ہیں۔[14]

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ، ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

۱۱: اقبال کے حضور، ۹۵-۱۰۱
۱۲: ایضاً، ۱۰۵
۱۳: ایضاً، ۱۲۸
۱۴: ایضاً، ۷۸

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربیؐ است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی ، تمام بولہبی است[15]

....

[مسجد شہید گنج کے بارے میں] میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ قانون شکنی کی تحریک عام کر دی جائے، بلکہ اس میں سارا ہندوستان شریک ہو۔ یوں مسجد تو شاید نہ ملے، لیکن یہ تو ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمان اپنے حقوق کے لیے ایجی ٹیشن کرنا جانتے ہیں۔ ہائی کورٹ کا فیصلہ سرتا سر غلط ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس میں قانون سے بڑھ کر سیاسی مصلحتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انگریزی حکومت کا زوال ہو چکا ہے۔ صحیح فیصلہ وہی ہے، جو جسٹس دین محمد کا ہے۔ ان کی اختلافی رائے بالکل درست ہے۔ حکومت بظاہر قانون کی آڑ لے رہی ہے، لیکن قانون کے پردے میں ایک بہت بڑا سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ حکومت چاہتی ہے، مسلمانوں کے مقابلے میں سکھوں کو مضبوط کرے۔ ہندوؤں کے لیے بھی کسی توڑ کی ضرورت ہے۔[16]

ہائی کورٹ کے فیصلے نے لیگ کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں،[17] [یعنی وہ خاموشی اختیار کرے تو یونینسٹ پارٹی کی جیت اور ایجی ٹیشن کرے تو دیگر مسلم جماعتوں کا عدم تعاون[18]]۔

تھوڑا بہت اتحاد جو لیگ کی بدولت قائم ہو گیا ہے، بڑا امید افزا ہے۔ کانگریس کسی قدر مرعوب ہے۔ اس اتحاد کے نتائج بڑے شاندار ہوں گے۔ اگر کہیں مسلمانوں کو ایک قطعہ ارض مل جائے تو اَور بھی اچھا ہو۔[19]

۱۵: کلیاتِ اقبال اردو، ۷۵۴
۱۶: اقبال کے حضور، ۱۲۱-۱۲۳
۱۷: ایضاً، ۱۲۹
۱۸: حاشیہ ا، اقبال کے حضور، ۱۲۹
۱۹: اقبال کے حضور، ۱۳۱

[دہلی کے جلسے کی] دو باتوں سے جی بہت خوش ہوا ہے۔ ایک تو جناح کے اس کہنے پر کہ 'بندے ماترم سے شرک کی بو آتی ہے'، دوسرے اس پر کہ 'ہندی ہندوستانی کی تحریک دراصل اردو پر حملہ ہے اور اردو کے پردے میں بالواسطہ اسلامی تہذیب پر'۔ مسلمان اتحاد کر لیں تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ شہید گنج کا مرحلہ کیسا کٹھن ہے، لیکن یوں اس کا حل بھی نکل آئے گا۔ [اشتراکی رہنما ایم این رائے کی طرف سے مسلمانوں کو آئینی ضمانتیں دینے اور جداگانہ انتخاب کی حمایت[20]] اس تھوڑی بہت طاقت کا نتیجہ ہے، جس کا اظہار مسلمانوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ہمارا مطالبہ قطعی طور پر یہ ہونا چاہیے کہ سندھ کا الحاق پنجاب سے کر دیا جائے۔ [جہاں تک قسمت انبالہ کی پنجاب سے علیحدگی کا تعلق ہے[21]] سکھ ہندو ہیں، انھیں ہندوؤں کے ساتھ رہنا چاہیے اور وہ ہندوؤں ہی کے ساتھ رہیں گے۔ [رہی سرحد کی طرف سے مزاحمت؟ تو[22]] موجودہ کانگریسی تحریک چشم زَدن میں ختم ہوسکتی ہے۔ جواہر لال اور جناح کی خط کتابت جاری ہے۔[23]

سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدے کے علاوہ ان کے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی تھی۔ یہ امر لیگ کونسل کے اجلاس میں بحث کے دَوران مسٹر ایم اے جناح کے نوٹس میں بھی لایا گیا اور ملک برکت علی ایم ایل اے نے مجھے بتایا کہ مسٹر ایم اے جناح نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سکندر جناح معاہدے کی تحریری شقوں کے علاوہ کسی بھی زبانی معاہدے کا وجود نہیں۔ اس معاہدے کی مختلف تاویلوں کے سبب عوام میں مسلم لیگ کی طرف یونینسٹ پارٹی کے رویے کے متعلق سخت تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ تذبذب کی یہ کیفیت تقریباً چار ماہ سے طاری ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ مسلم عوام کو حقیقی صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ لکھنؤ میں عہد کرنے کے باوجود اب تک معاہدہ لکھنؤ کی شرائط کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ سو پنجاب کے مسلم عوام کی آگاہی کی

۲۰: نذیر نیازی بحوالہ اقبال کے حضور، ۱۳۶ ۲۱: ایضاً

۲۲: ایضاً، ۱۳۷ ۲۳: اقبال کے حضور، ۱۳۵۔۱۳۷

خاطر یہ اعلان کرتا ہوں کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور اب یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ سکندر جناح پیکٹ کے بعد یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلم لیگ کا دروازہ ہر اُس مسلمان کے لیے کھلا ہے، جو لیگ کے دستور پر دستخط کرنے کو تیار ہو اور مَیں نہایت مسرت سے اعلان کرتا ہوں کہ اس وقت تک اسمبلی کے متعدد مسلم ارکان نے لیگ کے دستور پر دستخط کر دیے ہیں۔[۲۴]

....

معجون مَیں نے دو روز استعمال کی ہے اور دو روز میں اس کا یہ اثر ہوا ہے کہ بلغم کا اخراج بہت کم ہو گیا ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کہ بلغم کی تولید بھی کم ہو گئی ہے، کیونکہ بلغم کا اخراج نہ ہونے سے میری آواز پر نمایاں اثر پڑا ہے، یعنی گلا بیٹھ گیا ہے۔ پہلے یہ تھا کہ بلغم کے ہر صبح اخراج ہو جانے سے آواز صاف رہتی تھی، لیکن اس دوائی کے استعمال سے اخراج تو کم ہوتا ہے، مگر آواز بیٹھ جاتی ہے۔ تولید پر میرے خیال (میں) اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔[۲۵]

میری بھوک کم ہو گئی ہے اور نیند بھی پہلے کی طرح مسلسل نہیں آتی۔ رات کو میں چھ سات (گھنٹے) سو تو لیتا ہوں، مگر یہ نیند مسلسل نہیں ہوتی۔[۲۶]

[قرشی صاحب] نبض دیکھ گئے ہیں، لیکن کچھ بے چینی سی ہے۔ مجھے [عرق گل گاؤزبان] کا خیال ہی نہیں آیا۔[۲۷]

....

مَیں نے جناح کو لکھ دیا ہے، تین باتوں پر خاص طور سے زور دیں، (۱) آئینی تحفظات، (۲) سندھ کا الحاق پنجاب سے اور (۳) شخصی اور دیوانی قوانین کی برقراری۔[۲۸]

۲۴: زندہ رُود، ۶۹۵
۲۵: بنام مظفر الدین، ۱۹۳۸/۲/۳ء، چہارم، ۶۳۶-۶۳۷
۲۶: ایضاً، ۶۳۷
۲۷: اقبال کے حضور، ۱۴۲
۲۸: ایضاً

......[نواب مظفر خاں، سید محمد علی جعفری، سید محسن شاہ[29]] دیر تک بیٹھے آپس میں مشورہ کرتے رہے، لیکن مَیں نے معذرت کر دی تھی۔ مَیں تو جلد ہی اٹھ کر پلنگ پر آ لیٹا تھا۔ پھر جب یہ حضرات گئے تو اتنا ضرور کہتے گئے کہ ہماری راے اپیل کرنے کی ہے، لیکن مَیں نے مکرر اپنی راے کا اظہار کر دیا تھا کہ مَیں اس کے خلاف ہوں۔ افسوس ہے ایک تو اس فریق پر، جو برسرِ اقتدار ہے اور جس نے مسجد کو گرتے ہوئے دیکھا اور چپ چاپ خانہ خدا کی بے حرمتی برداشت کی، مگر پھر جب مسلمانوں کی غیرتِ ملّی نے جوش مارا تو اس نے بھی بہ تقاضاے مصلحت محسوس کیا کہ انہدامِ مسجد پر احتجاج لازم ہے اور عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ اب عدالت سے کورا جواب ملا ہے تو پریوی کونسل میں اپیل کی سوجھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وقت گزرتا جائے اور معاملہ ٹلتا رہے۔ دوسرے اُن لوگوں پر، جو ایک بیمار کے یہاں مشورے کے لیے آئے اور جنھوں نے یہ جانتے ہوئے کہ اس کی راے اپیل کے خلاف ہے، یہاں تک کہ وہ ان کے مشورے میں شریک بھی نہیں ہوا، اعلان کر دیا کہ وہ بھی اپیل کے حق میں ہے۔ یہ بڑی لغو اور نا رَوا بات ہے، سرتاسر جھوٹ اور اتہام۔ پھر ستم یہ ہے کہ انھوں نے اس ملاقات کو، جو صرف نجی گفتگو تک محدود تھی، باقاعدہ مشورے کا رنگ دے دیا اور یوں مجھے دوگونہ ایذا دی، جس کی ان سے ہرگز توقع نہیں تھی۔ مَیں نہیں سمجھتا تھا، وہ ایسا کریں گے۔ یہ کیسی بے دردی ہے! انھوں نے مجھ پر ظلم کیا اور اپنے اس فیصلے سے کہ اپیل کرنا چاہیے، مسلمانوں پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔[30]

....

ہمیں ان [حسین احمد مدنی] سے کوئی ذاتی پرخاش تو ہے نہیں، وہ ایک بیان شائع کر دیں اور صاف صاف فرما دیں کہ اسلام کی رُو سے وطن بِناے قومیت نہیں۔ وہ ایسا کریں تو ہم ان کی جرأتِ ایمانی کے اعتراف میں تین کے بجاے چھ شعر کہہ دیں گے۔ مغرب کی لادینی لوتھر کی تحریک سے پیدا ہوئی، اس لیے کہ جب حصولِ اقتدار کے جذبے نے کلیسا کی

۲۹: اقبال کے حضور، ۱۵۲ ۳۰: ایضاً، ۱۵۴-۱۵۵

سیادت ختم کر دی تو لازماً کسی ایسی اساس کی ضرورت پیش آئی، جو قوموں کے نظامِ اجتماع کو درہم برہم نہ ہونے دے۔ یہی ضرورت تھی، جس نے اہلِ یورپ کو وطن اور وطن سے نسل کی طرف مائل کیا۔ آگے چل کر یہی وطنیت دہریت کا سبب بنی۔ مولانا حسین احمد اس سادہ سی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ تاریخ سے ناواقف ہیں۔[۳۱]

ایک طرف دیو بند ہے اور درسِ حدیث، دوسری جانب یہ ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔ ذہنی اضمحلال پیدا ہوا تو تہذیبِ جدید کے مقابلے کی تاب بھی نہ رہی۔ مَیں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے مسلمان اپنی قوتِ تخلیق کھو کر دوسروں کی تقلید پر اُتر آئے ہیں۔ یہ قوتِ تخلیق ہی قوموں کے آئینِ زندگی اور تہذیب و معاشرت کی جان ہے۔[۳۲]

کیوں نہ مولوی حسین احمد اور ان کے طرف داروں سے کہہ دیا جائے کہ ہم قومیت کے مسئلے پر گفتگو کے لیے تیار ہیں، لیکن مدارِ بحث قرآن و سنت ہوگا۔[۳۳]

....

[ملک برکت علی] کا یہ خیال غلط ہے کہ 'یونینسٹ پارٹی، لیگ کے اجتماع پر اس لیے مصر ہے کہ جناح قانون شکنی کی مخالفت کریں گے، لیگ کی اکثریت ان [یونینسٹ پارٹی] کا ساتھ دے گی، لہٰذا مسلمان لیگ سے بدظن ہو جائیں گے اور کامیابی یونینسٹ پارٹی کو ہوگی'۔ میری رائے اس کے خلاف ہے۔ لیگ کا اجلاس ہونے دیجیے، قانون شکنی تو کیا، گورنر کی واپسی، بلکہ بعض وزرا کے استعفوں اور برطرفی تک کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ نئے آئین کے ماتحت ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ دو آنے دے کر لیگ کا رُکن بن جائے، بالفاظِ دیگر ہر شخص دو آنے میں حقِ رائے دہندگی خرید سکتا ہے۔ کیوں نہ لیگ کی رُکنیت کا دائرہ وسیع کریں؟ میرے خیال میں تو دو آنے کیا، لوگ دو روپے بھی بخوشی ادا کر دیں گے۔[۳۴]

مَیں [نواب] ممدوٹ کے خلاف نہیں، مجھے صرف ان کی تجویز [پریوی کونسل میں اپیل] سے اختلاف ہے۔ تھوڑے سے خلوص، دیانت اور محنت کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہوا

۳۱: اقبال کے حضور، ۱۶۶-۱۶۷ ۳۲: ایضاً، ۱۷۴

۳۳: ایضاً، ۱۷۶ ۳۴: ایضاً، ۱۸۰-۱۸۱

تو عجب نہیں کہ پانچ چھ برس میں کوئی شخص پیدا ہو جائے اور سمجھے کہ پنجاب کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ ایسا شخص نقصان میں نہیں رہے گا، اسے قیادت بھی ملے گی اور وزارت بھی۔ وزارتِ پنجاب کو بہر حال مستعفی ہو جانا چاہیے، اصولاً بھی اور اس لیے بھی کہ اسمبلی میں کوئی شخص کام کا نہیں ہے۔ نواب صاحب [ممدوٹ] اپنے رفقا سمیت لیگ میں شمولیت کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ انھیں ایسا کرنا چاہیے۔[۳۵]

[ہندوؤں کی طرف سے قسمت انبالہ کو پنجاب سے الگ کرنے کی] تجویز بڑی مبارک ہے۔ مسلمانوں کو فوراً اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ یونینسٹ پارٹی کے ہندو ارکان اگر کچھ بھی عقل رکھتے ہیں تو انھیں چاہیے، اس تجویز کو بلا تامل قبول کر لیں، اس طرح سر چھوٹو رام بآسانی وزیرِ اعظم بن جائیں گے۔[۳۶]

....

...... [خواجہ عبدالوحید] کی یہ قرارداد کہ جن لوگوں نے مسجد [شہید گنج] گرائی ہے، وہی مسلمانوں کے ہمدرد بن کر اپیل کے درپے ہیں، بہت خوب ہے: مگر ان اشخاص یا شخص کا نام کیوں نہیں لے دیتے، جنھوں نے یا جس نے ایسا کیا۔ کیوں نہ مسلمان جان لیں، ان کے یہ ہمدرد اور بہی خواہ ہیں کون؟[۳۷]

آج [مسجد کے سامنے] باجے [کے بجانے] کا سوال ہے، کل [گائے کی] قربانی کا جھگڑا ہے۔ ان سب باتوں کا مطلب سوائے اس کے اَور کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بر بنائے قومیت کوئی اتحاد ممکن نہیں۔ ہندو قومیت کا وجود بھی برائے نام ہے۔ اگر آج ہندوؤں میں مہاراشٹر کی علیحدگی کا خیال پیدا ہو رہا ہے، کل اتحادِ بنگال کا مطالبہ ہوگا۔ بے شک ہندو ایک قوم نہیں ہے، بلکہ کئی ایک قوموں کا مجموعہ [ہے]۔ اتحادِ ہند کا خیال بیرونی حملوں سے ڈر کا پیدا کردہ ہے۔ جب تک یہ ڈر باقی ہے، اتحاد کی کوششیں جاری رہیں گی، لیکن جس طرح یورپ کا اتحاد بالآخر ٹوٹا، ہندوستان کی تقسیم بھی یقینی ہے۔ اکبر کی کوشش تھی

۳۵: اقبال کے حضور، ۱۸۲ ۳۶: ایضاً ۳۷: ایضاً، ۱۸۷

کہ ہندوستان متحد ہو جائے، مگر اس سے اور زیادہ افتراق پیدا ہوا، عالمگیر کو بھی اس کوشش میں ناکامی ہوئی۔ ایک کوشش وطنی تھی، دوسری سیاسی۔[۳۸]

....

[خرابیِ صحت کے ساتھ] چار برس تو کسی نہ کسی طرح گزر گئے، اب پانچواں برس ہے۔ حکیم فقیر محمد مرحوم نے، عرصہ ہوا، مجھے دودھ اور دودھ سے بنی ہوئی چیزوں کے استعمال سے روک دیا تھا، لیکن میں نے اُس وقت ان کی اس بات کا مطلق خیال نہ کیا۔[۳۹]

دواء المسک کا استعمال شروع ہے، نیند البتہ بہت کم آتی ہے۔ جوشاندہ پیتا ہوں تو بڑا فائدہ ہوتا ہے، دمہ رُک جاتا ہے۔[۴۰]

....

مرزا [محمود احمد] صاحب کہتے ہیں، 'ہماری جماعت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اگر آپ نے ہمیں [مسلم] لیگ میں شامل نہ کیا تو مجبوراً کانگریس میں شمولیت کرنا پڑے گی۔ لیگ میں شامل ہوں یا کانگریس میں، ہم ان کی شمولیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جو جی چاہے، کریں۔ مرزا صاحب لیگ اور کانگریس سے سودا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یا تو بحیثیت ایک جماعت، وہ مسلمانوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں یا انہیں مسلمان نہیں سمجھتے۔[۴۱]

....

مسلمان اب بھی مردہ نہیں، ان میں علمی اور عملی ہر طرح کی صلاحیتیں موجود ہیں، ضرورت ہے ان سے کام لینے کی۔ اندلس اور صقلیہ میں مسلمانوں کی تباہی اُمت کے ایک جز کی تباہی تھی، امت کا وجود تو بہر حال قائم ہے۔ عالمِ اسلام، اسلام کی بدولت وجود میں آیا، اس کی ہستی اسلام سے وابستہ ہے اور اسلام ہی کی بدولت اس میں پھر زندگی پیدا ہوگی۔ اسلام ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت ہمیشہ قائم رہے گی، لہٰذا باوجود زوال وانحطاط، عالمِ اسلام بھی

۳۸: اقبال کے حضور، ۱۸۷-۱۸۸
۳۹: ایضاً، ۱۹۰
۴۰: ایضاً، ۱۹۲
۴۱: ایضاً، ۱۹۲-۱۹۳

پھر زندہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔[۴۲]

....

مَیں نے پہلے بھی کہا تھا اور اَب پھر کہتا ہوں، جاوید کی والدہ بعثت ثانیہ حاصل کر چکی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے اس [سردار بیگم] نے خود مجھ سے کہا ہے، 'میرا حشر ہو چکا'۔ جاوید کی پھوپھی آج کل یہیں ہے، وہ بھی کہتی ہے، مَیں نے خواب میں دیکھا ہے، بھابی مجھ سے کہہ رہی تھی، 'جاؤ، بانو کو دیکھ آؤ'۔ بعض اوقات خوابوں میں اس قسم کے اشارات ہو جاتے ہیں، گو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان اشاروں کا تعلق داخلی احساسات، یعنی محض اپنے خیالات سے ہے یا فی الواقعہ خارج سے کوئی خبر ملتی ہے۔ مادّی علوم نے تو بے شک بڑی ترقی کر لی ہے، لیکن مادّی علوم سے اس قسم کے مظاہر کی تحقیق میں کوئی مدد نہیں ملتی۔[۴۳]

....

صبح مجھے پھر دَمے کی شکایت ہوگئی، اللہ کے فضل سے اَب اچھا ہوں۔[۴۴]

مسلسل نیند صرف آخری گھنٹوں میں آتی ہے۔ پہلے گھنٹوں میں وقتاً فوقتاً اس میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔[۴۵]

دل تو حکیم صاحب [نابینا] سے ملنے کو بہت چاہتا ہے اور ملاقات کی ضرورت بھی ہے، اس کے علاوہ حیدری صاحب بھی دعوت دیتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی جائے۔ اس فیصلے کے لیے مَیں صدرِ اعظم صاحب اور نواب مہدی یار جنگ بہادر کا شکر گزار ہوں۔ نواب مہدی یار جنگ صاحب نے لکھا تھا کہ حیدر آباد آیئے، آپ کی آسائش کا پورا انتظام کیا جائے گا، مگر افسوس ہے کہ صحت اجازت نہیں دیتی۔[۴۶]

....

۴۲: اقبال کے حضور، ۱۹۶۔۱۹۸
۴۳: ایضاً، ۲۰۲۔۲۰۳
۴۴: ایضاً، ۲۰۷
۴۵: بنام مظفر الدین، ۱۹۳۸/۲/۱۶ء، چہارم، ۶۳۹
۴۶: ایضاً

مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے، ان میں سے بعض میں تو اصل معاملے کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، مگر بعض نے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور مولوی صاحب کو بھی اس ضمن میں خطوط لکھے ہیں۔[۴۷]

مولانا کے خیالات کے متعلق ایک پورا مضمون میرے ذہن میں ہے، کل [۱۷ فروری کو] اس کا قلم بند ہو جانا ضروری ہے۔[۴۸]

....

رات کو مجھے تنفس کی بہت تکلیف رہی۔ قریباً بارہ بجے شب سے تین بجے صبح تک۔ [۱۸ فروری کی] صبح اُٹھ کر مَیں نے ڈاکٹر کو بلوایا اور معائنہ کروایا۔ انھوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے کہ یہ دمہ ہے، مگر اس دمے کو پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ وہ دمہ ہے، جو قلب کے اعصاب کی کمزوری سے پیدا ہوتا ہے۔[۴۹]

....

جو اقتباسات ...... [طالوت صاحب] نے ...... [مولانا حسین احمد مدنی] کے خط سے درج کیے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ 'آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں'۔ اگر ان کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امرِ واقعہ کو بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے، البتہ اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کر لیں تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی۔ اس خیال سے کہ بحث تلخ اور طویل نہ ہونے پائے، اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ مولانا کا مقصود ان الفاظ سے کیا تھا۔ مَیں ان کے احترام میں کسی اَور مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں، البتہ اگر مذکورہ بالا ارشاد سے ان کا مقصود وہی ہے، جو مَیں نے اوپر لکھا ہے تو مَیں اُن کے مشورے کو اپنے ایمان اور دیانت کی رُو سے اسلام کی

۴۷: بنام طالوت، ۱۹۳۸/۲/۱۶ء، چہارم، ۶۴۰-۶۴۱ ۔ ۴۸: اقبال کے حضور، ۲۰۷

۴۹: بنام مظفر الدین، ۱۹۳۸/۲/۱۸ء، چہارم ۶۴۳

رُوح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف جانتا ہوں۔ میرے نزدیک ایسا مشورہ مولوی صاحب کے شایانِ شان نہیں اور وہ مسلمانانِ ہند کی گمراہی کا باعث ہوگا۔ اگر مولوی صاحب نے میری تحریروں کو پڑھنے کی کبھی تکلیف گوارا فرمائی ہے تو انھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ مَیں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلامی قومیت اور ملت کے اسلامی نقطہ نظر کی تشریح و توضیح میں گزارا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصوصاً اسلام کے لیے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرۂ عظیم محسوس ہوتا تھا۔ کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈا کرنا، نہ میرا اس سے پہلے مقصد تھا، نہ آج مقصود ہے؛ بلکہ وہ شخص، جو دین کو سیاسی پروپیگنڈے کا پردہ بناتا ہے، میرے نزدیک لعنتی ہے۔[50]

[مولانا حسین احمد کے نئے نظریے، یعنی 'اسلام میں قوم اور ملت دو الگ الگ وجود ہیں' کے بعد[51]] اب تو مضمون لکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ سیاست کا چکر بھی عجیب ہے۔ انگریزوں کی ضد میں کس طرح تلبیس حق بالباطل سے کام لیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ مسلمان کیوں نہیں سمجھتے، اسلام کی اجتماعی روح کیا ہے؟ وہ عالم اور صوفی کیا ہوئے، جو دین کے رمز شناس تھے۔ کیسے کیسے الفاظ ہیں، جو لوگوں کی زبانوں سے نکل رہے ہیں! قوم، متحدہ قومیت، وطن، وطنیت، آزادی، خود اختیاری؛ لیکن کوئی نہیں سمجھتا، آج کل کی سیاست میں ان کے معنی کیا ہیں؟ ان الفاظ کے معنوں کا متعین ہو جانا ضروری ہے۔ ان کا تجزیہ بھی ہو جانا چاہیے۔ یہ الفاظ عام ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے ان کو سمجھنے کی، لیکن مسلمانوں کو احساس ہی نہیں، انھیں کس قسم کی جدوجہد درپیش ہے۔ از رُوے سیاست ہی نہیں، اخلاقاً اور ذہناً بھی۔ کاش! مسلمان کوئی سیاسی فکر پیدا کریں۔[52]

مولانا حسین احمد یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ میثاقِ مدینہ ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ تعجب ہے، انھوں نے اس پر غور نہیں کیا اور ایک غلط بات کہہ دی۔ مولانا عالمِ دین ہیں، اصطلاحاتِ دینی

۵۰: بنام طالوت، ۱۹۳۸/۲/۱۸ء، چہارم، ۶۴۵-۵۴۶ ۵۱: اقبال کے حضور، ۲۱۰
۵۲: ایضاً

سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں، اُمت کے معنی کیا ہیں؟ عجیب بات ہے، انھوں نے قوم اور ملت میں امتیاز پیدا کرتے ہوئے ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔

قلندر جُز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا[۵۳]

یہ جو ارشادِ باری تعالیٰ ہے، کنتم خیر امۃ اخرجت للناس [۳:۱۱۰] تو ثابت ہوا کہ امت کی بِنا وطن کی بجائے عقیدے پر ہے اور عقیدے کا تقاضا تھا کہ حضور رسالت مآبؐ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائیں۔ میثاقِ مدینہ نے عملاً اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ مولانا حسین احمد کا فرض ہے کہ اسی اصول کی بِنا پر، جو میثاقِ مدینہ میں قائم کیا گیا، کانگریس سے مفاہمت کا مطالبہ کریں، بجائے یہ کہنے کے کہ 'قومیں اوطان سے بنتی ہیں'۔[۵۴]

....

عوارض کی تو وہی کیفیت ہے، جو تھی۔ کوئی خاص تکلیف نہیں، لیکن رات نیند ذرا کم آئی۔ صبح طبیعت مضمحل تھی، مگر دوا کھائی اور ناشتہ کیا تو اضمحلال جاتا رہا۔[۵۵]

....

مَیں سوچ رہا تھا کہ اسلامی ریاست میں جب ازرُوے میثاقِ مدینہ مسلمان اپنی جگہ پر ایک امت تھے اور غیر مسلم (یہود) اپنی جگہ پر ایک امت، گو شہریوں کی حیثیت سے حقوق اور فرائض میں سب ایک دوسرے کے شریک، تو مولانا حسین احمد کا بھی فرض تھا کہ اسی اصول کو پیشِ نظر رکھتے۔ بِنائے گفتگو ہوتی تو یہی اصول، نہ کہ وطن اور قوم کا مغربی تصور؛ لیکن مولانا ہیں کہ اب قوم اور ملت کا امتیاز قائم کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں؛ ان کے ارشاد کا تعلق قوم سے تھا، ملت سے نہیں ہے۔ معلوم نہیں، وہ یہ امتیاز کیوں پیدا کر رہے ہیں، اس سے ان کا کیا مطلب ہے؟ اسلام سے پہلے قوموں کی تشکیل جس اصول پر ہو رہی تھی، اسلام نے اسے تسلیم نہیں کیا اور آج بھی وہ اصول، جسے بِنائے قومیت ٹھہرایا جاتا ہے، ہمارے لیے

۵۳: اقبال کے حضور، ۲۱۳-۲۱۴
۵۴: ایضاً، ۲۱۴
۵۵: ایضاً، ۲۱۷

قابلِ تسلیم نہیں۔ ہماری بحث کا تعلق بھی اسی اصولِ قومیت سے ہے۔ ہمیں تو قومیت کے اس جدید تصور سے اختلاف ہے، جو مغرب کے سیاسی فکر کی پیداوار ہے اور جس کا آغاز لوتھر کی تحریک سے ہوا۔ یہ تصور سرتاسر کفر ہے، مگر افسوس ہے کہ مولانا ہر روز ایک نئی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ اب وہ لغت کا سہارا لے رہے ہیں اور ہم سے کہتے ہیں، قوم اور ملت میں فرق کریں، حالانکہ یہ مسئلہ لغت کا نہیں، قرآنِ پاک کی تعلیمات کا ہے۔ مولانا کو چاہیے، لغت کا سہارا نہ ڈھونڈیں۔ انھیں چاہیے، اس امر پر نظر رکھیں کہ قرآنِ پاک نے اگر کسی لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تو کن معنوں میں۔ یہ نہیں کہ خود اپنی طرف سے اس کا معنی و مفہوم متعین کرنے کی کوشش کریں۔ مولانا اور ان کے حامیوں کا یہ خیال بہر صورت غلط ہے کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ وطن بھی قومیت کی کوئی مستقل اساس نہیں ہے۔ فرض کیجیے، قوم کا وجود ملت سے الگ ہے، جب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک قوم یا بحیثیت ایک ملت ہندوستان کے آئینی ارتقا میں ہم اپنا مفاد کیوں کر محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ مَیں وطنی قومیت کا وجود تسلیم نہیں کرتا، وطنی قومیت کا تصور اسلام کے خلاف ہے۔[۵۶]

[سہ روزہ] انصاری [دہلی] میں مولانا حسین احمد نے ایک طویل مضمون لکھا ہے، جس میں ایک طرح سے ہمیں پھر مناظرے کی دعوت دی ہے۔ فرماتے ہیں، اگر اسلام میں بنائے معاشرہ فرد کا شرفِ ذات ہے اور مقصد اتحادِ انسانی تو قرآنِ پاک سے اس کی نص پیش کی جائے۔ اب کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے، انھیں کون سمجھائے![۵۷]

عالمِ اسلام کب سے رُو بہ انحطاط ہے۔ نہ علم باقی رہا، نہ عمل؛ نہ مدرسوں کی قیل وقال میں کچھ رکھا ہے، نہ خانقاہوں کی ہاے وہو میں؛ نہ اہلِ شریعت میں دم ہے، نہ اہلِ طریقت میں۔[۵۸]

....

قرشی صاحب کی رائے ہے، سر میں روغن لبوب سبع کی مالش ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر

۵۶: اقبال کے حضور، ۲۱۹۔ ۲۲۳ ۵۷: ایضاً، ۲۲۶

۵۸: ایضاً، ۲۲۷

جمعیت سنگھ کوئی منوم دوا تجویز کر گئے ہیں۔ حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں جملہ عوارض کا حال لکھ دیا گیا ہے۔ خدا کرے، ان کی دوائیں جلد آ جائیں۔ دمے کی تکلیف کچھ بڑھ گئی ہے۔ مَیں نے ڈاکٹر جمعیت سنگھ کو بلوایا تھا، وہ کچھ دوائیں تجویز کر گئے ہیں۔ امید ہے، ان کے استعمال سے فائدہ ہوگا۔[59]

زندگی نعمت ہے، بہت بڑی نعمت؛ لیکن اس کے ساتھ صحت کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔ میرا اشارہ انکارِ نعمت کی طرف نہیں، زوالِ نعمت کی طرف ہے۔ علم کی لذت بڑی چیز ہے، مگر اس میں کچھ مزہ ہے تو جب ہی کہ زندگی کے ساتھ صحت ہو۔ انسان کچھ کہے، کچھ کر سکے۔ یہ نہیں تو کیا ہے؟[60]

قرشی صاحب صبح سویرے ہی آ گئے تھے۔ نبض دیکھی اور کچھ دوائیں تجویز کر گئے ہیں؛ لیکن حکیم صاحب [نابینا] کے خط کا انتظار ہے، ان کی دوائیں آ جائیں تو کیا اچھا ہو۔[61]

....

چودھری [محمد حسین] صاحب ابھی دفتر گئے ہیں، [مولانا حسین احمد کے مضمون کے جواب میں] انھیں ہدایات دے دی گئی ہیں۔ [مضمون] دو ایک روز میں مرتب ہو جائے گا، پھر نظرِ ثانی بھی کر لی جائے گی۔[62]

علما مداہنت سے کام لے رہے ہیں، حالانکہ ان کا کام تھا اُمت کی رہنمائی۔ یہ صورتِ حال بڑی افسوس ناک ہے۔[63]

....

نیند بہت کم آتی ہے، ضیق کی تکلیف بھی بڑھ گئی ہے۔ میرا خیال ہے، یہ خرابی ۲۱رفروری کے جوشاندے سے پیدا ہوئی۔[64]

۵۹: اقبال کے حضور، ۲۲۶
۶۰: ایضاً، ۲۲۸
۶۱: ایضاً، ۲۳۳
۶۲: ایضاً، ۲۳۳
۶۳: ایضاً، ۲۳۹
۶۴: ایضاً، ۲۳۶

قریشی صاحب صبح سویرے ہی آ گئے تھے۔ دیر تک بیٹھے رہے اور کوئی دوا بھی تجویز کر گئے ہیں۔[۶۵]

....

سارا معاملہ پنجاب کے زمینداروں کا ہے۔ پنجاب کے زمیندار کب سمجھیں گے؟ انھیں کب احساس ہوگا، یونینسٹ پارٹی کی سیاست بڑی ناقص ہے۔[۶۶]

....

یہ لوگ [مولانا حسین احمد اور کانگریسی خیال علما] جذبات کی رَو میں بہہ رہے ہیں۔ مسلمانوں میں ایک افرنگ زدہ طبقہ پیدا ہو گیا تھا، بظاہر اب یہی طبقہ اسلام کی طرف لوٹ رہا ہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کوٹ اور پتلون کے مقابلے میں، جسے گویا دہریت کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب سیاست اور تمدن کے وہ افرنگی تصورات، جو اسلام کی ضد ہیں، جبہ اور دستار میں پناہ لے رہے ہیں۔[۶۷]

....

ڈاکٹر صاحب نے دوا بدل دی ہے۔ کہتے ہیں، جلد افاقہ ہو جائے گا۔ حکیم صاحب بھی حسب معمول بہت سویرے آ گئے تھے، دیر تک بیٹھے رہے۔ انھوں نے بھی کچھ تدبیر کی ہیں۔ کوئی مالش کی دوا اور خواب آور روغن، کچھ عرق اور جوارش۔ حیدر آباد سے البتہ کوئی اطلاع نہیں آئی، تعجب ہے![۶۸]

الحمد للہ، اب اچھا ہوں، پچھلے پہر بڑی تکلیف ہو گئی تھی۔ حکیم صاحب کو چاہیے، حسب معمول مطب میں بیٹھیں۔ اَور بھی تو مریض ہیں، انھیں سب کو دیکھنا ہوگا۔ ضرورت محسوس ہوئی تو دوپہر میں بلوا لیا جائے گا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تکلیف کیوں ہوئی؟ اس کا فیصلہ تو ڈاکٹر صاحبان ہی کر سکتے ہیں۔ بہر حال، مَیں نے طے کر لیا ہے کہ ایلو پیتھک دوائیں استعمال نہیں کروں گا۔ حکیم صاحب جو تدبیر کریں گے، اسی پر عمل رہے گا۔ آج بھی

۶۵: اقبال کے حضور، ۲۴۱ — ۶۶: ایضاً، ۲۳۹

۶۷: ایضاً، ۲۴۷ — ۶۸: ایضاً، ۲۴۴

انھی کی دوا سے بڑا فائدہ ہوا۔ عرقِ گل گاؤزبان تو بہت راس آتا ہے۔[69]

....

علما حضرات کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ اپنی انگریز دشمنی میں کانگریس کا ساتھ دے رہے اور غیر اسلامی تصورات قبول کر رہے ہیں۔ کسی وقت انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے پر سرسید کی بڑی سختی سے تنقید کی تھی۔ یہ تنقید خلوص پر مبنی تھی اور اس میں ایک عنصر صداقت کا بھی موجود تھا، لیکن کانگریسی خیال علما ہندوؤں کا ساتھ دے کر اس سے بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اگر قوم نے ان کا ساتھ دیا تو اس کا نتیجہ نہایت مہلک ہوگا۔[70]

انگریز دشمنی سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہم اسلام دشمنی اختیار کر لیں۔ یہ کیا انگریز دشمنی ہے، جس سے اسلام کو ضعف پہنچے۔ اربابِ دیوبند کو سمجھنا چاہیے کہ اس دشمنی میں وہ نادانستہ اُس راستے پر چل رہے ہیں، جو انگریزوں کا تجویز کردہ ہے۔ انگریز چاہتے ہیں، مسلمان جغرافی وطنیت کا اصول اختیار کر لیں، تاکہ اسلام کی حیثیت ایک عقیدے سے زیادہ نہ رہے اور اُمت، یعنی بطور ایک سیاسی اجتماعی نظام کے، اس کی وحدت ختم ہو جائے۔ یہ کیسی انگریز دشمنی ہے؟ یہ تو ان کے ہاتھوں میں کھیلنا ہے۔ [دوسری طرف] عقائد میں تشدد، تعصب اور تنگ نظری اگر اسلام کے لیے ہے تو بڑی مبارک بات ہے، لیکن اگر اس لیے ہے کہ اہلِ حدیث سوادِ اعظم سے کٹ جائیں اور اُمت کی وحدت درہم برہم ہو جائے تو ازحد قابلِ افسوس! یوں مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوا تو اندیشہ ہے، ان میں اَور بھی طرح طرح کے غیر اسلامی تصورات پھیلتے چلے جائیں گے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی تو پہلے ہی سے یہ خواہش ہے کہ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، مسلمان مذہب کو خیرباد کہہ دیں۔ یہ کیسی انگریز دشمنی ہے کہ ان کی مخالفت میں ہم اسلام کا پاس رکھیں نہ مسلمانوں کے مستقبل کا، بلکہ اُلٹا اُن کے ہاتھوں میں کھیلنے لگیں۔[71]

۶۹: اقبال کے حضور، ۲۵۰

۷۰: ایضاً، ۲۵۵-۲۵۶

۷۱: ایضاً، ۲۶۱-۲۶۳

[قادیانیوں کا یہ کہنا کہ ہم سب کو ایک ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہندو ہم سب کو ایک سمجھتے ہیں[72]] خوب منطق ہے۔ اسلام کی بنا پر تو ہم ایک ہیں نہ ایک ہو سکتے ہیں، البتہ ایک ہیں اور ہو سکتے ہیں تو ہندوؤں کے اس کہنے پر کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ دراصل ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو قادیانیوں کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیں، البتہ وہ ہمیں برابر کافر سمجھتے رہیں۔ یہ کیا خوب بنائے اتحاد ہے؟[73]

اس وقت جو حالات ہیں، ان میں مسلمانوں کا گزر ایک بڑے نازک مرحلے سے ہو رہا ہے۔ وہ متحد نہ ہوئے اور نہیں سمجھے کہ اسلام ان سے کس قسم کے عمل کا طالب ہے تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔ نئی تعلیم آئی اور الحاد اور دہریت ساتھ لائی۔ مدرسے اور خانقاہیں کب سے ویران پڑی ہیں! دیوبند کی دینی عصبیت سے بڑی بڑی توقعات تھیں، دیوبند کو کیا ہوا؟[74]

....

رات بڑے آرام سے گزری، دورہ بالکل نہیں ہوا۔ نیند بھی خوب آئی۔[75]
قریشی صاحب نے حسبِ معمول آج بھی نبض دیکھی اور کچھ تدابیر بھی کی ہیں۔[76]
مجھے صحت ہو جائے تو جہاد بالسیف کروں۔[77]

....

مُلّا کا ذہن فی الواقع عقیم ہے اور پچھلی ایک صدی کی تاریخ اس امر کی شاہد کہ مُلّا غور و فکر سے محروم ہے۔ مولانا محمد قاسم [نانوتوی] کے نام سرسید کا ایک خط ہے، جس میں وہ اپنے عقائد فہرست وار بیان کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ 'ان میں کون سی بات ہے، جس کی بنا پر علمائے سہارن پور انھیں کافر ٹھہراتے ہیں'۔ مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ سرسید کے خیالات اور ان خیالات کے ماتحت انھوں نے جو اقدامات کیے، وہ تنقید سے بالاتر نہیں۔ ان میں گفتگو کی گنجائش ہے، لیکن یہ اقدامات ضروری تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ایسا کوئی اقدام کیا جاتا،

۷۲: ماخوذ اقبال کے حضور، ۲۶۸ ۷۳: اقبال کے حضور، ۲۶۸-۲۶۹
۷۴: ایضاً، ۲۷۱ ۷۵: ایضاً، ۲۷۵
۷۶: ایضاً، ۲۷۹ ۷۷: ایضاً، ۲۸۲

جس سے مسلمانوں کی توجہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف منعطف ہوتی۔ سرسید کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے یہ اقدام کیا۔ یہ اقدام بہر حال ضروری تھا۔ یہی بات ہے، جو ان کے نکتہ چینوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ دیوبند بھی نہیں سمجھا کہ سرسید نے ایک نیا دارالعلوم قائم کیا تو کیوں؟ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند میں تعاون کی کوئی صورت پیدا ہوئی نہ مفاہمت کی۔ دونوں ایک دوسرے سے دُور ہٹتے گئے۔ ایک نے قدامت، دوسرے نے تجدد کا سہارا لیا، مگر یہ جو کچھ ہوا ٹھیک نہیں ہوا۔ مجھے دیوبند پر بحیثیت دیوبند کوئی اعتراض نہیں، وہ بھی ایک ذریعہ ہے ماضی سے ہمارے تعلق کا۔ میری پختہ رائے ہے کہ قدامت پسندی قوموں کی زندگی میں ایک تقویت بخش عنصر ہے، گو تنہا یہ عنصر کافی نہیں۔ قدامت پرستی سے کچھ مقصود ہے تو یہ کہ ہمارا ماضی محفوظ رہے، ہم ماضی ہی کو ساتھ لیے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ آگے بڑھنا ہی زندگی ہے، دیوبند آگے نہیں بڑھا۔ دیوبند کی حیثیت ایک واقعے کی ہے، تحریک کی نہیں ہے؛ جیسے علی گڑھ کی۔...... اربابِ دیوبند اگر ماضی ہی پر نظر ڈالیں تو ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ کانگریس نے آج سے پچیس سال پہلے جس آئینی جدوجہد کی ابتدا کی تھی، آزادیِ ہند کا مطالبہ اُسی جدوجہد کی مرحلہ بہ مرحلہ کامیابی کی آخری شکل ہے، لیکن اس کی رُوح اور اساس وہی ہے، جس کے پیشِ نظر سرسید نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم کانگریس سے الگ رہیں۔ کانگریس میں شرکت کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم نے اس فرضی اور خیالی، یعنی ہندوستانی قومیت کا وجود تسلیم کر لیا ہے، جو دراصل ہندو قومیت ہی کا ایک دوسرا نام ہے۔ ہندوستانی قومیت کا اقرار اُمت کے جداگانہ وجود کا انکار ہے؛ لیکن سرسید کا کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا، جو بحیثیت ایک قوم مسلمانوں کو درپیش تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت پر زور دیا۔ وہ جب تعلیم پر زور دیتے، تہذیب و تمدن میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتے، جب بھی ان کا کہنا یہی تھا کہ ہم اپنا جداگانہ ملّی وجود ہر حالت میں قائم رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم

کے قوائے علم وعمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی۔ دیو بند ایک ضرورت تھی، اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل۔ وہ روایت، جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم ہے۔ یہ ضرورت پوری ہوئی اور یوں بھی اس کا پورا ہونا ضروری تھا، لیکن دیو بند کو چاہیے تھا، اسی روشِ پر قائم رہتا، سیاست کے چکر میں نہ آتا۔ دیو بند کدھر جا رہا ہے، مولانا حسین احمد یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس وقت دو خطرے ہیں: ایک جغرافی قومیت، دوسرا وحدتِ اُمت کی نفی۔ پہلا خطرہ مغرب کے الحاد پرور خیالات، مغربی تہذیب وتمدن کے اثر ونفوذ اور نئی تعلیم کا پیدا کردہ ہے، جسے کانگریس کی لادین سیاست طرح طرح سے ہوا دے رہی ہے اور جس کا بعض علما انگریز دشمنی کے فریب میں نادانستہ خیر مقدم کر رہے ہیں، دوسرا قادیانیت کی طرف سے ہے۔ قوم کو اس وقت قیادت کی ضرورت ہے، ایسی قیادت، جس سے اس کے دل ودِماغ میں جلا پیدا ہو، جو اِن کی علمی اور عملی صلاحیتوں کو بیدار کر دے، ورنہ حالات بگڑ جائیں گے۔ بظاہر حالات بڑے نامساعد ہیں، لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر دے گا۔ سر دست ایک ہی صورت ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے، جناح کے ہاتھ مضبوط کریں، لیگ میں شامل ہو جائیں، ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اب جس طرح حل کیا جا رہا ہے، اس میں ہمارا متحدہ محاذ ہی انگریزوں اور ہندوؤں کی مخالفانہ کارروائیوں کا واحد جواب ہے۔ بغیر اس کے ہم اپنے مطالبات کیسے منوا سکتے ہیں۔ لوگ کہتے ہی، ان مطالبات سے فرقہ داری کی بو آتی ہے۔ یہ محض پروپیگنڈا ہے۔ ان مطالبات کا تعلق ہمارے قومی وجود کے تحفظ سے ہے۔ متحدہ محاذ لیگ ہی کی سربراہی میں قائم ہو سکتا ہے اور لیگ کامیاب ہو گی تو جناح کے سہارے۔ جناح کے سوا اَب کوئی شخص مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں۔[۷۸]

مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ

۷۸: اقبال کے حضور، ۲۸۲، ۲۸۶-۲۹۲، ۲۹۸

کرنے کے لیے اس سے بہتر اَور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے، چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانے کا اُلٹ پھیر بھی عجیب ہے؛ ایک وقت تھا کہ نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفرنج میں گرفتار تھے، اب علما اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریے ان کے لیے جاذبِ نظر ہیں، مگر افسوس:

نو نہ گردد کعبہ را رختِ حیات
گر ز افرنگ آیدش لات و منات

جو فتنہ مولانا حسین احمد کے ارشاد میں پوشیدہ ہے، وہ زیادہ دِقتِ نظر کا محتاج ہے۔ مولانا حسین احمد عالمِ دین ہیں اور جو نظریہ انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے، اُمتِ محمدیہ کے لیے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا، لیکن یہ احساس اُن کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا، انھوں نے لفظی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے، جو قادیانی افکار میں افکارِ خاتمیت کا۔ نظریہ وطنیت کے حامی، بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی حیثیت کے علاوہ، جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اَور حیثیت بھی اختیار کرے، جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل اکمل ہونے سے انکار ہے؛ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی اُمتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔ بظاہر نظریہ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی

'افکارِ خاتمیت' الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے، لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے، جس کی توضیح صرف اُسی وقت ہو سکے گی، جب کوئی دقیق النظر مسلمان مؤرخ ہندی مسلمان اور بالخصوص ان کے بعض بظاہر متعدد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا دِلی مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے، اس لیے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا، جس کی بنیادیں انھی اصولوں پر ہوں، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟[۷۹]

....

دوائیں جاری ہیں، لیکن ایلو پیتھک علاج مجھے کچھ بہت زیادہ پسند نہیں۔ ترشی کو ترس گیا ہوں۔[۸۰] مجھے طبی ادویات پر بڑا بھروسا ہے، مَیں ان سے بدستور فائدہ اٹھاتا رہوں گا۔[۸۱]

....

مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے اور یہ اتحاد، لیگ ہی کے ذریعے ممکن ہے.... کسی قوم کا اتحاد ختم ہو جائے تو اس کی قدرتاً آرزو ہوتی ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی وحدت پھر سے حاصل کر لے۔ یوں ہی اس کی ہمت بندھتی ہے اور یوں ہی اس کا زوال و انتشار، طاقت اور جمعیت سے بدل سکتا ہے۔ بغیر اس کے، نہ اس کی حفاظت کا کوئی ذریعہ ہے، نہ سلامتی کا: لیکن یہ وحدت پھر سے پیدا ہوگی تو اسی اصول کی بدولت، جس پر اوّل اوّل اس کی اساس رکھی گئی اور جس کا اظہار حیاتِ ملّی کی مخصوص شکل میں ہوا۔ یہ بڑی غلطی ہوگی، اگر ہم اس کے لیے کوئی دوسری اساس تلاش کریں، جیسا کہ ہمارے اربابِ سیاست کر رہے ہیں۔ ناممکن ہے، مسلمان اس طرح متحد ہو سکیں۔[۸۲]

وطنیت پسند مسلمان تو خیر اپنی تعلیم و تربیت سے مجبور ہیں۔ ان کا دل و دماغ مغربی

۷۹: مقالاتِ اقبال، ۲۶۳، ۲۶۷-۲۶۸، ۲۷۸-۲۷۹ ۸۰: اقبال کے حضور، ۳۰۷

۸۱: ایضاً، ۳۱۲ ۸۲: ایضاً، ۳۱۳، ۳۱۴

تعلیم کے زیرِ اثر اس حد تک بدل چکا ہے کہ وہ کسی دوسرے رنگ میں سوچ ہی نہیں سکتے۔ یوں بھی دنیا میں ہر کہیں وطنیت کا غلبہ ہے اور بلادِ اسلامیہ میں بھی یہ جذبہ ہر کہیں اُبھر رہا ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محکوم قومیں جب کسی قوم کے ہاتھوں اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہیں اور دوسری قوموں کو آزاد یا آزاد ہوتے دیکھتی ہیں تو ان کے اندر بھی قومی اور نسلی عصبیتوں کو تحریک ہوتی ہے، لہٰذا آج کل کے نوجوان اگر نشۂ قومیت میں سرشار ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، لیکن علما کو کیا ہو گیا ہے؟ علما کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اور وطنیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام لاوطن ہے۔[۸۳]

انگریز دشمنی کوئی مثبت اصول نہیں، نہ آزادی کے کچھ معنی، جب تک یہ طے نہیں ہو جاتا کہ ہم کس مقصد کے لیے آزادی حاصل کر رہے ہیں اور کس سے۔ ہندوؤں کا ایک نقطہ نظر ہے، ان کے ذہن میں متحدہ قومیت کا ایک مثبت تصور ہے۔ وہ جانتے ہیں، آزادی کے بعد اس تصور کی عملی تعبیر کیسے ہوگی، یعنی وہ نیا معاشرہ، جو اس طرح وجود میں آئے گا، اس کی تعبیر سیاسی، معاشی اور اخلاقی اعتبار سے کس نہج پر کی جائے گی۔ اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہیں۔ کیا ان کے دیکھتے ہوئے کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ جب اس ملک کا اقتدار کانگریس کے ہاتھ میں آیا تو وہ اس وقت متحدہ قومیت کو جو شکل دے گی، منشائے اسلام کے عین مطابق ہوگی، لہٰذا ہمیں اس سے غیر مشروط تعاون پر کوئی اعتراض نہیں؟[۸۴]

....

مجھ پر چار حملے ہو چکے ہیں؛ ایک قولنج کا دَورہ، جو آج سے بہت پہلے بڑی شدت کے ساتھ ہوا تھا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں دردِ گردہ نے خاصا پریشان کیا، ۱۹۳۴ء میں گلا بیٹھ گیا اور اب چند دِنوں سے جو حالت ہے، اچھی نہیں ہے[۸۵]۔ کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔ [قریشی صاحب، راجا حسن اختر، چودھری محمد حسین، سید نذیر نیازی[۸۶]!] جائیے نہیں، بیٹھے رہیے، باتیں کیجیے۔[۸۷]

....

۸۲: اقبال کے حضور، ۳۱۳، ۳۱۴
۸۳: ایضاً، ۳۱۷
۸۴: ایضاً، ۳۲۳
۸۵: ایضاً، ۳۳۸
۸۶: ایضاً، ۳۴۱
۸۷: ایضاً

مسلمان بڑے سادہ ہیں، کیسے کیسے مغالطوں میں گرفتار ہیں۔ کانگریس کی حمایت سے تو مسلمانوں کے استخلاص اور آزادی کا راستہ نہیں کھلتا۔ یہ راستہ تو ضعف وانحطاط اور افتراق وانتشار کا ہے۔ طاقت اور قوت اتحاد وارتباط کا نہیں ہے۔ طاقت اور قوت حاصل ہو گی تو متحدہ قومیت یا کانگریس کی اصطلاح میں، ہندوستانی قوم کو۔ آزادی بھی اسی کو ملے گی اور ہندوستان کا سیاسی اقتدار بھی اسی کے ہاتھ میں رہے گا۔ یہ راستہ آئینی جدوجہد سے طے کیا جائے یا غیر آئینی طریقوں سے، دونوں صورتوں میں جو بھی فیصلہ ہوگا، اکثریت کے حق میں ہوگا، اس لیے جب تک یہ طے نہیں ہوتا کہ جو لوگ اس جدوجہد میں شریک ہیں، ان کی حیثیت بمقابلہ ایک دوسرے کے کیا ہے؟ یہ کہنا بہت بڑی غلطی ہوگی، بلکہ خودکشی کے مترادف کہ سردست مسئلہ صرف آزادی کا ہے، باقی مسائل بعد کے ہیں۔ ہندو ایسے سادہ لوح نہیں ہیں، جیسے اس خیال کے مسلمان انھیں سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ سارا فتنہ لفظ 'قوم' کا پیدا کردہ ہے۔ ہم نے اس قومیت کو قبول کر لیا تو ہماری ہستی ہندوؤں میں ضم ہو جائے گی، لہٰذا سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کانگریس جس قسم کی آزادی کی طلب گار ہے اور قوم کا جو تصور اس کے ذہن میں ہے، اسے مان لیا جائے تو اس سے کیا نتائج مترتب ہوں گے۔ کیا اس صورت میں ہمارا تہذیبی اور اجتماعی تشخص قائم رہے گا؟ جب سے مولانا حسین احمد نے لفظ 'قوم' کے متعلق ایک غیر ضروری اور سرتاسر لاحاصل بحث چھیڑی ہے، قرآن اور حدیث اور عربی لغت کے حوالوں سے عجیب وغریب موشگافیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ سوچتا ہوں، مسلمانوں کا ذہنی انحطاط کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ دین کو جاننے اور دین کو سمجھنے کے دعوے دار دین سے کیسے بے خبر ہیں۔ یہ کیسا سلسلہ استناد واستشہاد ہے کہ قومیت کی حمایت میں اب اس آیت کا سہارا لیا جا رہا ہے: و قال الرسول یٰرب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا [۲۵:۳۰]، حالانکہ اس آیت میں قوم کا اشارہ اس گروہ کی طرف ہے، جس میں رسول کی بعثت ہوئی۔ رسول کے پیش نظر جس طرح کی قوم ہے، اسے اُمت کہا گیا ہے اور اس سے مراد ہے ایسا اجتماع، جس کی تشکیل توحید ورسالت کی بنا پر ہوئی۔ قرآنِ مجید نے اس اجتماع کو قوم

نہیں، اُمت کہا ہے۔ یوں بھی مولانا حسین احمد کے لغوی دلائل صحیح تسلیم کر لیے جائیں تو سیاستِ حاضرہ کی رُو سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ سیاسی لغت میں وطن اور قوم کے وہ معنی نہیں ہیں، جو مولانا حسین احمد کے طرف دار اپنی سادگی سے سمجھ رہے اور جس کے لیے خواہ مخواہ عربی لغت، قرآن اور حدیث کے حوالے پیش کیے جا رہے ہیں۔[۸۸]

....

[۱۴/ مارچ کی] رات طبیعت بہت بہتر رہی، نیند بھی خوب آئی۔ اللہ کا فضل ہے، اب بھی کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔[۸۹]

[۱۵/ مارچ کی] رات پھر دَورہ ہو گیا تھا۔ اچھا ہوا، حکیم صاحب موجود تھے۔ دَورہ تو جلد ختم ہو گیا، لیکن حکیم صاحب اور چودھری صاحب دیر تک ٹھہرے رہے۔ نیند تو آ گئی، لیکن نقاہت بڑھ رہی ہے۔ صبح سے بھی برابر سو رہا ہوں۔[۹۰]

حکیم [نابینا] صاحب کا تار آیا ہے، چند دِنوں تک آنے کا خیال ہے۔ ان کی خدمت میں شکریے کا خط لکھ دیا گیا ہے۔[۹۱]

مجھے ایلو پیتھک علاج سے انکار نہیں۔ بعض اَور حضرات سے بھی مشورہ لے لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے، لیکن حکیم صاحب کا دونوں وقت آنا ضروری ہے۔ ان کی رائے بھی علاج میں شامل رہنی چاہیے۔ ممکن ہے، حکیم نابینا صاحب بھی زحمتِ سفر برداشت کر لیں [اور] تشریف لے آئیں۔[۹۲]

الحمدللہ! اچھا ہوں، [۱۷-۱۸/ مارچ کی] رات کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ تبدیلیِ علاج کیا ضروری ہے؟ مگر تبدیلی ہو بھی تو کیا؟ مجھے تو طبی علاج ہی پر اعتماد ہے۔ علاج معالجے کا فیصلہ تو معالجین ہی کر سکتے ہیں، لیکن یہ کیا بات ہے کہ ایلو پیتھک دواؤں سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ مَیں یہ دوائیں استعمال کرتا ہوں تو طبیعت منقبض ہو جاتی ہے۔ میرے مزاج کو

۸۸: اقبال کے حضور، ۳۴۴-۳۴۶
۸۹: ایضاً، ۳۵۰
۹۰: ایضاً، ۳۵۴
۹۱: ایضاً
۹۲: ایضاً، ۳۵۷

تو طبی مرکبات ہی راس آتے ہیں۔[93]

آج [۱۸؍مارچ کو] دِن بھر بڑا افاقہ رہا، میری طبیعت بہت بہتر ہے۔[94]

خواب تھا یا کیا، رات مَیں نے دیکھا، کوئی مولوی ہے اور کسی قبر کے چڑھاوے سے مجھے تازہ اور نہایت اچھا کھانا پیش کر رہا ہے، لیکن مَیں نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔[95]

الحمدللہ! [۱۹-۲۰؍مارچ کی] رات نیند خوب آئی۔ دَورہ بھی نہیں ہوا، خفیف سی بے کلی تھی، جو آپ ہی آپ دُور ہو گئی۔ معدہ بھی صاف ہو گیا ہے، بلکہ مجھے کچھ بھوک بھی محسوس ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے، ایلو پیتھک دواؤں اور طبی مرکبات کا امتزاج مفید ثابت ہو گا۔[96]

....

ہندوستان کے سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، مسلمانوں کو بھی کچھ اپنی فکر ہے کہ نہیں؟ ہندوستان میں جو آئینی تبدیلیاں ناگزیر ہیں، ان کے پیش نظر ضروری ہے کہ ریاست [بہاولپور] میں ابھی سے بعض باتوں کی پیش بندی کر لی جائے۔ ریاست کا رقبہ نہایت وسیع ہے، چولستان آباد ہو جائے تو کیا خوب ہو۔ یہ بات کچھ مشکل تو نہیں، ہمت اور سمجھ کی ضرورت ہے۔ ریاست میں نہ سہی، اہلِ ریاست میں تو دم ہونا چاہیے۔ بہاولپور مسلمانوں کی ریاست ہے، مسلمانوں کا گزر اِس وقت سیاست کے ایک نہایت خطرناک مرحلے سے ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے، آنکھیں کھولیں۔[97]

....

کپتان صاحب کی تشخیص 'انورزم' کے خلاف ہے۔ آج اجابتیں بہت ہوئیں، اس لیے نقاہت محسوس ہو رہی ہے۔ دواؤں میں شاید اس امر کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ تنقیہ ہو جائے۔ وہ جو دو روز سے پاؤں کا ورم تھا، وہ تو جاتا رہا، طبیعت البتہ مضمحل ہے۔ کپتان صاحب کہتے ہیں کہ، کھانا کھایئے، طبیعت بحال ہو جائے گی۔[98]

۹۳: اقبال کے حضور، ۳۶۴-۳۶۵
۹۴: ایضاً
۹۵: ایضاً، ۳۶۶
۹۶: ایضاً، ۳۷۶
۹۷: ایضاً، ۳۷۷
۹۸: ایضاً، ۳۷۸

شانے میں درد محسوس ہو رہا ہے۔ تکلیف جو ہے، سو ہے، زیادہ رَد و کد مناسب نہیں۔ عوارض تو اب یہی شانے کا درد ہے، احتباسِ صوت اور دمہ قلبی، ان عوارض کا ازالہ ہونا چاہیے۔ درد تو نہیں ہے، یونہی دُکھن سی باقی ہے۔[99]

علاج صرف طبی ہوگا۔ یوں [جرمن ڈاکٹر زیلتسر سے[100]] مشورے میں کوئی حرج نہیں۔ سیکڑوں برس سے طبی ادویات آزمائی جارہی ہیں، ان کی تاثیر اور فائدہ مندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ انسانی مزاج، طبیعت اور جسم کے زیادہ قریب ہیں۔ ایلو پیتھک دواؤں کا کیا ہے، ان کی تاثیر اور استعمال کے بارے میں کوئی رائے مستقلاً قائم نہیں رہتی۔ یوں بھی مجھے یہ دوائیں راس نہیں آتیں۔[101]

علاج، جیسا ہو رہا ہے، ٹھیک ہے: اب اس نزاع میں الجھنا غلط ہوگا کہ مرض کیا ہے؟ معلوم ہے کہ دل متاثر ہے، لہٰذا مداوا انھی عوارض اور اسی خرابی کا ہونا چاہیے، جس کا تعلق دل سے ہے۔[102]

....

ہمارے مسائل کا حل صرف ایک ہے۔ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے۔ لیگ، جو متحدہ محاذ قائم کر رہی ہے، سب اس میں شامل ہو جائیں، سب اس کو تقویت پہنچائیں۔ مسلمانوں کی زمامِ قیادت صرف لیگ کے ہاتھ میں رہے۔ ہمیں جناح سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔ جناح ہی ہماری قیادت کے اہل ہیں؛ مگر یونینسٹ پارٹی کا ذہن صاف نہیں، نہ اس میں خلوص ہے، نہ دردمندی؛ لیکن وہ دِن دُور نہیں، جب یہ پارٹی آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی۔ اس کی ترکیب بڑے متضاد عناصر سے ہوئی، ہر عنصر کا اپنا ایک مفاد ہے۔ یہ ترکیب قائم نہیں رہ سکتی۔[103]

....

مولوی [حسین احمد مدنی] صاحب کے اس بیان میں، جو اخبار انصاری میں شائع ہوا، مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

99: اقبال کے حضور، ۳۷۹-۳۸۰
100: ایضاً، ۳۸۷
101: ایضاً
102: ایضاً، ۳۹۲
103: ایضاً، ۳۹۴

> لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت اَور کوئی رشتہ نہیں، جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اَور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

ان الفاظ سے تو مَیں یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانانِ ہندوستان کو مشورہ دیا ہے۔ اسی بنا پر مَیں نے وہ مضمون لکھا، جو اخبار احسان میں شائع ہوا ہے، لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا، جس کی ایک نقل انھوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے۔ اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

> میرے محترم سر [اقبال] صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیانِ واقعہ مقصود تھا [تو] اس میں کوئی کلام نہیں اور اگر مشورہ مقصود ہے تو خلافِ دیانت ہے۔ اس لیے مَیں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سابق پر نظر ڈال لی جائے۔ مَیں عرض کر رہا تھا کہ 'موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں'۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے؛ خبر ہے، انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورے کا ذکر بھی نہیں کیا، پھر اس مشورے کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے۔

خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا، لہٰذا مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔[۱۰۲]

....

دمے کے متواتر دَوروں سے بہت تکلیف رہتی، یہاں تک کہ ایک وقت زندگی سے بھی مایوسی ہو گئی۔ دوائیوں، ان کا استعمال آج آٹھ نو روز سے جاری ہے، دَوروں کے تواتر میں بہت افاقہ ہے اور صحت اپنی اصلی حالت کی طرف رفتہ رفتہ عود کر رہی ہے۔ ہاں، پیٹھ کا درد باقی ہے یا ایک مدت کے بعد عود کر آئی ہے۔ ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ اس درد کا تعلق بھی

۱۰۲: انوارِ اقبال، ۱۶۹-۱۷۰

قلب کی کمزوری سے ہے۔ پیٹھ کے اوپر کے نصف حصے میں، یعنی گردن سے لے کر دونوں شانوں کے درمیان تک یہ درد ہوتی ہے۔ اس شکایت کے علاوہ دوسری شکایت یہ ہے کہ اجابت باقاعدہ اور کھل کر نہیں ہوتی۔ تیسری شکایت یہ ہے کہ رات کو نیند شب کے پہلے حصے میں بہت کم آتی ہے، آخری حصے میں البتہ کچھ نیند آتی ہے۔ پیٹھ کی درد بالعموم رات کو ہوتی ہے۔ حکیم صاحب کی مرسلہ دوائیوں سے مجھ کو مقابلتاً کچھ صحت ہوگئی اور مَیں سفر کے لائق ہو گیا تو بہت ممکن ہے کہ مَیں خود ان کی خدمت میں زبانی مشورت کے لیے حاضر ہوں گا۔ فی الحال ڈاکٹروں نے مجھ کو سفر سے بالکل منع کر دیا ہے، یہاں تک کہ اگر ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانا ہو تو مجھ کو چارپائی پر ہی لے جایا جاتا ہے[105] دو باتیں اَور تھیں، یعنی پیشاب کا کم آنا، ایک پاؤں میں خفیف سا ورم ہونا، جو غالباً خرابیِ جگر کی علامت ہے[106]

مَیں موت سے نہیں ڈرتا، اِن شاء اللہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کروں گا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست[107]

....

آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا، اس کی وجہ سے لکھنا پڑھنا محال ہوگیا۔ آنکھ کا آپریشن ستمبر میں ہوگا، لیکن چونکہ ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق، میری بیماری زیادہ اندوہ ناک صورت اختیار کر رہی ہے، اس واسطے امید نہیں کہ یہ آپریشن عمل میں آئے۔ جاوید اور منیرہ دونوں نابالغ ہیں۔ ایک کی عمر چودہ سال ہے، لڑکی (کی) عمر سات، ساڑھے سات سال ہے۔ میری خواہش ہے کہ...... [شعیب قریشی کی] وساطت سے اعلیٰ حضرت میرے بعد ان بچوں کی طرف توجہ فرمائیں۔ صرف...... [شعیب قریشی] اور مسعود کو میرے حالات معلوم تھے، وہ بے چارہ [راس مسعود] تو چل بسا، اب مَیں...... [شعیب قریشی] پر بھروسا کر سکتا ہوں[108]

....

[آج ۱۸/اپریل کو] میری طبیعت پہلے سے اچھی ہے، مگر حالت روز بروز اَبتر نظر آتی

۱۰۵: بنام مظفر الدین، ۲۹/۳/۱۹۳۸ء، چہارم، ۶۵۶-۶۵۹ ۱۰۶: بنام مظفر الدین، ۳۰/۳/۱۹۳۸ء، چہارم ۶۶۰

۱۰۷: اقبال دُرونِ خانہ اول، ۴۱-۴۲ ۱۰۸: بنام شعیب قریشی، ۱۶/۴/۱۹۳۸ء، چہارم، ۶۶۷

ہے۔ اللہ یا تو صحت کلی دے یا ساتھ ایمان کے اُٹھا لے۔[109]

....

دمے کے متواتر دَوروں نے مجھے زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا تھا، مگر اب [۱۹/اپریل کو] خدا کے فضل سے کچھ افاقہ ہے، گو کلی طور پر ابھی صحت نہیں ہوئی۔[110]

....

...... [منیرہ کو] اس کی حس آگاہ کر رہی ہے کہ شاید [۲۰/اپریل کی رات] باپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔[111]

[بیٹے جاوید!] جاوید بن کر دِکھاؤ تو جانیں۔[112]

چودھری [محمد حسین] صاحب! ...... [جاوید کو] جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا 'خطاب بہ جاوید' ضرور پڑھوا دیجیے گا۔[113]

[تقریباً بارہ بجے رات][114]

[شفیع صاحب!] دوا میں افیون کے اجزا ہیں اور مَیں مدہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔[115]

افسوس! قرشی صاحب بھی نہیں پہنچ سکے۔[116]

[۲۱/اپریل، صبح پونے پانچ بجے][117]

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید[118]

[پانچ بج کر چودہ منٹ]

ہائے! .... دل میں شدید درد ہے .... [ا......ال] ...... اللہ![119]

[اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن]

۱۰۹: بنام ضرار احمد، ۱۹۳۸/۴/۱۸ء، چہارم ۲۷۲-۶۷۲ ۱۱۰: بنام ممنون حسن، ۱۹۳۸/۴/۱۹ء، چہارم ۶۷۳

۱۱۱: زندہ رُود، ۷۱۸ ۱۱۲: ایضاً، ۷۱۹ ۱۱۳: ایضاً

۱۱۴: ایضاً ۱۱۵: ایضاً ۱۱۶: ایضاً

۱۱۷: ایضاً ۱۱۸: ایضاً، ۷۲۰ ۱۱۹: ایضاً

کتابیات

- ابواللیث صدیقی (مرتب): ملفوظاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اول ۱۹۷۷ء
- اختر النسا، ڈاکٹر (مرتب): علامہ اقبال اور روزنامہ زمیندار، لاہور: بزمِ اقبال، اول ۲۰۱۱ء
- افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مترجم): شذراتِ فکرِ اقبال، لاہور: مجلس ترقی ادب، اول ۱۹۷۷ء
- اقبال، علامہ محمد: اسرارِ خودی، لاہور: حکیم فقیر محمد چشتی نظامی، اول ۱۹۱۵ء، دوم س ن
- اقبال، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال اردو، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، سوم ۱۹۹۵ء
- اقبال، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال فارسی، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن
- اقبال، علامہ محمد: *Stray Refecltions*، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، پنجم ۲۰۰۸ء
- اقبال احمد صدیقی (مترجم): علامہ اقبال- تقریریں، تحریریں اور بیانات، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اول ۱۹۹۹ء
- بشیر احمد ڈار: انوارِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، دوم ۱۹۷۷ء
- بشیر احمد ڈار: *Letters of Iqbal*، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، دوم ۲۰۰۵ء
- تصدق حسین تاج (مرتب): مضامینِ اقبال، حیدر آباد: حسامی بک ڈپو، دوم ۱۹۸۵ء
- جاوید اقبال، ڈاکٹر: زندہ رُود، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، دوم ۲۰۰۸ء
- چراغ حسن حسرت (مرتب): اقبال نامہ، لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، س ن
- حسن اختر ملک، ڈاکٹر: اقبال ایک تحقیقی مطالعہ، لاہور: یونیورسل بکس، اول ۱۹۸۸ء
- رفیع الدین ہاشمی (مرتب): خطوطِ اقبال، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، اول ۱۹۷۶ء
- سعید اختر درانی، ڈاکٹر: نوادرِ اقبال یورپ میں، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، سوم ۲۰۱۰ء
- صابر کلوروی، ڈاکٹر (مرتب): کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اول ۲۰۰۴ء
- ضیاء الدین برنی (مترجم): اقبال مصنفہ عطیہ بیگم، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، دوم ۱۹۶۹ء
- ظہیر الدین احمد الجامعی، ڈاکٹر: اقبال کی کہانی، حیدر آباد دکن: ڈاکٹر ظہیر الدین، دوم ۲۰۱۱ء
- عبدالحمید، خواجہ: اقبال کے چند جواہر ریزے، لاہور: اقبال اکیڈمی، اول ۱۹۴۳ء

- عبدالمجید سالک: ذکرِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، اوّل ۱۹۵۵ء
- عبدالواحد معینی، سید: نقشِ اقبال، لاہور: آئینۂ ادب، اوّل ۱۹۶۹ء
- عبدالواحد معینی، سید + محمد عبداللہ قریشی (مرتبین): مقالاتِ اقبال، لاہور: آئینۂ ادب، دوم ۱۹۸۸ء
- عطاء اللہ، شیخ (مرتب): اقبال نامہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، (تصحیح و ترمیم شدہ یک جلدی) ۲۰۰۵ء
- عطیہ بیگم: *Iqbal*، لاہور: آئینۂ ادب، دوم ۱۹۶۹ء
- غلام دستگیر رشید: آثارِ اقبال، حیدرآباد دکن: ادارۂ اردو، اوّل ۱۹۴۴ء
- غلام رسول مہر، مولانا: مطالبِ کلامِ اقبال اردو، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن
- لطیف احمد شروانی (مرتب): *Speeches, Writing & Statements of Iqbal*، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، پنجم ۲۰۰۹ء
- محمد احمد خاں: اقبال کا سیاسی کارنامہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اوّل ۱۹۷۷ء
- محمد حمزہ فاروقی (مرتب): سفر نامۂ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، چہارم ۲۰۱۳ء
- محمد حنیف شاہد (مرتب): اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام، لاہور: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، اوّل ۱۹۷۶ء
- محمد رفیق افضل (مرتب): گفتارِ اقبال، لاہور: ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہِ پنجاب، سوم ۱۹۹۶ء
- محمد عبداللہ چغتائی: اقبال کی صحبت میں، لاہور: مجلس ترقی ادب، اوّل ۱۹۷۷ء
- محمد عبداللہ قریشی (مرتب): آئینہ اقبال، لاہور: آئینۂ ادب، اوّل ۱۹۶۷ء
- محمد منیر احمد سلیچ، ڈاکٹر: اقبال اور گجرات، سلیچ پبلی کیشنز، اوّل ۱۹۹۸ء
- مظفر حسین برنی، سید (مرتب): کلیاتِ مکاتیبِ اقبال اوّل، دہلی: اردو اکادمی، اوّل ۱۹۸۹ء
- مظفر حسین برنی، سید (مرتب): کلیاتِ مکاتیبِ اقبال دوم، دہلی: اردو اکادمی، چہارم ۱۹۹۹ء
- مظفر حسین برنی، سید (مرتب): کلیاتِ مکاتیبِ اقبال سوم، دہلی: اردو اکادمی، دوم ۱۹۹۹ء
- مظفر حسین برنی، سید (مرتب): کلیاتِ مکاتیبِ اقبال چہارم، دہلی: اردو اکادمی، اوّل ۱۹۹۸ء
- نذیر نیازی، سید: اقبال کے حضور، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، پنجم ۲۰۱۲ء
- وحید الدین، فقیر سید: روزگارِ فقیر، لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، س ن

اشاریہ

ڈاکٹر نعیم انیس

(اشاریہ صرف آپ بیتی اور حوالہ جات پر مشتمل ہے)

☆

آیات، احادیث، اقوال، مصارع

☆☆☆